شعرستان

تذکرۂ شعرائے پاکستان

مرتبان

نعمان تاثیر ، مظہر صدیقی

مکتبۂ [illegible]
[illegible] کراچی

ماہنامہ "تجسیم" کی اشاعت خصوصی

شعرستان

بار اوّل .... نومبر [illegible]

قیمت [illegible]

ترتیب

تصاویر

۷۸۶

تذکرہ نگاری ہمارے ادب کا ایک قدیم مقبول اور محبوب ذوق ہے جو ادب و شعر کی ترقیوں کے ساتھ ساتھ مزید ترقی و تنوع اختیار کرتا رہا ہے۔ ہر عہد اور ہر زمانے میں تذکرہ نگاروں نے اس طرف توجہ فرمائی ہے اور مختلف انداز و اسلوب سے اپنے دور کے ادبا اور شعرا کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ سیرت و تذکرہ کے باب میں بھی اُردو ادب کسی دوسری زبان کے ادب سے پیچھے نہیں رہا۔ قدیم سے قدیم شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ خواہ وہ اجمالی ہو یا تفصیلی ہمیں کہیں نہ کہیں ضرور مل جاتا ہے۔ نکات الشعرا۔ گلشنِ بیخار۔ تذکرۂ شعرا۔ تذکرۂ ریختی گویاں۔ مجموعۂ نغز۔ چمنستانِ شعرا۔ گلشنِ گفتار۔ گلشنِ ہند۔ مخزنِ شعرا۔ سخنِ شعرا۔ آثارِ شعرا۔ مآثر الکرام۔ تاریخِ ادبِ اُردو۔ خمخانۂ جاوید۔ آبِ حیات۔ شعر الہند اور گلِ رعنا وغیرہ اُردو کے مشہور تذکرے ہیں لیکن ان میں کچھ مستند اور کچھ غیر مستند ہیں اور بعض محض جانب داری اور ضد کے تحت لکھے گئے ہیں۔ بعض میں انتہائی غلط روی سے کام لیا گیا ہے اور بعض میں نمایاں تاریخی غلطیاں ہیں۔ تاہم یہ تمام تذکرے تذکروں کی اہمیت اور افادیت کا ایک ثبوت ضرور ہیں اور بڑی حد تک ہمیں شعرائے سلف کے متعلق معلومات بہم پہونچاتے ہیں۔

دورِ جدید میں اس نوع کے تذکرے جزوی طور پر تو ملتے ہیں یعنی رسائل، کتابوں، اخباروں اور مشاعروں کے انتخابات کے سلسلے میں شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن ابھی تک ہمارے جدید شعرا کا کوئی ایسا تذکرہ مرتب نہیں ہوا تھا جسے مکمل اور مستند کہا جا سکے۔

دورِ آخر کے قریب قریب تمام بڑے شعرا بساطِ ادب چھوڑ چکے ہیں، جو باقی رہ گئے ہیں وہ چراغِ سحری ہیں۔ نئے اور جوان شعرا میں ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو جہانِ ادبی مستقبل پر اثر انداز ہے لیکن ان کے تذکرے کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملتے اور ملتے ہیں تو مختصر سُنے سُنائے غیر معتبر۔ کسی ادیب یا شاعر کے حالاتِ زندگی اس وقت تک معتبر و مستند نہیں کہے جا سکتے جب تک ان کی تسوید میں خود اس ادیب یا شاعر کا ہاتھ نہ ہو۔

ادارہ پرچم نے محض اسی خیال کے تحت شاعر نمبر کا اعلان کیا تھا جو چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر مقررہ وقت تک مکمل نہ ہو سکا اور محض تاخیر کے باعث اب ہم اس مجموعہ کو کتابی شکل میں "شعرستان" کے نام سے پیش کر رہے ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ شعرا اپنے حالات خود لکھیں۔ ایسے حالات جو صداقت پر مبنی ہوں، نیز خود شعرا ہی اپنے کلام کا انتخاب بھی کریں۔ اب تک جتنے تذکرے شائع ہوئے ہیں ان میں انتخاب کلام دوسروں کا رہین منت رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسرے اپنے مذاق اور ذوق وجدان کے تحت اشعار کا انتخاب کرتے ہیں لیکن یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ خود شاعر کی پسند کیا ہے اور وہ اپنے کن شعروں کو منتخب قرار دیتا ہے۔ خود نوشت حالات کے ساتھ یہ خود انتخابی "نفسیاتی" اعتبار سے بڑی اہم ہے۔ اور ہم اس طرح شاعر کے بطون میں جھانک سکتے ہیں اس کے مذاق اس کی پسند اور اس کے معیار کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس شاعر پر نقد و تبصرہ میں اس کے خود پسند کیے ہوئے اشعار سے ہمیں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ شعرستان میں اپنے اسی خیال کی عکاسی کر رہے ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد ہمارے نزدیک ادب تقسیم نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے ادبی و شعری رجحانات میں بڑی یکسانیت و مطابقت ہے اس لیے دونوں ملکوں کا ادب بھی جدا جدا نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ شعرا اور ادبا دو ملکوں میں بٹ گئے ہیں۔ پاکستانی حدود میں تقسیم سے پہلے بھی اچھے ادیب اور شاعر بڑی تعداد میں موجود تھے اور تقسیم کے بعد تو اُن میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ بڑی ضرورت تھی کہ پاکستانی شعرا کے حالات اور ان کے کلام کا انتخاب یکجائی صورت میں پیش کیا جائے تاکہ اس قافلۂ ادب و شعر کو نمایاں کیا جا سکے اور اس طرح تاریخ اُردو ادب و شعر کا ایک نیا باب شروع ہو۔

اس نئے باب کے آغاز کی کلید، پرچم نے اپنی بساط کے مطابق ابتدا کی ہے اور اس سلسلے میں مہینوں کی مسلسل خط و کتابت، بھاگ دوڑ، اور ذاتی ملاقاتوں کا جو نتیجہ نکلا وہ ان صفحات میں سمو دیا گیا ہے اس سلسلے میں ہمیں شعرا کے تغافل، ان کی بے نیازیوں اور بے توجہی کا جو تلخ تجربہ ہوا ہے اس کا ذکر کرنا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ تاہم یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ہم نے اس تاریخی کام کی تکمیل میں اپنی امکانی کوششوں کو صرف کیا ہے۔

ہماری بڑی آرزو تھی کہ پاکستان کے مشاہیر شعرا میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ بچے جس کے خود نوشت حالات۔ انتخاب کلام اور تازہ ترین تصویر اس مجموعہ میں شامل نہ ہو لیکن ہمیں باوجود کوشش سو فیصدی کامیابی نہیں ہوئی اور اس کی ذمہ داری صرف ان شعرا پر ہے جو آخر وقت تک ہماری گزارشات پر توجہ نہیں فرما سکے۔ متعدد شعرا نے اپنے تذکرے محض اس لیے نہیں بھیجے کہ وہ خود نوشت تذکرہ دینا نہیں چاہتے تھے بلکہ اپنے دوستوں یا شاگردوں سے لکھوانا چاہتے تھے۔ ادارے نے شعرستان کی انفرادیت کو قایم رکھتے ہوئے ایسے تذکرے شامل کرنے سے انکار کر دیا حقیقت یہ ہے کہ جب کسی کے تذکرے کو کوئی دوسرا شخص لکھتا ہے تو اس میں تعریف و توصیف سے

وہ تمام مقام آجاتے ہیں جو تذکرے کو اچھا خاصہ قصیدہ بنا دیتے ہیں کاش ہمارے ایسے شعرا بھی اپنے آپ کو حقائق کی روشنی میں پیش کرنا پسند فرما لیتے

بہر حال اگر ملک میں ہماری اس کوشش کی پذیرائی کی گئی (جس کی ہمیں قوی امید ہے) تو ہم مستقبل قریب میں "شعرستان" کا دوسرا حصہ پیش کریں گے جس میں بقیہ پاکستانی شعرا کے خود نوشت حالات اور ان کا منتخب کلام پیش کیا جائے گا اور ان شعرا کو بھی شمولیت کا موقعہ دیا جائے گا جن کے تذکرے اس اشاعت میں بہت ہی اختصار کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔

ہندوستان کے مقتدر شعرا یہ خیال نہ فرمائیں کہ ہم پاکستان اور ہندوستان کے شعرا میں کوئی حدِ فاصل قائم کر رہے ہیں یا ادیبوں اور شاعروں کو ملکی حیثیت سے تقسیم کر رہے ہیں حقیقتاً ایسا نہیں ہے بلکہ ہم انشاء اللہ جلد ہی ہندوستان کے شعرا کے خود نوشت تذکرے اور انتخاب کلام بھی اسی صورت میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس طرح یقیناً یہ کمی پوری ہو سکے گی جو دورِ آخر اور حال کے نئے شعرا کے تذکرے مرتب نہ ہونے کی وجہ سے محسوس کی جا رہی ہے۔

ہم نے تذکروں کی فراہمی، ترتیب اور تدوین میں کسی خاص "جماعتی پابندی" اور جانبداری سے کام نہیں لیا ہے۔ "شعرستان" میں آپ کو ہر مکتبۂ خیال کے شعرا ملیں گے جدید رنگ کے بھی اور قدیم رنگ کے بھی ترقی پسند بھی اور غیر ترقی پسند بھی۔

شعرستان کے لئے بعض شعرا نے انتہائی طویل تذکرے اور تیس تیس چالیس چالیس نظمیں غزلیں بصورتِ انتخاب بھیج دی تھیں لیکن مقررہ ضخامت کے پیش نظر ہمیں ایسے تذکروں اور انتخاب کلام کو کسی قدر مختصر کرنا پڑا ہے جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔

شعرستان کی اشاعت پر مکتبۂ پرچم نے اپنے اندازے سے کہیں زیادہ دقت اور روپیہ صرف کیا ہے ساتھ ہی اس کا بھی اعتراف ہے کہ اگر شیدائے ادب جناب شیخ عزیز احمد صاحب صاحب لائل پوری ہمارے جوان سال شاعر جناب مظفر حسین گوہر، برادرم شفیق اللہ خاں صاحب شفیق کوٹی اور برادرم محمد سعید خانصاحب ادیب ہماری اعانت نہ فرماتے تو بہت ممکن تھا کہ ہم اس تاریخی اور اہم مجموعے کو اس قدر اہتمام کے ساتھ پیش نہ کر سکتے۔ ہم ان حضرات کی پر خلوص مساعی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

مظہر صدیقی

شاعر کا نصب العین

حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ

جب روح محوِ خواب ہو جب خواب تسکر آمیز ہو — جب ہو جمود آگیں فضا غفلت کی مستی تیز ہو
اک مستقل آزار ہو جب انتشار افراد کا — جب شورشِ ایام کا سیلاب طوفاں خیز ہو
پھیلی ہوئی ہو جب وبا دنیا میں استبداد کی — جب ہر نفس ہو مضطرب ہر آنکھ اشک انگیز ہو
جب نشترِ احساس خود دل کی رگوں کو چھیڑ دے — جب خاطرِ مجروح کا ہر سانحہ خوں ریز ہو
جب آدمی مظلوم ہو اور زندگی مظلوم تر — جب بےکسی کے سامنے فرعون ہو چنگیز ہو

اس وقت شاعر سے کہو تخئیل کو تکلیف دے
اجزائے نظم و شعر کو پیرایۂ تصنیف دے

شاعر کا فطری فرض ہے دے زینتیں جذبات کو — تبدیل کر دے صبح میں تاریکیٔ ظلمات کو
پھولوں کے دل میں کھول دے بادِ چمن کے راستے — مربوط کر دے دشت میں بکھرے ہوئے جذبات کو
رشتے فنا کے جوڑ دے سرچشمۂ جاوید سے — رنگِ حیاتِ تازہ دے دنیائے محسوسات کو
نغموں سے اپنے پھونک دے پژمردگی میں تازگی — تجدید کا پیغام دے مایوسیٔ حالات کو!
اٹھے اور اپنی مشعلِ تحقیق کو کر دے بلند — جب حادثوں کے خوف سے تھرّائیں تارے رات کو

چھا جائے انساں زار پر صبحِ نگاریں کی طرح
برسے دلِ بیدار پر الہامِ رنگیں کی طرح

شاعر کے نصب العین میں تہذیبِ عالم عام ہو — ہر شعر اس کا وحی ہے ہر اک نوا الہام ہے
شاعر کے نصب العین میں عزمِ الٰہی ہو نہاں — اس کے قلم کی ہر صدا فطرت کا اک پیغام ہے

شاعر کے نصب العین میں عرفاں کی موجیں ہیں بلند آغاز اس کی فکر کا آئینۂ انجام ہے
شاعر کے نصب العین میں ہو کامیابی خلق کی مقصد میں اپنے اس لئے وہ فطرتاً ناکام ہے
شاعر کے نصب العین میں ہیں دو جہاں کی وسعتیں نظروں میں صبحِ عرش اور تحت الثریٰ کی شام ہے

پیدا ہوا ہے خلق کی مشکل کشائی کے لئے
شاعر ہے آوازِ خدا ساری خدائی کے لئے

شاعر کا نصب العین ہرگز ایک ہو سکتا نہیں وہ رندِ کامل ہے کہیں اور مصلحِ اعظم کہیں
جب مست ہو تو ہم نشیں اس کا ہو ساقیِ ازل جب ہوش میں ہو محفلِ ہستی کا ہے مسند نشیں
مجذوب ہو تو ہو حقیقت فاش اس کے جذب سے سالک ہو وہ تو ہے چراغِ راہِ اربابِ یقیں!
قائد کبھی ہو مرشد کبھی ہو عابد کبھی ہو زاہد بھی ہے کثرت میں لامحدود ہو وحدت میں ہو خلوت گزیں
وہ حسن کا شاہد بھی ہو اور عشق کا مشہود بھی ساجد بھی ہے مسجود بھی گاہے جہاں گاہے جبیں

جو کچھ ہے جیسا ہے جہاں ہو حاصلِ کونین ہے
فطرت کا نصب العین گویا اس کا نصب العین ہے

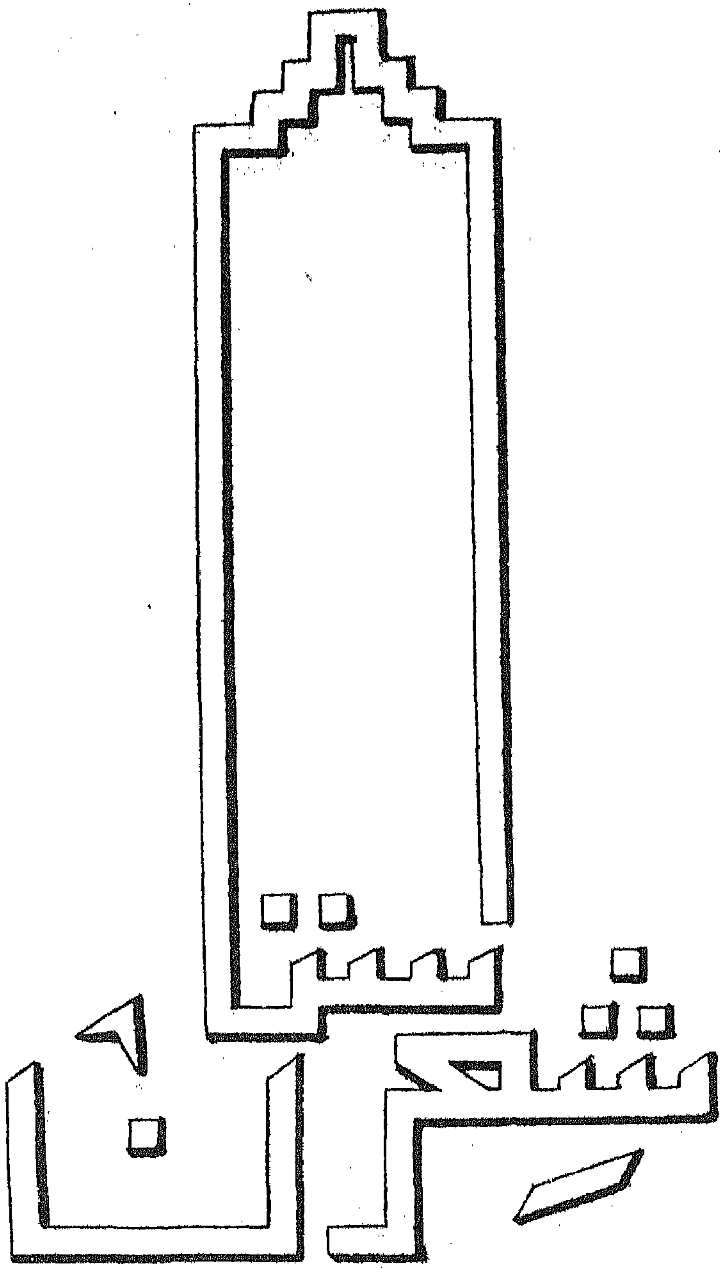
عشرت کدوں میں نغمۂ شاعر اگر نوروز ہو ماتم کدوں میں اس کا ہر آنسو جہانِ سوز ہو
وہ آخری مقصد ہو سرد و گرمِ رزم و بزم کا وہ رونقِ ایواں ہو ہر میدان میں فیروز ہو
صبحِ الٰہیات کا خورشید ہے نور آفریں شامِ سیاسیات کی وہ شمع نور اندوز ہے
اصنافِ نفسیات میں ایسا کوئی ماہر نہیں درسِ طبیعیات میں پیرِ جہاں آموز ہے
مردِ تصور ہی نہیں کامل مصور بھی ہو وہ فی کلِّ وادی میں اسی کا ذکرِ فکر افروز ہے

قسمت ہوئی روزِ ازل آوارہ تقدیری اسے
فطرت نے خود تفویض کی شانِ ہمہ گیری اسے

جس وقت کوئی ساربان عذرِ سبک رانی کرے اس وقت شاعر سے کہو آئے حدی خوانی کرے
جب جادۂ اقوام میں دشواریاں ہوں سدِ راہ اس وقت شاعر سے کہو تدبیرِ آسانی کرے
جب گردِ فکر و یاس میں دب جائے سارا قافلہ اس وقت شاعر سے کہو سعیِ درخشانی کرے
جب شورشوں کے بعد بھی ممکن نہ ہو اک انقلاب اس وقت شاعر سے کہو خونِ جگر پانی کرے
جب ایک بھی آنسو نہ چشمِ خلق میں باقی رہے اس وقت شاعر سے کہو اک نالہ ارزانی کرے

شاعر کو ہر بے چین دل کا چین ہونا چاہیئے
اب تک نہیں تو اب یہ نصب العین ہونا چاہیئے

"کاروانِ امروز"



مطبوعہ
پرچم پرنٹنگ پریس
کراچی



مظہر صدیقی

(مرتب) ۔

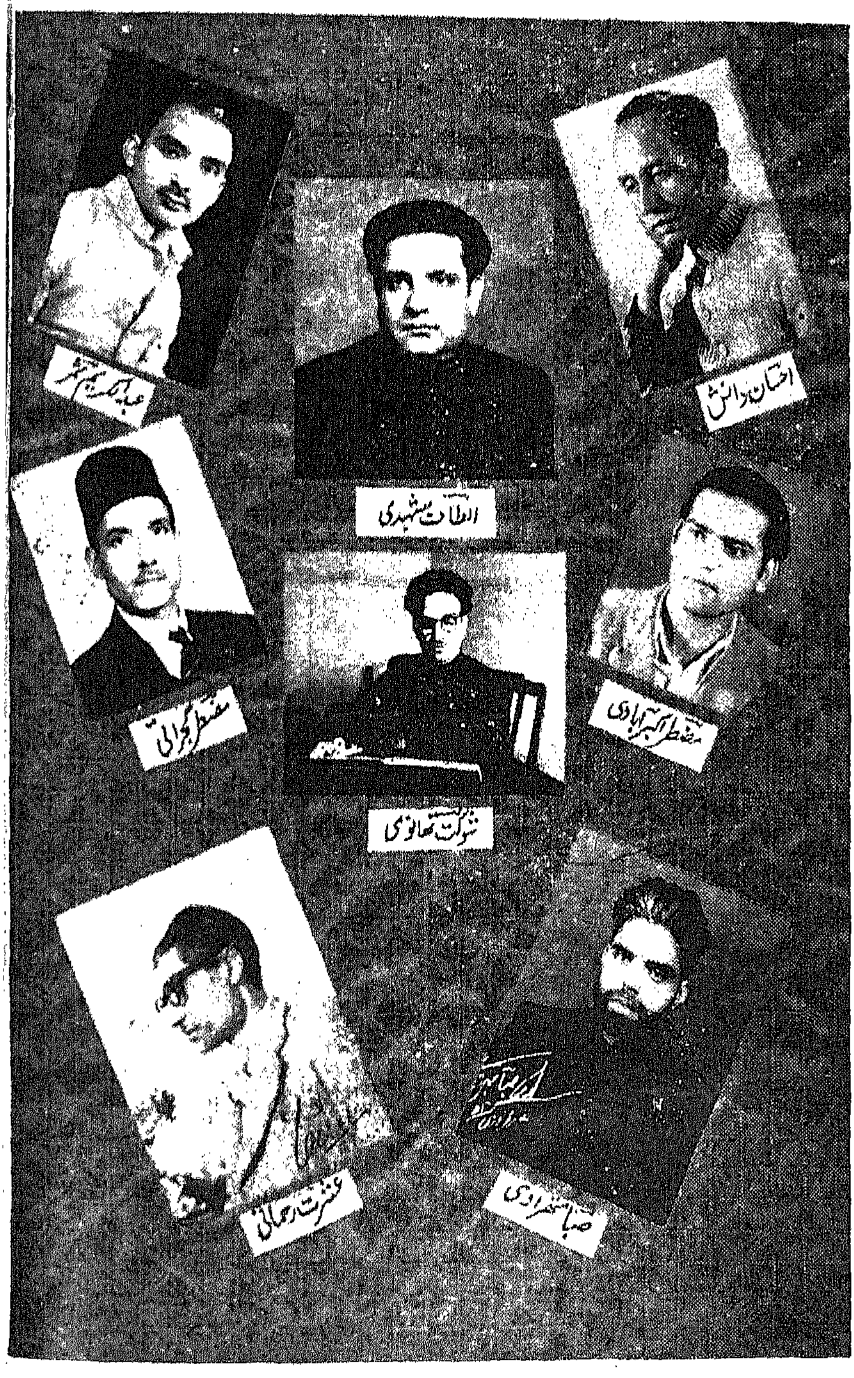

وحشت کلکتوی
اسد ملتانی
عبدالمجید سالک
حفیظ جالندھری
بہزاد لکھنوی
جلیل قدوائی


شاعر لکھنوی
مظفر صدیقی
بہار کوٹی


ن۔م۔ راشد
احمد ندیم قاسمی
تصدق حسین خا
رفیق خاور
یوسف ظفر
قیوم نظر



رضا لکھنوی
ہادی مچھلی شہری
امجد لکھنوی
عزیز احمد
باقر دہلوی
انجم رومانی



احسان دانش
الطاف مشہدی
مضطر اکبر آبادی
شوکت تھانوی
عشرت رحمانی
صبا متھراوی


مجید لاہوری
اوج ہاشمی
جری چغتائی
محشر بدایونی
ساقی جاوید
فرخ اصفہانی
ناطق سیمابی

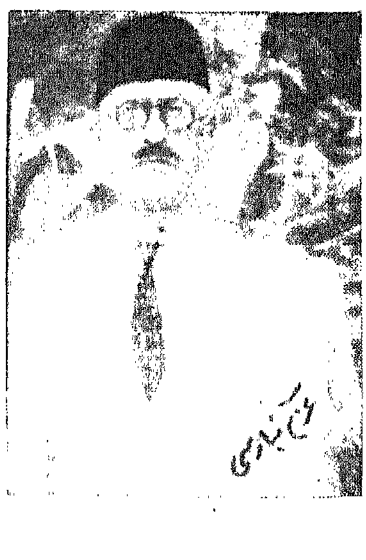


بیگم نیازی -



ماہرالقادری ۔





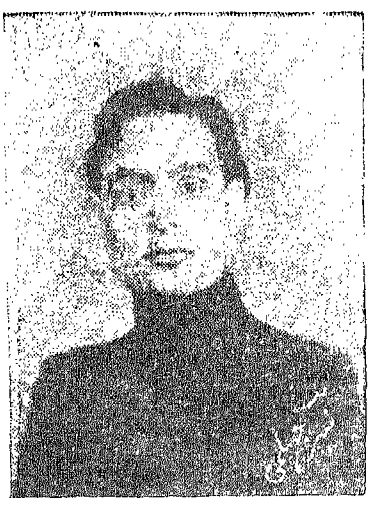


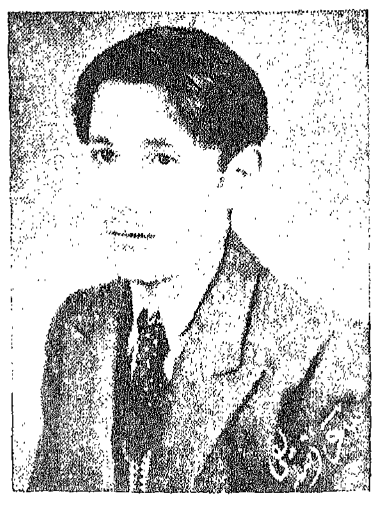














رئیس امروہوی -



[illegible] قمر رئیسی



شفیق دہلی -



کسریٰ منہاس ۔





اختر انصاری ۔


شوق








ارمان انصاری

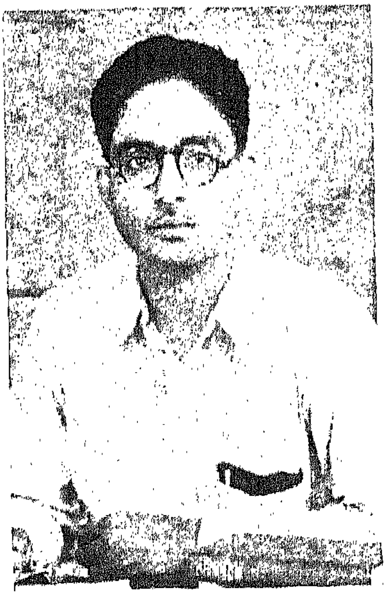




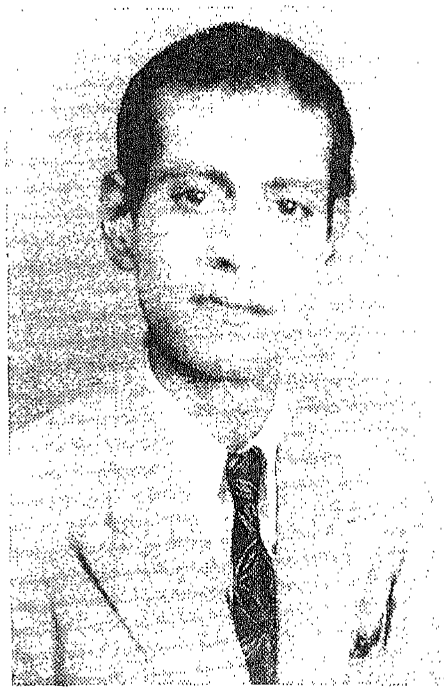
مظفر حسین گوہر ۔



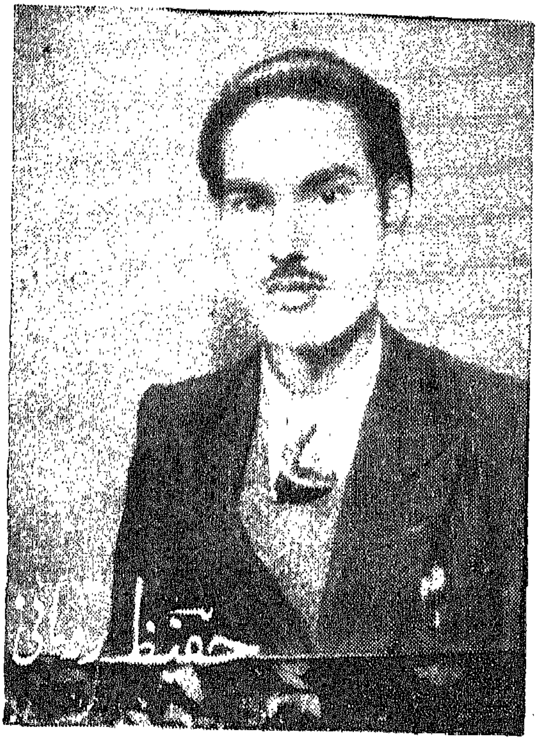
انجم وزیر آبادی ۔



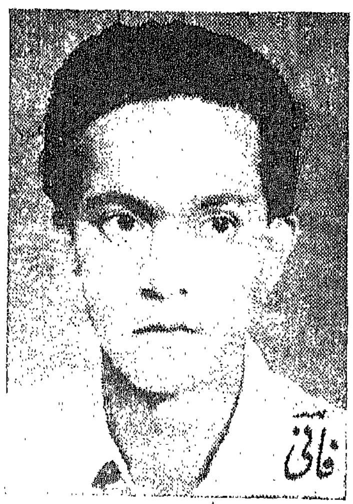
مجاز لودی ۔



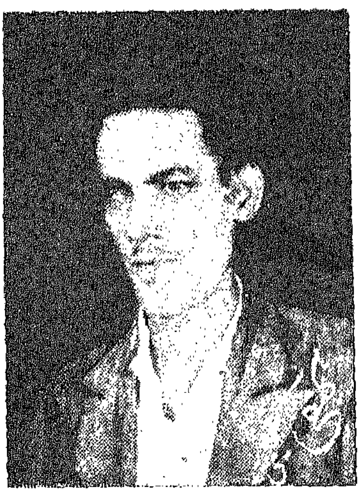
اثر دہلوی۔



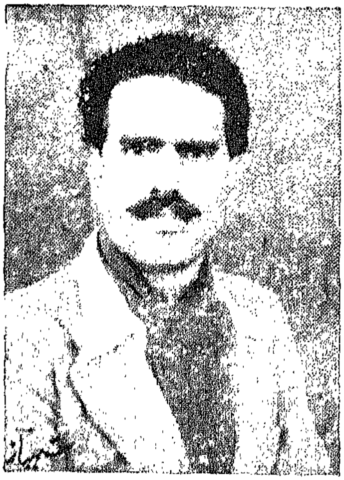



فانی



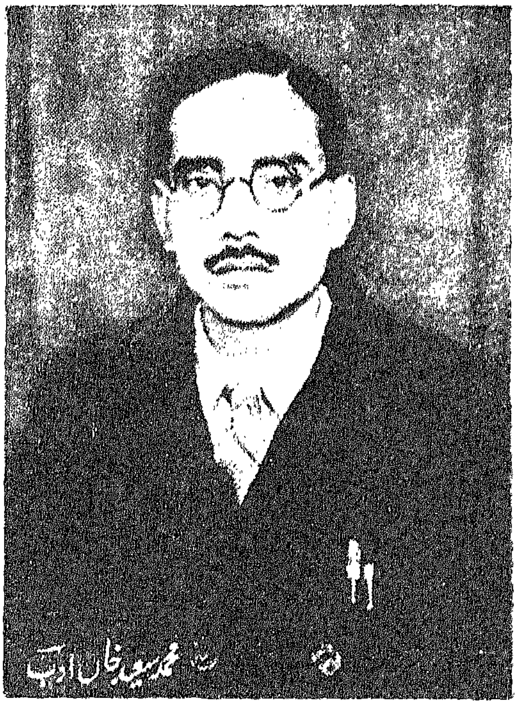


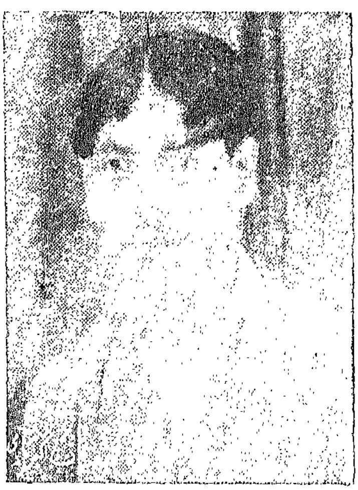









محمد سعید خاں ادیب










محسن بی اے





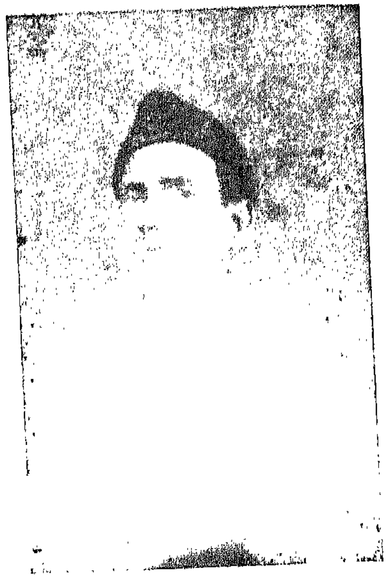
غلام محمد ـ




فانی مرادآبادی



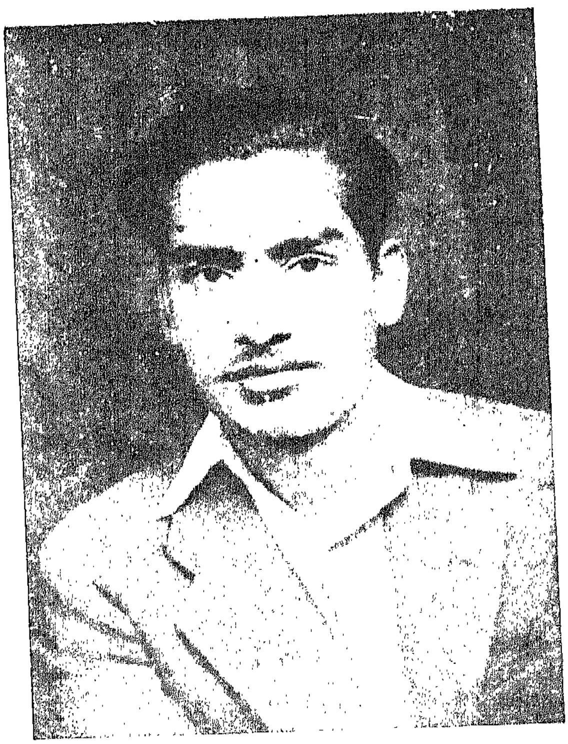




سید علی نظامی ۔



اظہر گیلانی ۔



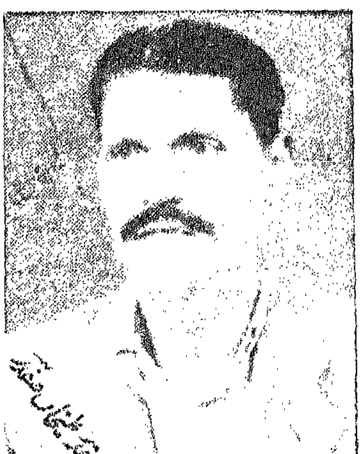
محی الدین شان ۔



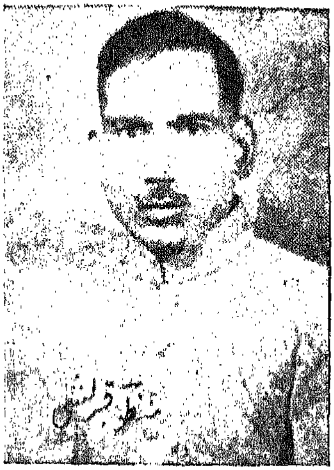


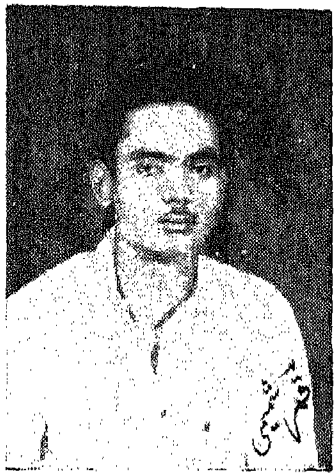



گلزار حسین گلزار











Asghar Nisar

اثر شجاع الرحمٰن دہلوی

سنہ پیدائش تو یاد نہیں البتہ زندگی کی تیس منازل طے کر چکا ہوں۔ میں نے آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی جواہرات کی چمک میں ہوش سنبھالا جب سن شعور کو پہونچا تو سمجھ سکا کہ ہم دلی کے بڑے اور ماہر جوہریوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ میرے خاندان میں تعلیم کا معیار اچھا خاصہ تھا۔ لیکن ادیب اور شاعر کوئی نہ تھا یہی وجہ ہے کہ قبلہ والد صاحب اور برادر بزرگوار میری شاعری اور مضمون نگاری کے ہمیشہ مخالف رہے۔ لیکن میں باوجود مخالفت کے اشعار کہتا رہا۔ اور تسکین ذوق کے لئے چھپ چھپ کر مشاعروں میں شرکت کرتا رہا۔ اب رہا میری تعلیم کے متعلق تو بس یہ سمجھ لیجئے کہ ہائی اسکول کیا اور کاروبار سے منسلک کر دیا گیا۔ اور اسی کاروبار کے سلسلہ میں مجھے ہندوستان کے طول و عرض کا سفر کرنا پڑا۔ میری شاعری ایک "حادثہ" کے سلسلہ میں شروع ہوئی اور اپنی آہوں اور بیقراریوں کو شعر کی صورت میں ڈھالنے لگا۔ اور پھر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے مستقلاً اشعار کہنے شروع کر دئے۔ درد و فراق کے قصے نظم ہونے لگے۔ لیکن دل کو کسی عنوان قرار نہیں آیا۔ پھر میں نے اساتذہ کا کلام پڑھا۔ مگر کسی مشاعرے میں غزل یا نظم پڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس لئے کہ فنی غلطیاں درست کرنے والا کوئی نہ تھا بالآخر میری نگاہِ انتخاب حضرت فیض جھنجھانوی پر پڑی اور موصوف نے اس زحمت کو خندہ پیشانی سے گوارا کر لیا۔ پھر ایک عرصہ تک حضرت فیض سے فیض حاصل کرتا رہا۔ اور پھر اتنی ہمت محسوس کی کہ مشاعروں میں شرکت کروں۔ چنانچہ بڑے بڑے مشاعروں میں کامیابی کے ساتھ شرکت کی اور مشاہیر شعراء کرام سے داد تحسین حاصل کرتا رہا۔

چونکہ میری شاعری کی ابتدا درد و کرب کی آمیزش سے ہوئی تھی۔ اس لئے بہاریہ اشعار باوجود کوشش کے بھی نہ نکلتے تھے تقسیم کے بعد سے میں نے مشاعروں میں شرکت قریب قریب بند کر دی ہے۔ اس لئے کہ موجودہ دور محض تفریح چاہتا ہے جن کے قدر دان اب کہاں

متفرق اشعار

فصلِ گل آئی چمن وحشت بداماں ہوگیا! بڑھتے بڑھتے چاکِ گل میرا گریباں ہوگیا
اس چمن زارِ جہاں میں دیدۂ نرگس ہی کیا جرأتِ نظارہ کی جس نے وہ حیراں ہوگیا

وہ صبح کے رنگیں جلوؤں میں مخمور خرامِ ناز ترا
سمٹے ہوئے انگڑائی لیکر اٹھنا وہ بصد انداز ترا
پردہ سے اشارۂ مبہم میں کہہ دینا وہ ہر اک راز ترا
وہ گریۂ شبنم خندۂ گل انجام مرا آغاز ترا
دل جسکے تصور سے اب بھی غنچہ کی طرح کھل جاتا ہے
وہ لمحۂ رنگیں رہ رہ کر اے دوست مجھے یاد آتا ہے

وہ زلفِ سیہ کی پردر دہ خاموش سکوں پرور راتیں
کلیوں کی چٹک جن میں شامل وہ نغمۂ سازِ دل باتیں
وہ پردۂ چشمِ رنگیں سے پر شوق لگاوٹ کی گھاتیں
وہ مجھکو بساطِ الفت پہ اک بات نہیں سو سو ماتیں
آغوشِ محبت میں جس کے آرام زمانہ پاتا ہے۔
وہ لمحۂ رنگیں رہ رہ کر اے دوست مجھے یاد آتا ہے

وہ چاند کی ٹھنڈی کرنوں سے برسا ہوا لاکھوں من پارا
وہ موجوں کے ابھرے سینوں میں بیتابیِ دل کا نظارا
وہ قلب ونظر کی رفعت سے گرتا ہوا الفت کا دھارا
وہ آخر شب وقتِ رخصت پلکوں پہ لرزتا سا تارا
دامان گہر افشاں جس کا انوارِ سحر برساتا ہے!!
وہ لمحۂ رنگیں رہ رہ کر اے دوست مجھے یاد آتا ہے

ہر داغِ جگر پہلے کی طرح پرسوز بھی ہے شاداب بھی ہے
دل جادۂ گمرہ ہستی میں ابھی خاموش بھی ہے بیتاب بھی ہے
بازارِ جہاں میں جنسِ وفا ارزاں بھی ہے نایاب بھی ہے

احسان دانش

سرگذشت از من چہ مے پرسی چہ گویم سرگذشت ؟ میں قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر (یوپی) میں ایک مزدور کے گھر پیدا ہوا۔ کاندھلہ کی سرزمین علم نوازی اور ادب پروری کے لحاظ سے تاریخی اور مشہور جگہ ہے۔ چنانچہ کم لوگوں کو علم ہوگا کہ مولانا روم کے ساتویں دفتر کا شاعر اسی خاک پاک سے اٹھا تھا اور آج تک برابر یہاں سے علمی چشمے پھوٹتے رہے ہیں۔ البتہ اب کچھ عرصے سے یہ فرق ضرور ہو گیا ہے جو صاف و شفاف آبشار یہاں سے ابلتا ہے وہ میدانوں کو عبور نہیں کر سکتا۔ بلکہ اکثر و بیشتر یہیں کا یہیں جذب ہو جاتا ہے۔

میرے والد قاضی دانش علی قصبہ باغپت ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ اور میرے نانا ابو علی کاندھلہ میں ایک غریب سپاہی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد میرے والد کاندھلہ چلے آئے۔ باغپت میں وہ کسی بلند منصب پر فائز نہ تھے اور ان کی کم علمی نے اُنھیں سپاہیانہ حدود سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ ترک وطن کے بعد بھی عرصہ تک وہ سپاہی رہے لیکن جب میں نے ہوش سنبھالا تو وہ نہروں کی کھدائی کرانے والے ٹھیکیدار میں میٹ کا فریضہ انجام دیتے تھے اور جب یہ جمعداری نہ ملتی تو خود مزدوری کرتے

جس حویلی میں ہم رہتے تھے وہ اپنے آثار قدیمہ کے لحاظ سے تو شاہانہ طرز کی عمارت تھی لیکن ہمارے اعزا و اقربا نے جو حصہ ہمیں دے رکھا تھا۔ وہ اس حویلی کی دوسری منزل میں ایک مختصر سا بوسیدہ کمرہ تھا۔ جس کی چھت میں آئے دن سانپ رینگتے دکھائی دیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ہر آنے والی برسات اس کے حق میں ایک مستقل خطرہ تھی۔ جو کمرہ کے قدرتی اختصار میں مزید تخفیف کر جاتی تھی۔ اور چونکہ کمرہ میں کواڑ سرے سے ندارد تھے۔ سردیوں میں ہوا کا ہر جھونکا ہمارے ٹمٹماتے ہوئے چراغ سے اپنا تعارف کراتا ہوا گزرتا۔ کپڑوں کی حفاظت کے لیے ٹرنک کی بجائے مٹی کا ایک مٹکا تھا جس میں گھر بھر کے نئے اور دھلے ہوئے کپڑے رہا کرتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تہوار کے دن میری والدہ مٹکے میں سے وہی دھلے دھلائے کپڑے نکالتیں کھول کھول کر مجھے پہنایا کرتی تھیں۔ چونکہ والد کی مزدوری مستقل چیز نہیں تھی۔ اس لئے میری والدہ محلے میں

سینے کے لئے کپڑے اور پیسنے کے لئے اناج منگاتی تھیں تاکہ فاقہ کی نوبت نہ آسکے۔ ان کی چکی اور چرخہ کی چوں کی میرے سرہانے ہی تھی۔ اس لئے میرا بچپن برسوں ٹمٹماتے ہوئے دیے کی روشنی میں سو کر چکی کی گود میں بیدار ہوتا رہا۔ میرے والد بہت پڑھے لکھے نہ تھے مگر ذہین اور خوش مذاق انسان ضرور تھے۔ انھیں فارسی کی سینکڑوں غزلیں اور اردو کی بعض مشہور ضخیم کتابیں ازبر تھیں۔ میری تعلیم کے سلسلے میں وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکے اور ہر قدم پر افلاس آڑے آتا رہا۔

پہلے انھوں نے مجھے قرآن خوانی کے لئے حافظ سید محمد مصطفیٰ صاحب کے سپرد کیا پھر وہاں سے تحصیلی اسکول میں داخل کر دیا۔ اپنے افلاس کے ماحول میں بھی کسی نہ کسی طرح وہ مجھے تیسری جماعت تک سہارا دیتے چلے آئے۔ مگر جب میں نے تیسری جماعت پاس کی تو والدہ نے گھر کے تمام تانبے کے برتن فروخت کر کے مجھے چوتھی جماعت کی کتابیں لے کر دیں اور اس جماعت کے بعد میری تعلیم ان کی ہمت سے باہر ہو گئی۔ اور میں اسکول کی قابلیت کے بل بوتے پر لکھنے پڑھنے کی ملازمتیں تلاش کرنے لگا۔ پٹواری سیکھی۔ عرائض نویسی میں کوشش کی۔ چٹھی رسانی کا امیدوار رہا۔ بہی کھاتا کیا اور آخر میں اپنے آبائی پیشے میں آگیا۔ پھر میں برقندازوں میں بھرتی ہونے کا تہیہ کر لیا مگر اس میں بھی ناکام رہا۔ بالآخر ناداری نے میونسپلٹی میں چپراس بندھوا دی۔

میرے محترم استاد قاضی محمد ذکی صاحب ذکی کاندھلوی کے مشورے، امداد اور دعائیں برابر میرے شریک حال رہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ مصائب کی سخت سے سخت گرفت میں بھی مجھے آسانیاں پیدا ہو جانے کی امیدیں رہیں۔ میرے ایک دوست چودھری اصغر جنگ شروع سے لے کر مفلسی کے شباب اور ارادوں کے بلوغ تک مجھے مطالعہ کے لئے ایسی ایسی کتابیں دیتے رہے جن کی روشنی ہنوز میری زندگی میں موجود ہے۔

میرا مطالعہ محنت اور جذبہ مجھے قصبہ کاندھلہ میں بلند نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ میں کھیتوں نہروں، سڑکوں اور دفتروں کے راستے ناپتا ناپتا تھک گیا۔ ممکن ہے کہ میں اس ماحول میں بھی اپنے لئے گنجائش نکال لیتا مگر ضعیف اور تنہا والدین کے اترے ہوئے چہرے مجھے سیدھے راستے پر لئے جا رہے تھے۔

اگرچہ میرے ماں باپ کو میری جدائی گوارا نہ تھی مگر میں ضد کر کے دلی چلا گیا اور ایک چھاپہ خانہ میں آٹھ روپے ماہانہ پر سپاہی مین ہو گیا۔ چند روز کے بعد والدین کی یاد اور دوستوں کا خیال پھر مجھے کاندھلے لے آیا۔ اور پھر ایک عرصہ تک انھیں گلیوں میں خاک چھانتا

اور لوگوں کی نظروں میں حقیر ہونا پڑا کیا حقیر ہونے کی وجہ صرف یہ تھی کہیں مزدور کا بیٹا ہو کر شہر کے لکھے پڑھے لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔ مگر لکھے پڑھے لوگ میری مفلسی کا کیا مداوا کر سکتے تھے وہ اپنے ماحول میں بلند سہی لیکن کسی کو بلند کر دینے کی اہلیت ہر شخص کا حصہ نہیں ہوتا۔ ان کی نظر میں تو حکومت کا پست سے پست کارکن بھی جلال خدا وندی کا حامل ہوتا ہے۔

غرض زندگی کے بلند و پست پر میری نظر اسی طرح دوڑتی رہی۔ عمر کے ساتھ تجربہ اور تجربہ کے ساتھ احساس شدید ہوتا چلا گیا۔ اور آخر کار وہ وقت آ گیا کہ قصبہ میں میرے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہی میرے محلے کے کچھ لوگ لاہور میں کام کرتے تھے۔ جو یہاں کی معاشرت اور تمدن کے مداح تھے۔ اس لیے میں نے لاہور کا ارادہ کر کے والدین سے اجازت چاہی۔ اور انہوں نے بادل ناخواستہ میری محنت اور وفاداری کے اعتماد پر اجازت دے دی۔

میں لاہور آ کر چند روز ہمراہیوں کی خدمت باورچی کی حیثیت سے انجام دیتا رہا۔ دن بھر بازاروں میں گشت کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ شام کو وہ مجھے اپنے ساتھ تفریح خانوں اور رومان گاہوں میں لے جاتے میں ان کے ساتھ چلا جاتا۔ مگر رقص و سرود کی محفلیں مجھ پر گراں گزرتیں۔ موت سے بدتر دل میں الہام ہوا انسان پھولوں کی مسکراہٹ اور شبنم کی دل آویزی کی داد کیونکر دے سکتا ہے۔ اس کشمکش اور کرب و الم میں صرف نماز ہی میری زندگی میں ایسا فعل تھا۔ جس سے میں ایک روحانی تسکین محسوس کیا کرتا۔ مگر بالکل اسی طرح جیسے ایک شکستہ قبر پر گنجان جھاڑیوں کے اندر شفق کے پرتو میں دیا ٹمٹما رہا ہو۔

میں ابھی اس ماحول میں اپنا مقام ہی تلاش کر رہا تھا کہ اجنبیت اور بے زحمتی کا بھلا ہو کہ بالآخر معماروں کے ساتھ اینٹیں اٹھانے کے لیے جانا پڑا۔ جب میں شام کو مزدوری کر کے گھر آتا تو تھکا ہوا ہونے کے باعث یہ محسوس ہوتا کہ جسم میں صرف اتنی سی زندگی باقی ہے کہ صبح تک چل سکے۔ مگر والدین کا خیال اور ان کا منی آرڈر کا انتظار میرا شانہ پکڑ کر پھر مزدوری پر لے جاتا۔

جب لاہور کی فضا سے مانوس اور راستوں سے ذرا واقف ہو گیا تو اپنی محبوب ترین جگہ یعنی لائبریری کا دروازہ تلاش کیا۔ جب دوپہر کو مزدور آرام کرتے تو میں لائبریری کو بھاگتا اور جب کام بند ہوا کرتا تو سارے سارے دن کتابیں پڑھتا

کبھی کبھی جب طبیعت اچاٹ ہوتی تو مجھ پر ایک جانکنی سی طاری ہو جاتی۔ وطن کی محبت پردیس کا احساس۔ ماں کی شفقت۔ ماں باپ کی یاد۔ دوستوں کی جدائی اور بچپن کے ہنگامے

الامان الحفیظ۔ پہروں دیواروں پر ٹکٹکی لگی رہتی۔ اور قصبہ کی ناہموار گلیاں نظر کے سامنے پھر جاتیں۔ غرض یونہی ہر رات غم اور ہر صبح مشقت کا پیغام لے کر آتی۔ اور گرد و پیش میرے دل کی گہرائی پر انگاروں اور برچھیوں سے جھنکار چھیڑے ہوئے تھے لیکن جب احساس کی شدت نے جذبات کی طرف رخ کیا تو میرا اکتسابی و سماعی علم میرے جہل کی تنگ و تاریک پگڈنڈیوں پر لالٹین لے کر چلنے لگا تو اپنی گہرائی اور مستقبل کے افق پر چاند ستاروں کے عکس اور شعلوں کے بھبھوکے گزرتے دکھائی دینے لگے۔

میری مزدوری سبک بھی رہی تاک لگی۔ مگر اس میں مطالعہ کی گنجائش اور اچھی سوسائٹی کا فقدان تھا۔ مزدوروں سے ملنے والوں کا رویہ۔ معماروں سے بڑے مستری کا برتاؤ۔ ٹھیکیداروں کی شاطرانہ دولت سازی یہ سب میرے دل میں کھٹکنے لگیں اور اس چیز نے بڑھتے بڑھتے نقاب سے وہ دہکتے شعلے اٹھائے کہ میں انسانوں کے گروہ میں فرشتوں اور شیطانوں کی تمیز کرنے لگا

ایک دن ایک ٹھیکیدار نے مجھے کام پر دیر سے آنے کے جرم میں برا بھلا کہا۔ یہ پہلا دن تھا کہ میں کسی سے غیر مہذب طور پر دو بدو جواب میں بات بولنا چاہتا تھا مگر اس کی زیادتی میری کوشش کے باوجود سینے میں دھواں سا بن کے رہ گئی۔ اتنے میں ظہر کی نماز کا وقت آ گیا میں نے نماز پڑھی اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ دعا کے لئے ہاتھ اٹھتے ہی سخت کڑوی دل کی تلخی زبان پر آ گئی اور جھک کر بارگاہِ ایزدی میں غم آلود آنکھوں سے شکوہ کرنے لگا۔ لیکن فوراً ہی اس مقام پر آ گیا کہ الٰہ العالمین جب پردیس میں تیرے سوا کوئی مددگار نہیں تو نگاہِ کرم کیوں نہیں ہوتی۔ اس میں شک نہیں کہ مجھ جیسے ہزاروں کیڑے اس شہر کی گلیوں میں رینگ رہے ہیں لیکن میں تیرے بھروسہ پر اس عالم میں ذلت محسوس کرتا ہوں۔ اگر یہ میری تقدیر ہے تو میرے احساس کی نزاکت اور شدت چھین لے۔ اور اگر یہ میرے گناہوں کی سزا ہے تو معاف کر دے۔ اور اگر اس میں مصلحت ہے تو مجھے ضبط اور برداشت کی توفیق دے۔ مجھے کسی کا محتاج نہ بنا۔ میں غیور ہوں اور غیرت مند ہو کر رہنا چاہتا ہوں! مجھے دولت کی ضرورت نہیں۔ مجھے حقیقی سکون درکار ہے۔ جو تیری یاد کے سوا کہیں میسر نہیں آ سکتا

میں دوسرے دن کام پر نہ گیا اور دامن بچا کر [illegible] پہنچ گیا۔ وہاں شام کے سات بجے سے صبح کے سات بجے تک چوکیداری کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ میں رات جب تمام دن کے تھکے ہوئے جسم نیند کی آغوش میں [illegible]

اپنے اپنے خواب دیکھنے لگتیں تو میں کتاب اٹھا لیتا اور سبزہ زار کے بالائی حصے پر چلا جاتا۔
جہاں سے چاروں طرف کی سڑکیں بھی نظر آتیں تنہائی ہی تنہائی تھی۔ اور سرکاری بتیوں کی روشنی بھی۔
جب ذرا نظر تھکتی یا طبیعت اکتا جاتی تو اٹھ کر ایک دو چکر لگا لیتا۔ کبھی کبھی چاندنی میں
جب کھلی رات ٹہلتا اور ہوا سنکتی تو سرو کی شاخوں پر کھلے ہوئے پھول ایسے معلوم ہوتے جیسے
سبز قالین پر کسی سلیقہ مند مالی کے شیر خوار بچے کھیل رہے ہوں۔

اتفاق سے انھیں دنوں میری ملاقات جناب خواجہ عبدالکریم صاحب سے ہوئی اور انہوں
نے میرے لئے لائبریری سے کتابیں ملنے کا بندوبست کر دیا۔ پھر تو قریب قریب میری تمام
بیکاری [illegible] گزرنے لگی۔ [illegible] اور [illegible] میری علمی مصروفیت کے باعث [illegible]
[illegible] ہو سکے۔ مگر میری [illegible] کی۔ اور اس [illegible] میں مجھے ایک خاص سوجھ
بوجھ ہو گئی۔ [illegible] ہونے کے باعث اپنی کارکردگی کے باوجود تخفیف میں آ گیا۔ ان
دنوں لوگ مجھے جاننے لگے تھے اور گورنمنٹ [illegible] کے باغبان چودھری جناب [illegible]
ایک سیدھے سادے رنگ کی تقریب پیدا [illegible] ہو چکا تھا۔ انہوں نے میری بے روزگاری کا حال سنا
تو خود [illegible] اور گورنمنٹ [illegible] میں نائب باغبان کی حیثیت سے نوکر کرا دیا۔ اس اثنا میں ایک
مزدور سے ملاقات ہوئی جو [illegible] تھا۔ اس نے از راہ ہمدردی مجھے [illegible] باقی [illegible]

اسباب کتابی آدمی [illegible] تھا۔ عنوان کے مضمون کو [illegible] مختصر کر دیا۔ میرے لئے ترقی [illegible]
تھی اور رفتہ رفتہ مشق [illegible] گئی۔ خیال کے ساتھ [illegible] میری شاعری جلسوں اور
مشاعروں میں پسندیدگی کا درجہ حاصل کرنے لگی اور میری [illegible] دوستوں کے علاوہ [illegible]
بن گئی تھیں۔ مجھے ہر صبح یہ معلوم ہوتا تھا کہ [illegible] حقیقت [illegible]
ہو رہا ہے اور ذرہ ذرہ جاذب نظر ہے۔

رفتہ رفتہ دوستوں کی محفلوں میں شاعری کو [illegible] کی کڑیاں [illegible] کی سرحد تک [illegible]
[illegible] ایک ہیولے کی جسمانی روشنی کی سی [illegible] دیکھ کر دل میں [illegible] پیدا کرتا [illegible]
[illegible] مجلسوں میں خود کو اس طرح پاتا جیسے مرجانے والا [illegible] دل میں ایک اچھی [illegible]
میں یہ ضرور جانتا تھا کہ [illegible] ہونا ضروری ہے۔ جو میرے لئے [illegible] تھا
لیکن کہیں سے کوئی حقیقت [illegible] زندگی [illegible] تھی کہ [illegible] ہر قدم پر پہلے سے [illegible] ایک سا
جاتا تھا جس نے [illegible] اٹھایا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ [illegible]

ہونے کے باوجود شعرائی صفائیں میرے لئے صد ہا اور بیا بکساں محبت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ باغباں کی گئی تو میں نے خندہ پیشانی سے ریلوے کی چپراسی قبول کر لی کیونکہ وہ ایک قسم کی دربانی تھی جو مطالعہ میں حائل نہیں ہوئی اور میں اسی طرح کمربستہ علمی و ادبی دنیا کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ مگر جس قدر بڑھتا چلا گیا اسی قدر دفتری غلامی کے لئے بیکار ہوتا چلا گیا جب میں نے دیکھا کہ مجھ سے نہ کوئی چپراسی خوش ہے نہ کلرک تو مجھے فکر دامنگیر ہوئی اور میں فرصت کے اوقات میں روزگار کی تلاش کرنے لگا۔ چند روز کے بعد ایک مطبع کے کتب خانہ میں ملازمت مل گئی اور بیس روپیہ ماہانہ پر کئی برس بال بچوں سمیت زندہ رہا۔ اس کے بعد میں نے اپنی پہلی کتاب "حدیث ادب" چھپوائی اور اسی سے اپنا کتب خانہ بنایا۔

سرگذشت از من چہ می پرسی چہ گویم سرگزشت
موئے سر از پا گزشت و حنا ربا از سر گزشت

انتخابِ کلام

کفر لیکر آئے یا اسلام لیکر آئے ہیں
آنے والے اپنا اپنا کام لیکر آئے ہیں

ہم محبت کا جنونِ خاص لیکر آئے ہیں
اپنی بربادی حریفِ عام لیکر آئے ہیں

ہم سے پوچھو ہم سے "دردِ نامرادی کا علاج
ہم مداوائے غمِ ایام لیکر آئے ہیں

دو جہاں کی نعمتوں کا حق پہنچتا ہے ہمیں
ہم زمانے میں مگر انجام لیکر آئے ہیں

مصلحت تو عشق جانے بارگاہِ حسن کو
کامیاب اکثر دلِ ناکام لیکر آئے ہیں

اس قدر برہم ہے ہم سے حسنِ کافر کا جہاں
جیسے ہم ان میں ہی اسلام لیکر آئے ہیں

اُن کے جلوے سے طرح آنا دیکھے ہم نامراد
چشم و دل پر محبت کا الزام لیکر آئے ہیں

اپنے بندوں سے کیوں احسان شکوہ ہو سکے
خاص انساں ہیں مذاقِ عام لیکر آئے ہیں

غم ہو یا راحت نتیجہ ہر جگہ دیکھا کئے
اصل میں جو چیز ہے دنیا وہی دیکھا کئے

عالمِ عرفاں کی جہاں تک روشنی دیکھا کئے
زندگی میں بندگی کو لازمی دیکھا کئے

خود بخود دنیا میں تبلیغِ جنوں ہوتی رہی
خود بخود اٹھتی تھی بات خود ہی کیا کئے

آشیاں میں کیا رہیں گے کہاں لگے گا ان کا دل
جو قفس کو درسگاہِ آگہی دیکھا کئے

یوں گزاری ہے تہمت میں ہم امید کو
بیقراری کو قرارِ واقعی دیکھا کئے

اس کی عظمت سے نہیں انکار لیکن آج تک
ٹھوکروں میں خوار خاک آدمی دیکھا کیے

رفتہ رفتہ ذوقِ سجدہ آستاں سے بڑھ گیا
اور وہ نفرت جبینِ آگہی دیکھا کیے

کونسی بجلی کو رحم آیا کہ پابندِ قفس
آشیاں تک روشنی ہی روشنی دیکھا کیے

مغربی طرز و طریقِ آگہی کے فیض سے
جہل کے پتلوں میں وہم آگہی دیکھا کیے

ہر قدم اک لغزشِ ذوقِ مقام آتا رہا
زندگی کو اک مسلسل بیخودی دیکھا کیے

مطمئن ہوگا کوئی احسانؔ ہم تو عمر بھر
آگہی کو اک فریبِ آگہی دیکھا کیے

نذرِ غم ہونگا کیا ہائے ہوش کھو کر رہ گئے
داغِ دل جل لب خاموش ہو کر رہ گئے

جب بہار آئی تو اربابِ جنوں کے واسطے
گلستاں غارت گرانِ ہوش ہو کر رہ گئے

ان کے رخ کی روشنی میں ڈھونڈھتی راہِ عدم
ہوش والے یوں بھی ہم آغوش ہو کر رہ گئے

کچھ تو خود مطرب نے توڑے اور کچھ سازِ حیا
کثرتِ نغمات سے خاموش ہو کر رہ گئے

سرگزشتِ دیدہ و دل اتنی کہیں ان کے حضور
ہوش یکسر رہتے ہم بے ہوش ہو کر رہ گئے

گیتے گیتے آفتابِ آب و گل چمکے مگر
خاک کی ظلمت میں سب روپوش ہو کر رہ گئے

دعوتِ دار و رسن پر ہنس پڑے تیرے غلام
تاجدارانِ طرب خاموش ہو کر رہ گئے

دو جہاں کی مشکلوں کو اپنے در پے دیکھ کر
کچھ نہ سوجھا ان سے ہم آغوش ہو کر رہ گئے

دے کے ہم آزاد رندوں کو خراباتِ حیات
آپ خود جانے کہاں روپوش ہو کر رہ گئے

بیخودی نے جب الٹ دی مٹنے ایماں نقاب
ہوش کے سجدے گنہ بدوش ہو کر رہ گئے

کس قدر مہنگی پڑی احسانؔ یہ تقسیمِ ملک
کتنے انساں خانماں بردوش ہو کر رہ گئے

اختر فضل حق سیتاپوری

۱۹۳۶ء میں سیتاپور کمشنری لکھنؤ میں پیدا ہوا۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے میرا نام فضل حق رکھا۔ لیکن میں نے حق کو اختر میں تبدیل کر دیا۔ تاکہ مولویت ختم ہو سکے اور رومانویت میں تبدیل ہو جائے

گھر کا ماحول بیاض کی بیعت اور بخاری شریعت والا تھا۔ والد صاحب (حکیم محمد حسین صاحب مرحوم) مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت تھے ۔۔۔ مجھے بچپن ہی سے موسیقی سے خاص لگاؤ تھا والد صاحب کا سیتاپور اور اطراف سیتاپور میں تبادلہ ہوتا رہا تھا۔ وہ جوڑی کے اطبار میں گنے جاتے تھے۔ وہ نبض دیکھتے تھے۔ اور میں چھپ چھپ کر سہگل کے گیت گاتا تھا۔ والد نے مجھے مار مار کر پڑھنا لکھنا سکھایا۔ فن قرأت سکھایا۔ خوشنویسی کی تعلیم دی۔ انگریزی تعلیم کے وہ قائل نہ تھے۔ تھانوی صاحب کے مرید جو ٹھہرے۔ مجھے آج تک والد صاحب کا وہ جلال تاب چہرہ یاد ہے۔ بھاری بھرکم، رعب دار سفید داڑھی۔ سر پہ پانچ کونوں والی ٹوپی، ٹخنوں سے اونچا پائجامہ ہاتھوں میں تسبیح۔ مریض کی نبض پر انگلیاں اور متبسم ہونٹوں پہ درود وسلام۔ مریضوں کو ان کے تبسم سے آدھی شفا مل جاتی تھی۔ سیر و شکار کے بڑے دلدادہ تھے اس کا شوق بہت بعد کو مجھے بھی پڑتا تھا۔ ان کے دوستوں میں ایک بزرگ تھے خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب تخلص کرتے تھے اور اس وقت کے شعراء میں گنے جاتے تھے۔ سیتاپور آتے اور میرے گھر قیام کرتے۔ ان کی شخصیت سے میں بہت متاثر ہوا اور شاعری کا شوق پیدا ہو گیا۔ اسی زمانے میں میں نے اپنا تخلص لکھنوی کو دکھایا۔ تک بیس برس کا تھا کہ والد نے انتقال فرمایا۔ مجبوراً بہت تاملی ہوگئی۔ بزرگوں نے مجبور کیا کہ تکمیل طب اور والد کی مسند پر بیٹھوں۔ چنانچہ لکھنؤ کے گورنمنٹ طبیہ کالج میں تکمیل طب کے لیے بھیج دیا گیا۔ جہاں تکمیل طب سے پہلے ہی شاعر بن گیا۔ اور بچپن میں جو موسیقی سے انس تھا۔ اس نے اس طرح راہ پیدا کی ابتدا میں حضرت جگر بسوانی کو چند غزلیں دکھائیں کچھ سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک مدت میں استاد حضرت افقر موہانی کی شاگردی اختیار کی۔ مگر افقر صاحب کے اسکول میں شعر و شاعری سے زیادہ سیاست کو دخل تھا۔ ملکی سیاست نہیں بلکہ مقامی سیاست جو شاعروں کو ذلیل بنا دیتی ہے۔ چنانچہ میں نے اس اسکول سے قطع تعلق کر لیا اور والد مرحوم کے دوست نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا شاگرد ہو گیا۔ اب تک انہیں کا شاگرد ہوں اور انشاء اللہ ہمیشہ رہوں گا۔ شروع میں چھپنے کا بہت شوق تھا۔ اور چھپا بھی بہت کافی۔ مگر اب شعر کم کہتا ہوں، سوچتا زیادہ ہوں۔ گویا میری شاعری کا بچپن ختم ہو چکا ہے اور اب سکون ہے۔ پورا ذمہ داری کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سکون کسی زبردست طوفان کا پیش خیمہ ہے یا سکون دائمی ہے۔

غزل کہنا زیادہ پسند کرتا ہوں اور غزل کو غزل ہی کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہوں

اس میدان میں "نعرہ بازی اور ہنگامی اثرات" کا قائل نہیں ہوں۔ تغزل اور رومان کو پسند کرتا ہوں۔ اور "بھوک، ہڑتال اور تنخواہ بڑھاؤ" کو اپنا موضوعِ سخن سمجھنے سے قاصر ہوں۔ آجکل کراچی کے ایک دواخانہ میں طبی خدمات انجام دے رہا ہوں

متفرق اشعار

یادِ غمِ حبیب نے آج مجھے رلا دیا　　منتِ شامِ بیکسی دردِ جگر بڑھا دیا
ان کی نگاہِ شوق نے چپکے سے کیا پلا دیا　　ہوش مرے اڑا دیئے مست مجھے بنا دیا
سمجھے تھے تیری یاد کو وجہِ سکونِ دل مگر　　اس نے تو لے کے درد کی اور بھی کچھ بڑھا دیا

یاد آجاتا ہے پھر واقعۂ برقِ کلیم !
جلوہ فرما وہ سرِ بام اگر ہوتا ہے

اظہارِ تمنا خاک کروں مجبور سا خود کو پاتا ہوں
جب ان سے نگاہیں ملتی ہیں مخمور سا میں ہو جاتا ہوں
انجامِ محبت کیا ہوگا پہروں یہی سوچا کرتا ہوں
ماضی پہ نظر گہہ کرتا ہوں گہہ حال سے دل بہلاتا ہوں
وہ دورِ مسرت ختم ہوا اب حال یہ اختر اپنا ہے
اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک دردِ جگر میں پاتا ہوں

زندگی ہے اک نگارِ خوش ادا　　ہاں اگر حسنِ نظر سے کام لیں
جس کی نظروں نے ہمیں تڑپا دیا　　دل سنبھل جائے تو اس کا نام لیں
خاموش تھا تو دنیا سننے کو تھی فسانہ　　چھیڑا جو قصۂ غم سننے لگا زمانہ
ٹھہر ٹھہر کے پُر درد ابھی ابھی ہیں سنے　　سنا وہ اک سرِ مژگانِ یار دیکھا ہے

وہ ہزار درد ہزار غم مری زندگی میں ڈھل گئے !!
مرے دل میں وہ بھی نہ رہ سکے مرے دل سے وہ بھی نکل گئے

وہی چاند ہے وہی چاندنی وہی تارے ہیں وہی روشنی
مگر آپ تمہارے نہ ہونے سے وہ نظارے جیسے بدل گئے

کس نے چھیڑا فسانۂ دردِ فراق
ساری دنیا گوش بر آواز ہے

تاروں کی سہانی چھاؤں میں ہم تم ہونگے فضائیں جھومیں گی
اک روز محبت کو یوں بھی فردوس بداماں دیکھیں گے

سادگی میں اف لگاوٹ آپ کی
نیچی نظریں اور حسن بے نقاب

صلہ اپنی محبت کا یہ صبح و شام پاتا ہوں
نہ دل کو چین ملتا ہے نہیں آرام پاتا ہوں

اسے میں جذبۂ الفت کہوں یا حسن کی شوخی
کسی کے مرتعش ہونٹوں پہ اپنا نام پاتا ہوں

دلوں پہ برق تبسم گرائی جاتی ہے!
جھکی جھکی سی نظر جب اٹھائی جاتی ہے

لٹی لٹی سی نگہ میں اڑی اڑی سی نیند
فراق دوست میں حالت یہ پائی جاتی ہے

انھیں جو مہرباں پایا تو اپنی داستاں کہہ دی
کہاں تک ہم جانداز حدیث دیگراں کہتے!

چمن کی کیف و مستی میں ہمارا تذکرہ ہی کیا
یہاں تو زندگی گذری ہے ہائے آشیاں کہتے

چھپا چھپا کے جو صورت دکھائے جاتے ہیں
وہ اور ذوق نظارہ بڑھائے جاتے ہیں

پتہ نہیں یہ حقیقت ہے یا فریب نظر
وہ بار بار مرے پاس آکے جاتے ہیں

ارے بیتابی دل یہ کیا کیا
انھیں کیوں کھو دیا اک بار پاکے

کچھ ایسے خواب میں چمن کے سہارے جینا ہوں
نہ ٹوٹیں جو یہ کبھی تو جینا عذاب ہو جائے

ہاں وہی پیار میں ڈوبی ہوئی نیچی نظریں
دل کے پار اتر ا کبھی اور ا کبھی اور ا کبھی

بیکار ہے کوشش چارہ گر جواب ختم فسانہ ہوتا ہے۔
بیمار محبت ظاہر ہے قسمت سے ہی اچھا ہوتا ہے

آجاتے ہو جب تم یاد مجھے ہر انسو زخما شا ہوتا ہے
اک آگ سی بھڑکتی ہے دل میں اک شعلہ لپکتا ہوتا ہے

آجاؤ کہ بیمار غم کو تھوڑا سا سکوں ہی مل جائے
جو ڈوب رہا ہو اس کو بہت تنکے کا سہارا ہوتا ہے

پیہم یہی سوچا کرتا ہوں اور سوچ کے تڑپا کرتا ہوں
مطلب کی ساتھی دنیا میں کیوں ذکر تمہارا ہوتا ہے



علی اختر حیدرآبادی

۱۳۱۱ھ میں رام پور میں پیدا ہوا۔ آبائی وطن علی گڑھ (یوپی) ہے۔ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ، اس کے بعد علی گڑھ کالج اور سینٹ جانس کالج آگرہ میں تعلیم پائی۔ تیس برس سے زیادہ مدت تک حیدرآباد میں قیام رہا۔ "انوار" اور "اسرار" کے نام سے دو مجموعۂ کلام بھی شائع ہو چکے ہیں۔

قائد اعظم کی یاد

پھر تازہ ہوئی قائد اعظم کی یاد — روشن مری آنکھیں ہیں مرا دل ہے شاد
کس فخر سے کہتے ہیں مرے فکر و عمل — کل تک تھے اسیر آج ہوئے ہم آزاد

ذرّوں سے بنائے ستارے تو نے — قطروں میں بسا دیے شرارے تو نے
جو ڈھونڈ رہے تھے راز منزل سمجھے — جو ڈوب رہے تھے پار اتارے تو نے

بگڑی ہوئی دنیا کو بنایا تو نے — اجڑی ہوئی محفل کو سجایا تو نے
وہ دہر مخالف، وہ ترا عزم صمیم — جینے کا ہمیں راز بتایا تو نے

راہوں کے خم و پیچ میں جب گھرتے تھے — ہر گام پہ لڑکھڑا کے ہم گرتے تھے
جب تک نہ پڑی قائد اعظم کی نظر — منزل سے کہیں دور پڑے پھرتے تھے

کشتی کو دیا بڑھ کے سہارا تو نے — پھیرا غم و آلام کا دھارا تو نے
طوفاں سے نمٹنے کے ہیں گر سمجھائے — گرداب میں تھے پار اتارا تو نے

اختر انصاری اکبرآبادی

مجھے اپنی عمر یاد نہیں۔ والدہ مکرمہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا ۴۱ سال ہے۔ وطن اکبر آباد ہے اور مجھے اکبر آبادی ہونے پر ہمیشہ ناز رہا۔ آبائی وطن مدینہ ہے میرے دادا صاحب قبلہ مدینہ شریف سے ہی ہندوستان تشریف لائے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا ذوق بھی بزرگوں کا ہی عطیہ ہے۔ دادا اور والد عربی فارسی کے عالم ادیب اور مقرر تھے۔ یہ نانا مجدد اسد و انشد قبلہ مولوی احمد حسن شوکت حضرت داغ کے ہم عصر تھے۔ اور میرٹھ سے اسی زمانہ میں موصوف کی ادارت میں "شحنۂ ہند" اور "مہرِ درخشاں" نکلتے تھے۔ میرے نانا صوفی سید سجاد حسین کیفیت دہلوی بانی جو عرصہ تک دہلی سے دہلی گزٹ نکالتے رہے۔ دہلی کے قدیم باشندے لئے مجھ سے واقف نہیں۔ میرے والد کا انتقال میری کم سنی کے زمانے ہی میں ہوگیا تھا۔ اس کے بعد والدہ میرٹھ لے آئیں۔ میری تربیت و تعلیم کی سرپرستی میرے محترم پھوپھا جناب ندرت میرٹھی نے فرمائی۔ ندرت صاحب کا شمار اساتذہ فن میں ہوتا ہے۔ اور مجھے ہمیشہ ناز رہے گا کہ مجھے ان کی شفقت نے بہت کچھ دیا ہے۔ باقاعدہ لکھنے کا آغاز چودہ پندرہ سال قبل ندرت صاحب کے اخبار "آئینہ" ہی سے ہوا۔ شروع کے چار پانچ سال کی تحریریں اب میری نظر میں گھٹیا اور غیر معیاری ہیں۔ شروع میں عام کہنے والوں کی طرح میں نے سب کچھ لکھا یعنی مضامین، افسانے، نظمیں، غزلیں وغیرہ۔ اب سے چھ سال پہلے افسانوں کا مجموعہ "زندگی کے رخ" شائع ہوا تھا۔ آج اس مجموعہ کو دیکھتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ افسانوں کے مجموعے کے بعد نظموں کا مجموعہ "کیف و رنگ"۔ اور تضمینوں کا مجموعہ "حسن تضمین" شائع ہوا۔

"کیف و رنگ" کی بعض نظمیں اب مجھے خود پسند نہیں۔ میری پرورش ایسے ماحول میں ہوئی جہاں شاعری نام تھا فرسودہ خیالات کے اظہار اور فنی نوک پلک کا۔ مگر میری طبیعت نے اس قدامت کو راس کیا۔ بدلتے ہوئے حالات اور اپنے احساسات نے ہمیشہ مجھے ادب برائے زندگی کا درس دیا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آیا۔ بہ حیثیت اداریٔ انجمن کی ادارت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ یہاں

آگر میرے ذوق پر بار ہوئی۔ سب سے پہلے مثنویوں کا مجموعہ "جام نو" شائع ہوا۔ اس کے بعد تنقیدی مضامین کا مجموعہ "نظریات"۔ ابھی پچھلے دنوں غزلوں کا مجموعہ "نالۂ پابند" بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ اور آگے ایک ترتیب "نشان راہ" دوسری ترتیب "اکبر اس دور میں" چھپ چکی ہیں۔ نظموں کا مجموعہ مرتب کر رہا ہوں۔ یاد ش بخیر پانچ چھ سال قبل ایک تاریخی تصنیف "فرید [illegible]" بھی شائع ہوئی تھی۔

اپنے شعر دل کا انتخاب بہت ہی مشکل کام ہے۔ بہرکیف چند اشعار لکھ رہا ہوں جنہیں احباب کی پسندیدگی کا شرف حاصل ہے۔

متفرق اشعار

یہ زندگی ہو عروج و پستی ہر اک نفس ہے فریب ہستی
جو یہ دھندلکے عبور کر لے تو دور تک روشنی ملے گی

انسانیت گناہ میں بہتی ہے کس طرح
جیسے چڑھتے ہوئے شباب کے دھارے پوچھیے

زندگی کا ہنگامہ موت کی سی خاموشی
شام دیکھنے والو عالم سحر دیکھا

بات تھی محبت کی ذکر تھا جوانی کا — ہے کہ آج انگڑائی اسے جھوم کر دیکھا
افق سے اور ادھر بھی ہیں میری گل — میں پڑھ رہا ہوں برابر فیض حرف جمال
نگین دامن گلزار کا دھبہ ہیں لیکن — نہ ہوں گے ہم تو پھر حسن بہاراں کون دیکھے گا
ہزار بار بجے چنگ و رباب ٹوٹ گئے — اس انجمن کے ترانے ابھی نہیں بدلے

جو فسانے لب گفتار تک آئے بھی نہیں!
رنگ بن کر ترے رخسار تک آ پہنچے ہیں
مسکراتا ہوا خود سامنے آ جائے دوست
ورنہ ہم پردہ کا اسرار تک آ پہنچے ہیں!

ابھی پینے کا زمانہ ہی نہیں ہے ساقی — تیر [illegible] ترا [illegible] جام پسند
تمہارے شوق تھا [illegible] رہے قدم لیکن — ہماری راہ میں طوفان آ گئے ہیں کیا کیا

کون کرتا ہے ابھی گردشِ دوراں کا خیال
گردشیں دیکھ رہے ہیں ابھی ہیہاں تو نگی

بجلیاں ہیں افق کے داماں میں — آگ ہی آگ ہے بہاماں میں
تیری زلفوں سے بھی زیادہ ہیں — پیچ و خم آج زلفِ دوراں میں

سکونِ ہستی کا کیا تجسس سکونِ ہستی ہے ننگِ ہستی
نئے حوادث کی جستجو کر کہ زندگی حادثات میں ہے

تناہیوں میں جھونک دو سفینۂ سکونِ دل — یہ زیر و شورِ بحر کا حباب کے لئے نہیں
ملے گی شانِ زندگی عمل سے جدوجہد سے — جو دیکھتے ہو خواب ہیں وہ خواب کیلئے نہیں

وہ اپنی شانِ عزائم پہ ناز فرمائے — جو اپنی سمت زمانے کو کھینچ کر لائے
گذر رہا ہوں ابھی تک میں خارزاروں سے — ابھی سے کس نے محبت کے پھول برسائے
ستم ظریف ہیں گم کردہ راہ دیوانے — جہاں کا عزم کیا تھا وہیں نکل آئے

اختر جیلانی ناگپوری

آج سے کم و بیش ۲۰ سال قبل صوبہ سی۔پی کے دارالخلافہ ناگپور محلہ بھا لدار پورہ میں پیدا ہوا تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلا آیا۔ اور آجکل اسی مملکت خداداد کے دارالخلافہ میں مقیم ہوں شاید یہ صحیح ہو

لاریب ذی شعور فکر و فہیم ہوں — افسوس لاکھ بیت ہیں لیکن مقیم ہوں
اختر مرے مقام سے دنیا ہے بے خبر — سی۔پی کا رہنے والا ہوں در یتیم ہوں

میری تعلیم صرف انٹرینس تک محدود ہے۔ مزید حصول تعلیم کے پیش نظر دو مرتبہ کراچی کے کالجوں میں داخلہ لیا۔ مگر بد قسمتی مانع رہی تاہم عزائم مستحکم ہیں۔ یعنی یہ کہ میں مزید حصول تعلیم کے لئے کوشاں ہوں۔ پان بیڑی سگریٹ اور اسی قسم کی دوسری لغویات کو اپنے لئے اچھا نہیں سمجھتا۔ حتیٰ کہ چائے کو بھی کبھی کبھی منہ لگاتا ہوں۔ مجھے بچپن ہی سے اپنی

مادری زبان اردو سے ایک فطری لگاؤ ہے۔ اور غالباً اسی فطری لگاؤ کی وجہ سے پرائمری مڈل اور ہائی اسکول کے دوران تعلیم میں نے اردو کو تمام دوسرے مضامین پر ترجیح دی اردو سے اسی فطری لگاؤ کی کرشمہ سازی کے طفیل مڈل اسکول کے دوران تعلیم میں مجھے روزانہ اسکول کے تمام طلبا کو علامہ اقبال مرحوم کا ترانہ ملی۔

"چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا"

پڑھانے کا اعزاز بخشا گیا تھا۔ اردو سے والہانہ شیفتگی کی بنا پر مجھے اسکول اور سامعین کی طرف سے تحفہ جات بھی دیے گئے۔

دن گذرتے گئے میں مڈل سے ہائی اسکول جانے لگا۔ یوں تو بچپن ہی سے میرے ادبی ذوق کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ لیکن ہائی اسکول کی ادبی فضا شاعرانہ ماحول اور چند ادب نواز حضرات کا خلوص میری شاعرانہ صلاحیتوں کو ابھارنے اور نکھارنے میں خاص طور سے معاون و مددگار ثابت ہوئیں۔ میں اور میرا ایک عزیز ترین دوست تنویر جو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو ایک منتخب مصرعہ پر طبع آزمائی کی دعوت دیتے اور دونوں کچھ نہ کچھ کہنے کے لئے ایک دوسرے کو مجبور کرتے غالباً ۱۹۴۸ء کا زمانہ تھا۔ جب میں انجمن ہائی اسکول ناگپور میں میٹرک کلاس کا طالب علم اور اپنی مادر درسگاہ کی وزارت کا وزیر تعلیم تھا۔ تو وزارت تعلیم کے تحت ہر اتوار کو ایک بزم سخن منعقد ہوا کرتی تھی جس میں مقامی شعرا بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ اور انھیں حضرات میں کسی ایک کو صدر شاعرہ بنا دیا جاتا تھا۔ خلاف معمول ایک اتوار کو مجھے ہفت روزہ نشست کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اور اسی نشست کے طفیل میں میں نے اپنی پہلی غزل کہی ہفت روزہ نشستیں ہوتی رہیں۔ اور میں غزلیں کہتا رہا۔ اور پھر ایک دور وہ بھی آگیا جب مجھے ایک استاد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آخر کار ایک عرصہ کے بعد میرا شعری ذوق مجھے طرفہ قریشی کی خدمت میں کھینچ لے گیا۔ میں نے موصوف کو اپنی پہلی غزل دکھلائی جس میں شعری صلاحیت مفقود اور تک بندی بدرجہ اتم موجود تھی۔ حضرت طرفہ قریشی نے مطلعے مقطع کے باقی تمام اشعار پر خاطر خواہ اصلاح فرمائی۔ جسے دیکھ کر مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ شعر کہنا حقیقتاً بچوں کا کھیل نہیں۔ میری درخواست پر کہ میں آپ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ حضرت طرفہ قریشی نے یہ کہتے ہوئے کہ "میاں عرصہ ہوا ایسے

سلسلۂ شاگردی منقطع کر دیا ہے۔

میری درخواست مسترد کر دی لیکن ایک طویل زمانے کی اطمینان دہی کے بعد موصوف نے مجھے اپنا شاگرد بنا لیا۔ اور اب میں بالواسطہ علامہ سیمابؒ کے روحانی فیض سے مستفید ہو رہا ہوں۔ میرا شجرۂ شاعری یوں پڑھا جا سکتا ہے۔

اختر چنیالی شاگرد حضرت طرفہ قریشی شاگرد حضرت علامہ سیماب اکبر آبادیؒ

تین سال کے طویل عرصہ میں بہت کم اشعار کہے جو صرف چند اشعار اور چند قطعات پر مشتمل ہیں۔ انتخاب کلام کی حیثیت سے اپنے وہ اشعار جو شعراء و دیگر باذوق حضرات نے پسند فرمائے پیش کر رہا ہوں۔

"گر قبول افتد زہے عز و شرف"

متفرق اشعار

رنگین ہر کلی ہے گلوں پہ نکھار ہے
گلشن پہ آج رحمت فصل بہار ہے

اے انقلاب تیری نوازش کا شکریہ
میں ہوں قفس ہے اور چمن کی بہار ہے

آئے وطن کی یاد مجھے بار بار کیا (اختر خزاں نصیب چمن کی بہار کیا
اے دوست میرے حال کا سب کچھ تھا ان کو علم
کچھ بھی تجھ سے ہو نہ سکا انتظار کیا

ہر وقت جن کے سامنے ہو مسئلہ حیات
پھر ان کو فکر گردش گرد و غبار کیا

تم بھی بدل گئے ہو زمانے کے ساتھ ساتھ
اب ہو گئے ہو تم سے وہ قول و قرار کیا

دل نے پہلو میں تڑپ کر انہیں جب یاد کیا
عشق کی روح کو آمادۂ فریاد کیا

بھولنے والے تجھے اتنا بھی یاد رہے
میں نے ہر لحظہ محبت میں تجھے یاد کیا

اتنے غم سہہ کر بھی دی داد ستم والوں نے مرے
بارہا نام لیا تیرا کبھی یاد کیا

ملتفت وہ نہیں تو کیا غم ہے
غم یہ ہے اس کا کہ درد بھی کم ہے

جب سے بدلی ہے انکی چشم کرم
اور ہی کچھ ہمارا عالم ہے

راہ الفت کی کلفتیں توبہ!!
ایک اک گام پر نیا غم ہے

آگیا کون آج پاس میرا
چاند تارہ دل میں روشنی کم ہے

ہجر میں تیرے پرتو خورشید
دل ہے بیتاب آنکھ پرنم ہے

دینے والے مجھے پیام خوشی
مجھکو مرغوب آج کل غم ہے

حال دل کس سے کہئے اے اختر
کون اپنا جہاں میں ہمدم ہے

تیری بے اعتنائیاں توبہ
سوزش غم جواں نہ ہو جائے

پھر وہ ہیں ملتفت ادھر اختر
پھر محبت جواں نہ ہو جائے



لئیق احمد دہلوی

پیدائش [illegible] سوچتا رہتا ہوں کہ میں وطن کے انتخاب کے سلسلے میں پریشان ہوں! کیونکہ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میرے والد کا وطن پانی پت اور والدہ کا امروہہ تھا لیکن خاکسار دہلی میں پیدا ہوا۔ بچپن میں شعر و شاعری کا کوئی شوق نہیں کرایا جاتا تھا۔ اس لئے خود کو دہلوی لکھنے لگا۔

[illegible]

اے عشق ہم کو گردش [illegible] کیا بتائیں
مدینے کی [illegible] کی یاد میں جاگیں تمام رات
اے خوش نصیب [illegible] کچھ تجھے!!
لیستا رہا ہے چاند [illegible] تمام رات

ادب

محمد سعید خاں

لوگ مجھے محمد سعید خاں کہتے ہیں۔ ادب تخلص کرتا ہوں، چونکہ علامہ سیماب نے مجھے شعر و شاعری سے صحیح طور سے روشناس کرایا۔ اس لئے مرحوم سے دلی عقیدت کی بنا پر سیمابی کہلانا پسند کرتا ہوں کبھی میرا وطن دریاآباد تھا لیکن اب میرے لئے ہندوستان کی سرزمین ہی سب کچھ ہے۔ کچھ وجوہات کی بنا پر میری تعلیم پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکی لیکن اہل علم حضرات کی صحبت نے تعلیمی کمی کو کسی حد تک پورا کر دیا شعر و ادب کا ذوق مجھے ورثہ میں ملا اس لئے طبیعت ابتدا سے شعر گوئی کی طرف راغب رہی۔ لیکن پے در پے صدمات کی وجہ سے طبیعت پر ایک عرصہ تک جمود طاری رہا۔ مگر اس دوران میں میری نگاہیں ایک قابل استاد کی متلاشی رہیں۔ اتفاقاً میری نظر سے علامہ سیمابؒ کا لافانی کلام گزرا اور میں ۱۹۳۷ء میں علامہ سیمابؒ سے متعلق ہو گیا۔ میری زندگی میں کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں جسے تحریر کروں۔

یہ زندگی اب تک جن حادثات کا شکار رہی ہے اور میرے دل پر نیرنگیٔ زمانہ نے جو زخم چھوڑے ہیں ان کو کیسے مٹا دوں یہ درد اور یہ زخم میری زندگی کا سرمایہ ہیں سوچتا ہوں کہ یہ زندگی کے لمحات ہزاروں سے جلد مختصر ہو جائیں۔ کاش ایسا ہو سکتا عرض کہ

"جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں"

متفرق اشعار

آسان سمجھتا ہوں رہ عشق کی سختی ! مشکل بھی ہے اب تو مری مشکل سے بہت دور

نہ پوچھو عشق کی دنیا میں کیا معلوم ہوتا ہے
مسلسل آفتوں کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے

نہ وہ اپنے نہ دل اپنا نہ دنیا ہے خوشی اپنی
کہاں جاؤں یا رب یہ پریشاں زندگی اپنی

محو داماں کہاں ہے مجھ تک ترا فسانہ — اب تو تجھے بھی کچھ لگا زمانہ
وہ بے کسی کا منظر اب تک خیال میں ہے — ہوتی رہی جفائیں دیکھا کیا زمانہ
رسوائی محبت دل کو نہیں گوارا — مجھ کو اب آپ ہی سے الفت ہے غائبانہ
منفعل ہو کر ستم سے ہاتھ اٹھانا ہی پڑا — میری الفت پر انہیں ایمان لانا ہی پڑا
دیکھتا ہوں ان کی نظر پر ہے بیانِ التفات — میں نہیں تاثیرِ الفت کا اثر قائل کبھی

ہے عجب آتش بھرا دل شیفتہ دیوانوں کے پاس
آگ سی محسوس ہوتی ہے گریبانوں کے پاس

چرخ پر کالی گھٹا ہیں ساقیا ساغر بکف — واعظا! اٹھ بے تکلف ہے یہ سماں میرے لئے
ابر بہار کالی گھٹا ہیں کہاں اب — ملتان میں تو موسم برسات ہی نہیں
اب ہستی انساں میں بقا کھیل رہی ہے — نادان ہیں پردہ فنا کھیل رہی ہے
حسن والے جو باوفا ہوتے! — نہیں معلوم کیا سے کیا ہوتے
اے ضبط درد عشق خدارا معاف کر — کہہ تو دیا کہ آج بہت بیقرار ہوں
ان کے حریم ناز کی پابندیاں نہ پوچھ — یہ حکم ہے ذکر وفا بھی نہ ہو سکے

محمد صبغت اللہ



مجھے علامہ سیماب سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ حالات زندگی کے بجائے صرف ایک شعر سن لیجئے
ارشد اسی کا نام ہے دنیائے عشق میں — سرگشتہ و خراب تمنا کہیں جسے

علی محمد

ارشد

نام علی محمد۔ تخلص ارشد۔ تاریخ پیدائش ۱۰ نومبر ۱۹۱۵ء۔ وطن مالوف [illegible] ضلع جالندھر مشرقی پنجاب ہے۔ آبائی پیشہ زراعت تھا۔ کچھ عرصہ بعد [illegible] نے کا چسکہ ڈال دیا۔ والد مرحوم نے [illegible] کی دوکان کی بنیاد رکھی جو مستقبل قریب میں [illegible] تجارتی شعور کی ترقی کی ضامن ہوئی۔

پرائمری تک تعلیم مقامی مدرسہ سے حاصل کی۔ انٹرنس کا امتحان ڈی۔ بی۔ ہائی اسکول نکودر سے پاس کیا۔ [illegible] مالی [illegible] کی ساری [illegible] اسی مناسبت سے اپنے ہم جماعتوں اور اسکول ٹیچروں میں [illegible] بیان ہوتا ہے [illegible] سے کافی استفادہ حاصل کیا۔ وسائل کے باوجود اعلیٰ تعلیم سے محروم رہنا پڑا۔

ان دنوں جالندھر ادبی انجمنوں اور سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ "بزم اقبال" اور [illegible] ادب کی طرف سے آئے دن مشاعروں کے انعقاد کا [illegible] ہوتا رہتا تھا جن میں اکثر ملک کے مشہور و معروف شاعر شرکت کیا کرتے تھے۔ جناب [illegible] کی صحبت اور مشاعروں میں شرکت کا باعث ہوئی۔

پہلی غزل [illegible] کے لئے [illegible] شامل ہونے کا دروازہ کھل گیا۔

کچھ عرصہ کے لئے [illegible] کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع [illegible] [illegible] [illegible]

انہی ادبی مشاغل [illegible] سکتا تھا شروع شروع میں طبیعت
بڑی اکتائی لیکن [illegible] دو کان پر چھوٹی علی محمد اور حافظ
[illegible] حاصل تھا [illegible]
علاوہ ادبی ذوق [illegible] لیکن [illegible]
[illegible] کی [illegible]
[illegible]

[illegible] (FORWARD BLOC [illegible]) [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] پاکستان [illegible]
[illegible]
[illegible]
کلام ایک [illegible] نظم درج ذیل ہے۔

نظم

جب [illegible]
یہ حسرت دیکھنا [illegible]
ہیں [illegible] آنکھوں [illegible]
[illegible]
پرانے کیا [illegible] !
[illegible]
گمان تھا [illegible]
[illegible] اور مقدر میرا سوتا ہے

وفا کے کھنڈروں میں اکثر جفا جب دیکھتا ہوں میں
خود اپنی آرزوؤں کے گلے کو گھونٹ لیتا ہوں
بچا کے جب میں پاؤں کے لہو کے گھونٹ پیتا ہوں
کبھی اکثر میں تنہائی کی رونق جب دیکھ لیتا ہوں
ارادہ جب کبھی کرتا ہوں کہ دنیا چھوڑ جاؤں میں
تمنا جب مری پوری نہیں ہوتی ہے ساون میں!!
سنہرا جب ہوتا چکا ہے سماں یا دو سماں آئی
فضا جب سوگوار ہوتا ہے دل لیے دامن یا آئی
تمہاری یاد دل کے دامن میں چھپ کے دل لاتی ہے
حیات نو کا اک نغمہ جب لبوں پر لاتی ہے
بہاروں میں کبھی مرجھانے میں زندگی محسوس کرتا ہوں
رگوں میں اپنی جوش زندگی محسوس کرتا ہوں

ارمان

ملک محمد علی انصاری

۱۹۲۵ء میں بمقام لاہور پیدا ہوا۔ شروع ہی سے طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل تھی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر کچھ عرصہ مدرسی کی مگر اس پیشے سے طبیعت بہت جلد اچاٹ ہو گئی اور اپنا رجحان ٹیکنیکل کی طرف مائل دیکھ کر مشاورت سے صنعتی اسکول میں داخل ہو گیا اور دو سال بحیثیت اپرنٹس کام کرتا رہا۔ خوش قسمتی سے اپرنٹس کی میعاد ختم کرنے کے بعد لاہور کے ٹاؤن ہال میں بحیثیت مستری کام کرنے کا موقع مل گیا جسے میں اب تک کر رہا ہوں اور شاعری ہمیشہ کرتا رہا ہوں۔ ساتھ ہی مشق سخن بھی جاری رہی۔ لاہور کے ٹاؤن ہال کے بین الملکی مشاعرے میں بھی شرکت کرنے کا موقع ملا۔ برق نیمی صاحب راغب دہلوی اور جناب وصی الدین صاحب عارف بلبل و بیخود دہلوی ہم صحبت و ہم مشق ہیں۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں حضرت ماچی منشی وحید الدین صاحب بیخود دہلوی کا تلمیذ ہوں۔ احباب تو یہ ارادہ میری زندگی کا نصب العین ہو چکا ہے کہ اردو کے کام آسکوں۔

متفرق اشعار

دل گیا جان گئی کیسا اپنا رہا — اس محبت میں کیا نہیں جاتا
لو کوئی آرزو بھی دل میں ہے — یہ پتہ بھی رہا نہیں جاتا
کوئی تاب نظارہ لائے گا کیوں کر — سوا ہے تیرا حسن سے بھی بے نقابی
اب زندگی کے دن مجھے دشوار کاٹنے

اپنے آرزو کو مٹا کر چلے گئے
کچھ حادثات دہر نے مجھ کو کیا خراب
کچھ ان کا تبسم مجھ کو بھلا کر چلے گئے

جان جانے کسی کی کوئی پوچھے — واہ کیا شان دلربائی ہے
تمہارے لطف نے مجھ کو بنا دیا — اسیر دام محبت بنا کے چھوڑ دیا
تمہاری ایک نظر میں ہزار جادو ہے — مجھے نگاہ سے مجبور بنا کے چھوڑ دیا

جس کے نشاط و عیش میں گزرے تھے روز و شب
اب کو بھلا تجھ کو مرے حال زار کی
مجھ سے نہ پوچھئے جو گزرا ہجر میں
کیا کہوں گزری کیسی شب انتظار کی
وہ دن کہ جن کی یاد ہے اب حاصل حیات
یہ وہ دن کہ جو گزرے ہیں محبت میں یار کی

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

مجھ پر ستم ہوا نہ کوئی ہم سے کنارا دیکھا
نہ کوئی عالم فانی میں سہارا دیکھا
چشم پرنم دل مضطر خراب و خستہ
حال ارمان ہوش یہ تمہارا دیکھا

محمد اسد خاں ملتانی

میرا نام محمد اسد خاں، والد مرحوم کا اسم گرامی خان قلندر قادر خاں، قوم افغان شیرانی، تاریخ پیدائش ۱۲ رمضان ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۹۰۲ء، مقام پیدائش محلہ افغانان ملتان شہر۔ مشن اسکول ملتان اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۲ء میں بی اے کیا۔ ۱۹۲۵ء میں امتحان مقابلہ میں کامیاب ہو کر گورنمنٹ آف انڈیا سکریٹریٹ میں ملازم ہوا۔ فارن اینڈ پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ اور سپرنٹنڈنٹ رہا۔ پاکستان بننے پر وزارت خارجہ میں سپرنٹنڈنٹ اور بعد ازاں وزارت ریاست ہائے سرحد میں اسسٹنٹ سکریٹری ہوا۔ اس طرح کوئی تیس برس دہلی و شملہ میں گزرے اور اب چار برس سے کراچی میں قیام ہے۔

شاعری کا آغاز نو دس برس کی عمر سے ہوا۔ باقاعدہ اصلاح کسی سے بھی نہیں لی۔ البتہ ایک نظم پر حضرت علامہ اقبال نے از خود اصلاح فرما دی۔ اور گورنمنٹ کالج لاہور کے ۱۹۲۱ء کے سالانہ مقابلہ میں اس نظم کو اول قرار دے کر انعام کا مستحق ٹھہرایا۔ دوران تعلیم میں شعر و شاعری کا چرچا صرف کالج کے حلقے تک محدود رہا۔ البتہ تعلیم سے فراغت کے بعد اردو اور فارسی کی مختلف نظمیں "زمیندار" اور "انقلاب" میں شائع ہونے لگیں۔ بعض فارسی نظمیں افغانستان کے جرائد میں نقل کی گئیں۔ وقتاً فوقتاً "نیرنگ خیال"، "ہمایوں" و دیگر ادبی رسائل میں نظمیں نکلتی رہیں۔ ۱۹۳۰ء سے زیادہ تر رسالہ "معارف" اعظم گڑھ میں شائع ہوئیں اور ۱۹۳۲ء سے رسالہ "طلوع اسلام" میں بالالتزام شائع ہونے لگیں۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ پہلے دہلی کا رسالہ "آج کل" اور اب کراچی کے رسالہ "ماہ نو" میں بھی مضامین نظم و نثر چھپتے رہتے ہیں۔

مجموعہ کلام ابھی شائع نہیں ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں "مرثیہ اقبال" کے نام سے ایک مختصر سا رسالہ نکلا۔ اب چند مجموعے زیر ترتیب ہیں۔

عجب کیا ہے جو اس کی قدر پہچانی نہیں جاتی   بتوں کے سامنے تسلیم کی عقل انسانی نہیں جاتی
یہ سب دیوانگی ہے جو خدائی میں بڑھا بیٹھیں   بڑی ہے چیز انساں کی نادانی نہیں جاتی

ہنسی پھولوں کو آئی شبنم کے آنسو دیکھ کر یک جا — چمن میں دیدۂ نرگس کی حیرانی نہیں جاتی
قیامت ہے بہشت جاوداں میں بھی نہیں لگتی — یہاں اپنے دل سے یادِ عالمِ فانی نہیں جاتی
نہایت دلکشا ہے تیرے جلووں کی فراوانی — مگر ان سے نظر کی تنگ دامانی نہیں جاتی
مٹے شبنم کے قطرے اور بڑھی پھولوں کی رنگینی — یہاں ہیں رائیگاں کوئی بھی قربانی نہیں جاتی
محبت کی برائی حضرت ناصح نے بتلا کر دی — اب ان کی کوئی سچی بات بھی مانی نہیں جاتی

اسد جب تک جہاں میں رہ بنیانِ ذوق باقی ہے
سخن سنجی نہیں مٹتی غزل خوانی نہیں جاتی

نہیں نہ زاہد و واعظ کے بس کی بات نہیں — تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں
ہیں کچھ لبوں پہ فسانے چمن کی رعنائی — فقط اسیری دام و قفس کی بات نہیں
نگاہ بھی نہیں اٹھتی بلندیوں کی طرف — طلب کا ذکر نہیں دسترس کی بات نہیں
نگاہ دوست سے ہوتی ہے دل کی نشو و نما — یہاں مقابلۂ برق و خس کی بات نہیں
عجب نہیں جو محبت ہو زندۂ جاوید — کہ عرض شوق نفس در نفس کی بات نہیں
پسندِ خاطرِ اہلِ صفا ہے میری غزل — کہ اس میں کوئی ہوا و ہوس کی بات نہیں

اسد یہ کام ہے صد گونہ سینہ کاوی کا
حیات صرف شمارِ نفس کی بات نہیں

حائل تری طلب میں خیالِ اجل کہاں — یہ مقصد یا نہ ہے طولِ امل کہاں!
ناصح تو دیکھتا ہی نہیں موقع و مقام — ہر بات ہر جگہ کے لئے برمحل کہاں!
کل بھی تو آج بن کے نکل جائے گا یونہی — قبضے میں تیرے آج نہیں ہے تو کل کہاں!
لے کر نظر اسے کسی قیمت پہ بیچ دی — دل ایک ہی تو چیز ہے اس کا بدل کہاں
شیریں کا ہو گیا ہے نہ سر دے کے پرویز کا دہن — پہنچا ہے کوہکن تیری محنت کا پھل کہاں
نازاں ہے شوخ حسن سے بیگانہ ہی رہا!!! — حسنِ نظر نہیں ہے تو حسنِ عمل کہاں
ہر شخص کو دیدِ فن اجنبیاں سمجھو — گو بے خبر نہ ہو کہ پڑھے گا غزل کہاں!
تعریف ہو کہ طنز یہ کہنا ان کا تبصرہ — پہنچا گئے ہیں اسد کہاں اپنی غزل کہاں

خطیب سے خطاب

ذوقِ ایثار و عمل کا نہ تجھے ہے نہ مجھے — زیست اس طرح کی زیبا نہ تجھے ہے نہ مجھے
ڈھونڈتے رہتے ہیں لذت سخن آرائی میں — عملی کام کا چسکا نہ تجھے ہے نہ مجھے
مست رکھتا ہے ہمیں نشۂ صہبائے سخن — حاجتِ ساغر و مینا نہ تجھے ہے نہ مجھے
ہمہ تن قال ہی رہتا ہے کہاں کی واثق — مان لیتا ہوں کہ سودا نہ تجھے ہے نہ مجھے
اپنی الہام نوازی کو ہم چاہتے ہیں منوانا — جس پہ الہام کا دھوکا نہ تجھے ہے نہ مجھے
سب یہ وہ سمجھیں فقط سن کے ہماری باتیں — قوم نے غور سے دیکھا نہ تجھے ہے نہ مجھے
یہ تو سوچیں کہ بھلا دین کی کیا خدمت کی — میں نے دیکھا کام دنیا نہ تجھے ہے نہ مجھے
فکر پہ فخر مجھے اور تجھے نطق پہ ناز — دست و بازو پہ بھروسا نہ تجھے ہے نہ مجھے
میرا چلتا ہے قلم اور تیری چلتی ہے زباں — حوصلہ تیغ و پا کا نہ تجھے ہے نہ مجھے
تجھ کو تقریر سے مطلب مجھے اشعار سے کام — حالتِ قوم کی پروا نہ تجھے ہے نہ مجھے
جاں نثاری کا سبق دیتے ہیں اوروں کو لیکن — اپنے کٹنے کا گوارا نہ تجھے ہے نہ مجھے

ذاکر اے کاش ہم کو دکھلائے نہ وہ میدانِ عمل
اپنے کہنے سے کہ ٹلنا نہ تجھے ہے نہ مجھے

قرار دادِ مقاصد

اب کچھ کرو کہ حسن کا چرچا ہوا تو ہے — اس دور میں بھی عشق کا دعویٰ ہوا تو ہے
ڈھونڈو طریق جلوہ اگر کام کو نہیں — تنہا اس پہ چلنے کا ارادہ ہوا تو ہے
تصویر صاف ہو گی ابھار و نقش بھی — دھندلا سا ایک نقش ہویدا ہوا تو ہے
پھر ہو گیا ہے جرأتِ پرواز کی امید — روشن نگاہ سوئے ثریا ہوا تو ہے
آثار سر بلندیٔ اسلام ہیں عیاں — دنیا و دیں کا سلسلہ یکجا ہوا تو ہے
انجام کے لئے تو خدا کا سہارا ہے — آغاز کا سبب تمنا ہوا تو ہے
پھر لی ہے حق نے وحدتِ کردار کی بنا — اس وحدتِ نظر کا تقاضا ہوا تو ہے

غیروں کے اعتراض مبارک کہ ہم [illegible] تا بیرون کا ولولہ پیدا ہوا تو ہے
آنے کو ہے دوبارہ فروغ حرم کا دور باطل طلسم دیر و کلیسا ہوا تو ہے
افرنگ سے حجاز کی جانب پھرا ہے رخ
قبلہ بنانے قوم کا سیدھا ہوا تو ہے

متفرق اشعار

تجلیات جہاں سے خدا کو دیکھ لیا اڑی جو خاک تو ہم نے ہوا کو دیکھ لیا
خلاف مصلحت [illegible] اکثریت ہوں پایا ضرور کشتی دل میں سوار ہے کوئی
کی مسلمانوں نے ترقی جو فرنگی ہو کر وہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں
دل جو تاب کر سکے کیوں رہ طلب منزل ہے سفر ختم مگر شوق سفر باقی ہے
اسی سے [illegible] شیخ [illegible] دشمن ہے خبر نہیں یہ ہوا دوست ہے کہ دشمن ہے
ظہور میرا کلیم تازہ [illegible] ہے تو کوئی بتلائے یہ جلوے جہاں [illegible]
ہو جانا [illegible] دشوار ہے ہو جانا بھی دشوار ہے
آسان ہونے کے لئے آخر کوئی مشکل تو ہو
جو شخص بناتا ہے اخلاق کا معیار خود اپنے لئے اور زمانے کے لئے اور
[illegible] مشکل ارباب ہوس کی ہوئی آسان مجھے
کسی کے [illegible] کوئی قوم بھی [illegible]
وہ [illegible] اور [illegible]
[illegible] یا [illegible] محبت کے [illegible]
کچھ [illegible] دل میں انکی یاد آئی
[illegible] ہوا [illegible]
خیال کو بھی [illegible] میری نظر میں [illegible] کرتا ہے
[illegible] جنتی ہوئی جنت سے دوزخ کا عذاب [illegible]
کیا شرما سکے کسی دامن کی جانب دست شوق
جن کی خود اپنے گریباں تک نہیں ہے دسترس

جو کوئے یار کو جاتے ہیں ہوشیار رہیں — کہ خلد راہ میں پڑتا ہے امتحاں کے لئے
فنا یہی ہے کہ دل میں نہ ہو یقین بقا — بقا یہی ہے کہ اندیشۂ فنا نہ کریں!
کچھ نہیں ہے کسی کے دل کی خبر — خلق سے صورت آشنائی کریں
کارخانہ صانع عالم کا رکتا ہے کہیں — کارکن مرتے رہے اور کام چلتا ہی رہا
بولنا چاہتے ہیں عشق اور حسن — گفتگو کا بہانہ ہیں ہم لوگ!

حضرت ناصح کے چہرے پہ جو ہیں آثار کیف
پند ترک مے میں بھی شاید سرور بادہ ہے

اصغر

صغیر احمد

نام صغیر احمد تخلص اصغر۔ تلمیذ نیر سیمابی وطن کوٹ ضلع فتحپور۔ پیدائش اپریل ۱۹۴۷ء چند شعر پیش کرتا ہوں۔

لے اے جنون فتنہ ساماں — یہ ہے دامن یہ ہے گریباں
ابلیس کی خدائی ہے دنیا میں آجکل
دیکھو تو چھپ کے بیٹھ گیا ہے خدا کہاں
گھبرا کے رہ نہ جاؤں رہ شوق میں کہیں
آخر یہ کھو گیا ہے مرا رہنما کہاں
کیسے سناؤں یہاں گیت حسن و الفت کے
کہ یہ جہان نہیں شائستہ بہار ابھی

الحاج محمد اصطفا خاں

قنوج ضلع فرخ آباد میرا وطن مالوف ہے جو قدامت کے لحاظ سے بہت سی باتوں میں آج بھی سرِ فہرست ہے۔ والد بزرگوار قبلہ محترم جناب حاجی محمد مرتضیٰ خاں صاحب اوصاف [illegible] اپنی قوم جیسی اعلیٰ خصوصیات کے مالک اور حسن اخلاق کا مظہر تھے۔ آپ کو حضرت مولانا حاجی شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے شرفِ بیعت حاصل تھا۔ آپ نے ۱۳۳۲ھ میں انتقال فرمایا اور لکھنؤ ہی کو آخر زندگی میں اپنا مستقر بنا لیا۔ میرے مورثِ اعلیٰ محمد نقی خاں بن محمد ابراہیم خاں صاحب افغانستان کے شہر قندھار سے حضرت بالا پیر رحمت اللہ علیہ کی ہمرکابی میں ایک مرید کی حیثیت سے ہندوستان تشریف لائے۔ ہمارا آبائی مکان ابھی تک محلہ بالا پیر میں مرحوم آباواجداد کی یادگار ہے۔ میں اسی مکان میں وقت ایک بجے شب بتاریخ ۲ محرم ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۹ اگست ۱۸۹۴ء عالمِ شہود میں رونق افروز ہوا۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو شہر قنوج کو ایک قصبہ کی حیثیت میں دیکھا۔ اوقات بسری کے لئے خدا کا فضل و کرم دستگیر تھا۔ انقلاب زمانہ کے باوجود کچھ گاؤں کچھ باغات اور اور کچھ آراضیات مختلف جگہوں پر زراعت کے لئے باقی تھے۔ پھر بھی والد مرحوم نے زمینداری کے ساتھ ساتھ تجارت کو بھی اپنا مشغلہ بنایا۔ چونکہ قنوج عطر کے لئے ہمیشہ سے مشہور رہا ہے۔ قبلہ مرحوم نے محترم چچا کو عطر کی تجارت شروع کرا دی۔ اور ہم تاجر عطر کی حیثیت سے روز بروز ترقی کرتے رہے۔ لیکن قنوج کی بود و باش تعلیم میں ہمیشہ رخنہ انداز رہی۔ چنانچہ [illegible] اردو فارسی و انگریزی کی تعلیم کا بھی وہی حشر ہوا جو ہونا چاہئے تھا [illegible] لکھنؤ میں [illegible] ہو چکا تھا۔ گلستاں بوستاں اسی پر [illegible] کی طرح [illegible] ناآشنا ہونے یا ایسے اصول کی راہ پر چلنے کی [illegible] قدم قدم پر [illegible] سبق یاد کرنے میں پیش آتی تھیں۔

ان کا احساس ہے۔

اب وہ زمانہ ہے کہ میرے بڑے بھائی حاجی محمد مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس و زمیندار و آنریری مجسٹریٹ فتحپور جن کے خطوط کا ذخیرہ موسومہ معدن الشعر اپنی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اپنے ہم عصروں میں کافی اعزاز رکھتے تھے۔ مرحوم لاولد تھے اس لئے متبنیٰ ہونے کا قرعہ انتخاب میرے اوپر پڑا۔ انھوں نے مجھے متبنیٰ بنایا۔

بھائی صاحب مرحوم اور جناب محمد علی صاحب مرحوم خلف الرشید جناب اصغر علی صاحب مرحوم تاجر عطر لکھنؤ، ہم پیشہ، ہم وطن ہونے کے سبب سے باہم شعر اور علم شعر ہونے کے لحاظ سے یک جان دو قالب تھے۔ خدا کی شان کہ محمد علی صاحب بھی لاولد تھے۔ اور انھوں نے بھی اپنی عزیزہ بہن کی لڑکی کو جو ان کی بھانجی تھیں متبنیٰ کیا تھا۔ ان کے والد محترم جناب اصغر علی صاحب کا سایۂ عاطفت ایسے وقت میں ان کے سر سے اٹھ گیا کہ ان کا عنفوان شباب تھا۔ ادھر بھائی صاحب کی عیش پسندی ادھر محمد علی صاحب کا تفنن مذاق اور عیش پسندی دونوں کے امتزاج طبیعت نے بہت سے [illegible] کچھ عجیب گل کھلایا۔

جب اصغر علی صاحب مرحوم کے کاروبار کا سفینہ ڈگمگانے لگا جناب اصغر علی محمد علی کے [illegible] سے متعارف تھا اور ان کی کشتی حیات منجدھار میں تھی [illegible] لہٰذا وہ صاحب فراش ہو گئے۔ وہ ان کے والد ہی تھا کے [illegible] دی کہ ان کی بھانجی اور [illegible] کا جلد سے جلد عقد کر کے کاروبار کو سنبھالنے کی سبیل پیدا کی جائے۔ لہٰذا بہت کچھ [illegible] کے بعد محمد علی صاحب مرحوم نے میرے بھائی مصطفیٰ خاں مرحوم سے ذکر چھیڑا کہ آؤ بھائی ہم تم اپنے رشتہ کو اور مضبوط کر لیں۔ میرے بھتیجے [illegible] میری بھانجی بلو بھائی صاحب مرحوم نے جواب دیا [illegible] آپ کو علم ہے [illegible] کی عمر ابھی کم ہے [illegible] محمد علی صاحب [illegible] پرواہ نہ کرتے ہوئے والد مرحوم حاجی محمد مرتضیٰ خاں صاحب سے [illegible] کی پر زور کوشش کی [illegible] اور اس تحریک کا یہ انجام ہوا کہ میرا عقد بتاریخ ۲۴ صفر ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۱ اپریل ۱۹۰۴ء [illegible] حاضری میں خاموشی سے ہو گیا۔ اس تقریب [illegible] میں وقوع پذیر ہوئی مجھ کو تعلیم کے بجائے مستقل تجارت کی طرف منعطف کر دیا۔ [illegible]

علی صاحب مرحوم نے بعض مقتدر حضرات اہل پنجاب کا رسالہ لیکر کئی رکن لوگوں کو جمع کرکے
مجھے اپنا جانشین قرار دیا۔ مگر رسالہ کا نظم و نسق کا بوجھ میرے سر آگیا قبلہ محمد علی مرحوم
ہم پنجوری سے ۱۳۳۱ھ میں عالم آخرت کو سدھار گئے اب میں تھا اور یہی کارخانہ جو کبھی مجھ سے
مفروض تھا خدا کی مدد شامل حال ہوئی وہ قرض ادا ہوگیا مگر اس مخلفشار طبیعت اور رنج
انکا ایک ساتھ ساتھ شوق کی شاعرانہ فضا نے کاروباری علم کو غلط کرنے کے لئے طبیعت
کو سلسلۂ شعر و سخن کی طرف متوجہ کیا۔

چنانچہ ۱۳۳۱ھ میں استاد محترم جناب سید عبد الحکیم صاحب متخلص شاہجہانپوری
سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

الامر فوق الادب مجھے دونوں قبائل صوری سے کوئی خاص شغف رہا مگر اب بھی شغل ترک
ہے اور صرف شاعری باقی ہے میں نے یورپ، ایشیا، ہندوستان، کشمیر، لندن، پیرس
جرمنی، شام، دمشق، ایران، طہران، سب کچھ چھان مارا مگر سب سے زیادہ مسرت بخش یہ امر
ہے کہ ذوقِ روحانیت دنیا سے رنگ و بو پر ہمیشہ غالب رہا۔ اس کو اب قبلہ طریقت سید کی
وسا والی مولانا عین القضاۃ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فیضان روحانی سمجھئے کیونکہ ۱۳۳۱ھ
میں جبکہ میں ہمراہی حاجی محمد مصطفیٰ خان صاحب مرحوم مع والدہ صاحبہ و اہلیہ حج بیت اللہ کے
لئے براستہ بیت المقدس مع چھ سال سے بذریعہ ریل مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ حاضر ہوا
اور حضرت ممدوح کی خدمت اقدس میں برائے حصول شرف زیارت حاضر ہوا خوش نصیبی
سے واپسی میں ایک ہی جہاز میں ہندوستان تک سفر ہوا۔ اس وقت سے حضرت کے وصال
۱۹۲۳ء تک حاضری کا شرف حاصل رہا۔ یہ میرا پہلا سفر حج تھا۔

دوسرا سفر حج ۱۹۲۳ء تیسرا ۱۹۳۴ء چوتھا ۱۹۳۵ء پانچواں ۱۹۳۸ء چھٹا ۱۹۴۲ء
اور ساتواں ۱۹۴۶ء میں بذریعہ ہوائی جہاز ہوا۔ اس شرف خاص کا جو عنایت الٰہی سے ملا ہے
اور کچھ نہیں کس زبان سے شکر کیا جائے

۱۹۲۳ء میں سلسلہ سفر یورپ (جس میں انگلستان لندن) اٹلی، فرانس، سوئزرلینڈ، آسٹریا
وغیرہ مصر، مکہ، مدینہ طیبہ، بیت المقدس، دمشق، شام، بغداد شریف، عراق، کربلا معلیٰ
نجف اشرف، سامرہ، بصرہ وغیرہ گیا۔ اور ۱۹۳۶ء میں سلسلہ کاروبار [illegible]
[illegible] فرانس، جرمنی، سوئزرلینڈ، قسطنطنیہ، اٹلی وغیرہ کی سیاحت کی۔

سفر یورپ کے مقاصد زیادہ تر تجارتی مفاد سے وابستہ تھے۔ اور خدا کے برتر کی امداد
سے یہ تجارتی معلومات و سیاحی کارخانے کے حق میں اکسیر ثابت ہوئی ہیں جنہیں بااصول
کے مطابق اس کے نظم و نسق کو ڈھالا ۱۹۳۳ء میں مبلغ ۳ لاکھ روپیہ صرف کر کے اس کی نئی
عمارت حنا بلند تک تعمیر ہوئی گویا کہ جو کارخانہ ۱۹۳۱ء مطابق ۱۳۴۹ھ میں بنا دیوالیہ ہوا
تھا ۱۹۴۳ء مطابق ۱۳۴۹ھ میں از سر نو ایک سو سال بعد سن ہجری کے لحاظ سے تجدید پائی
اس کے سر سے ہزاروں روپیہ کا بار قرض ادا کر دیا گیا پھر سے خدا نے میری مساعدت کی
اور جو تجارتی کشتی ڈوبنے کو تھی اسے مجھ کو ناخدا بنا کر بچا لیا۔ اب یہی کارخانہ ایشیا بھر میں سب سے
بڑا کارخانہ عطر ہے دل کی ترویج اور مشام جان کو معطر بنانے میں جو امتیاز شرف
اسے حاصل ہے کسی کو نصیب نہیں۔ اس کی صد سالہ جبلی کے موقع پر حضور نظام اعلیٰ حضرت
میر عثمان علی خان صاحب خلد اللہ ملکہ فرمانروائے ممالک محروسہ سرکار عالی دکن نے بنفس
نفیس شرکت فرما کر اپنی دائمی سرپرستی کا مایہ ناز شرف بخشا فالحمد للہ علی ذالک۔

نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

خدا کو کھائے نہ الفت ستم خدا کی پناہ — شب فراق کا تنہا یہ ہم خدا کی پناہ
میں کیا کروں نہیں اب ضبط کی ذرا طاقت — وہ دل میں درد سہا ہے چارہ گر خدا کی پناہ
دھواں کا ابھرا اٹھتا ہے میری آہ کے ساتھ — یہ جلتا دل ہے کہ یہ سوز جگر خدا کی پناہ
ذرا تو سوچ کہ برباد کر کے دل میرا — مٹا رہا ہے خود اپنا بھی گھر خدا کی پناہ

ترا اصطفا سے یہ پوچھ کس طرح گزرے
شباب رفتہ کے شام و سحر خدا کی پناہ

تیری بزم سے ساقی کون ایسے بہوش آیا — آنکھ چار ہوتے ہی مست و بادہ نوش آیا
پی کے تیرے ساغر کو جب ذرا بھی ہوش آیا — ان کے پھر مقابل کیا کوئی خرقہ پوش آیا
جب کسی کی محفل میں ذکر ناؤ نوش آیا — یاد وہ سے مجھے اپنا میکدہ بدوش آیا
جب ہوئی ہیں زاہد سے میری اشکبار آنکھیں — اس کے پھر ... ساقی جوش آیا
دعوے محبت تھا جن کو بوالہوس نکلے — کوچہ محبت میں کون سر فروش آیا
سرد و گرم اے غافل اس قدر سہے تونے — پھر بھی ... تجھے نہ ہوش آیا

جو ملا ہوا بہتر جو ملا وہ اچھا تھا
اصطفا مگر اپنا سر پہ بار دوش آیا

دے ایسا درد کہ جو مجھ میں پیدا احساس دل کر دے
وہ درد ہے کوئی درد بھلا جو درد مجھے غافل کر دے
کیسی ہی پڑے تجھ پہ مشکل تو دل میں یقین کامل رکھ
اک پل میں اگر وہ چاہے تو آسان تری مشکل کر دے
دریا ہے حیات کشتی عمر دونوں کا وہی تو مالک ہے
کچھ بھی دشوار نہیں اس کو منجدھار ہی کو ساحل کر دے
مائل نہ کبھی دل حسن پہ ہو یا دیر و کلیسا کی جانب
تو فضل و کرم سے اے مولا آگاہ حقیقت دل کر دے
گو راہ حقیقت مشکل ہے ایسی بھی نہیں مشکل لیکن
اک رہبر کامل گر چاہے ناقص کو بھی وہ کامل کر دے
اے اصغر شاید فرقت سے ہی گھبرا کر مشکل بلا ہوا
وہ چاہے تو اپنی اگر چاہے پھر تجھ کو منزل کامل کر دے

علی اصغر وارثی

علی اصغر نام تخلص اصغر عرف الست شاہجہاں پوری موضع شاہ پور ضلع فتح پور رہنے والا ہوں نسبتاً سید بخاری مشرباً چشتیہ خاندان میں حاجی سید وارث علی شاہ رح دیوہ شریف ضلع بارہ بنکی (یو۔پی) کا مرید ہوں اور وہ پچیس سے ایک طویل عرصے تک منسلک رہا ہوں یہی وجہ ہے کہ مزاح نگار بن گیا ہوں۔

منتخب اشعار

شب مہتاب میں ہے وصل کا سامان اصغر — وہ جو آجائے تو سونے میں سہاگا ہوتا
آج کھلی ہوئی ہے باغ میں — شیخ صاحب کی کھوپڑی نہ ہوتی
ہم نے دل بھی دیا جگر بھی دیا — غیر سے صدقہ و خیرات نہ ہوتی
ہم کیا اب ہم پہ اسکی نظر کیا اثر نہیں سکتا — پیار کی حد ہو نہیں سکتی یہ جو کچھ ہو نہیں سکتا

اطہر — سید معشوق حسین ہاپوڑی

نام سید معشوق حسین تخلص اطہرؔ۔ والد ماجد کا نام سید امراؤ علی صاحب ابن سید شنا اللہ تھا بدخشی سادات سے تھے۔ دیندار، زاہد، پرہیزگار، متقی، پابندِ شریعت باخدا بزرگ تھے۔

وطن۔ قصبہ ہاپوڑ (ضلع میرٹھ)

میں ۱۰ شعبان المعظم ۱۳۲۶ھ مطابق ۸۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء بروز جمعہ بعد عصر ہاپوڑ میں پیدا ہوا۔ "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" سے میری ولادت کی تاریخ نکلتی ہے۔ میری عمر پانچ سال کی تھی کہ والد ماجد نے عالم قدس کی طرف رحلت فرمائی۔ اس کے بعد میں اپنے برادرِ کلاں منشی سید اشفاق حسین ڈپٹی مجسٹریٹ۔ ڈپٹی کلکٹر کے سایۂ داماں عاطفت میں تعلیم و تربیت سے بہرہ یاب ہوا۔

مذاقِ سخن بدستور ہی سے طبیعت میں ہے۔ چودہ پندرہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگا تھا۔ مولوی قمر الدین قمرؔ سوردن ضلع ایٹہ کے باشندے میری فارسی تعلیم کے لئے ملازم تھے۔ مولوی صاحب شاعر بھی تھے اور نعت میں غزل کہتے تھے۔ مولوی صاحب نے اس زمانہ میں ایک غزل نعت میں کہی جس کا مقطع تھا ؎

کشش میں کاش کچھ تیری دلا اثر ہوتا
تو مجھ پہ مہرباں ہر دم مرا رشکِ قمر ہوتا

مولوی صاحب کی عادت تھی کہ جو نئی غزل فرماتے اس کو گھنٹوں گنگنایا کرتے تھے۔ سنتے سنتے وہ تمام غزل یاد ہو گئی۔ ایک دن خود بخود طبیعت میں لہر پیدا ہوئی اور یہ مطلع موزوں ہو گیا۔

اگر عشقِ محمدؐ دل میں میرے جلوہ گر ہوتا
تو ہرگز خائفِ عصیاں سے نہ یہ بیتاب اطہر ہوتا

اس کے بعد چار شعر اور کہہ کر غزل کو بلا مقطع تمام کیا۔ اور مولوی صاحب کو غزل

اصلاح کے لئے دکھائی۔ مولوی صاحب نے اصلاح نہیں دی۔ اور شعر کہنے سے منع فرمایا اس طرح پہلی غزل نعت میں موزوں ہوئی۔ تحقیق شعری کا شوق حضرت جلال لکھنوی اور مولوی ظہیر احسن شوق نیموی کے باہمی مباحثے کی کتابیں دیکھکر پیدا ہوا۔

زمانۂ قیام لاہور میں عشرت اصفہانی کا تلمذ اختیار کیا عشرت اصفہانی بڑے فاضل اور مسلّم شاعر تھے تین سال تک استفادہ فرمایا۔ اردو میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔

۱۸۹۳ء و ۱۸۹۴ء میں جون پور میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں مولوی محمد محسن صاحب کاکوروی مرحوم سے اکثر ملاقات ہوئی۔ وہیں منشی طاہر علی طاہر فرخ آبادی اور منشی حیات بخش صاحب رسا تلمیذ حضرت داغ مرحوم سے خاص دوستانہ مراسم رہے۔

۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۹ء تک علی گڑھ میں قیام رہا۔ جہاں میرے برادر کلاں سید اشفاق حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اس زمانہ میں حالی مرحوم حیات جاوید کی تکمیل کے لئے علی گڑھ میں رونق افروز تھے۔ اور علامہ شبلی بھی علی گڑھ میں پروفیسر تھے۔ اس وجہ سے مولینا حالی و مولینا شبلی مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ نومبر ۱۸۹۹ء میں رامپور جانے کا اتفاق ہوا وہاں ملک الشعراء حضرت امیر مینائی کی خدمت میں شرف نیاز حاصل کیا۔ منشی صاحب مرحوم کا کلام خود ان کی زبان مبارک سے سنا اور اپنا کلام بھی ان کی خدمت میں پیش کیا۔

اطہر وہ غزل ہے مری پائی ہے جس کی داد
ہر شعر پر دی ہے جناب امیر نے

دسمبر ۱۹۰۲ء میں دربار دہلی کے موقع پر فصیح الملک حضرت داغ مرحوم، آغا شاعر دہلوی کے ساتھ ایک مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

میں ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۷ء تک رامپور میں وکالت کرتا رہا۔ اس زمانے میں جناب جلال لکھنوی مرحوم سے بعض الفاظ اور بعض مسائل شعری پر گراں قدر گفتگو ہوئی اور مقامی اخبارات میں مضامین بھی نکلے منشی امیر اللہ تسلیم سے اکثر صحبت رہی اور ان سے خصوصیات کے ساتھ مراسم بڑھ گئے۔

۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۰ء تک الہ آباد میں وکیل رہا اور افتخار الملک حضرت مضطر خیرآبادی مرحوم کے مشاعروں میں شرکت رہی اور ان سے دوستانہ اخلاص رہا۔

۱۹۱۰ء میں جے پور چلا گیا ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۳ء تک جے پور میں منصف رہا۔ فرقہ وارانہ وجوہ کی بنا پر مستعفی ہو کر ٹونک چلا آیا۔

۱۹۲۳ء میں میں نے اردو کی حمایت میں ہندی پرچارنی سبھا کے مقابلے میں اُردو ڈیفینس کمیٹی قائم کی۔ اس کے سکریٹری کی حیثیت سے اُردو کی خدمات انجام دیں۔

میری چند تصانیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

اُردو کے تین دیوان۔ ۲ مجموعہ قصائد اردو۔ ۳ مجموعہ قصائد و غزلیات فارسی۔ ۴ رسالہ تحقیقات الفاظ۔ ۵ قطعات تاریخ۔ مراثی و سلام۔ ۶۔ رسالہ اصلاح عروض زیر تصنیف۔ ۷۔ مکتوبات شعری۔ ۸ رسالہ جدید عروض و قوافی۔ ۹۔ اظہار اللغات:۔۔ اس لغت کے دو حصے ہیں ایک حصے میں وہ فارسی الفاظ ہیں جن کو ہندوستانی فارسی نہیں سمجھتے اور شبہ کرتے ہیں دوسرے حصے میں وہ الفاظ ہیں جن کو ہندوستانی فارسی سمجھتے ہیں اور حقیقت میں وہ فارسی نہیں ہیں۔ ہر لفظ کی سند فرہنگ ناصری سے دی گئی ہے اور دوسرا حصہ میں محاکمہ ہے جو برہان قاطع اور مرزا غالب کی قاطع برہان سے متعلق ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مرزا غالب کی رائے برہان قاطع کی نسبت اکثر غلط ہے۔ اور اس کی تائید فرہنگ ناصری سے نہیں ہوتی۔ فرہنگ ناصری کا مؤلف ایرانی ہے اس کی رائے برہان قاطع اور قاطع برہان دونوں سے زیادہ مستند ہو سکتی ہے۔

نمونۂ کلام

عالم افروز ہے جلوہ تری رعنائی کا ۔۔۔ خلوتِ ناز ہے نام انجمن آرائی کا
تو نے فرہاد کو دی کوہ کنی کی خدمت ۔۔۔ قیس سے کام لیا بادیہ پیمائی کا
دلفریبی میں کرشمے ہیں ترے غارتِ صبر ۔۔۔ مفت بدنام ہوا نام تماشائی کا
تیرے گیسو کا ہے شانہ دلِ صد چاک کلیم ۔۔۔ طور اک آئینہ ہے تیری خود آرائی کا

اک خدا سے ہے حبیب تو ہیں دنیا میں لاکھ اختلاف ۔۔۔ کیا غضب ہوگا اگر ہر بت خدا ہو جائیگا
میرے غم خانے میں اگر آپ اک دن دیکھ لیں ۔۔۔ غم خوشی بن جائیگا شکوہ دعا ہو جائیگا
یوں کہیں گے یوں کہیں گے حشر میں کہتے تو ہیں ۔۔۔ کیا کہیں گے جس دم اس کا سامنا ہو جائیگا
کون دیگا داد ہم کو اب نیاز عشق کی ۔۔۔ بے نیازی سے اگر ہر بت خدا ہو جائیگا

آپ اظہر رہ کے کچھ دن بتکدے میں دیکھ لیں
دل میں پیدا خود بخود ذوقِ خدا ہو جائیگا

تیرا جلوہ کہاں نہیں دیکھا — تجھکو آنکھوں سے ہاں نہیں دیکھا

جذبِ حسن و عشق کا آج امتحاں ہو جائیگا — تیر ان کا زخم کے منہ میں زباں ہو جائیگا

میرے گھر غیر کو تم لیکے نہ مہماں ہوتا — نہ پریشاں مجھے کرتا نہ پریشاں ہوتا
داد ہم چاہتے ہیں جوشِ جنوں کی اس سے — جس نے دیکھا نہیں دامن کا گریباں ہونا
شکر ہے کعبے سے بتخانے نہیں پہنچے اطہر — آخری وقت ہیں لکھا تھا مسلماں ہونا

جو لطفِ عشق دل سے تھا وہ شامل ہو نہیں سکتا — جگر کتنا ہی کچھ تڑپے مگر دل ہو نہیں سکتا

نسبت ہے بتکدے کو بھی اس جلوہ گاہ کا — شاید حرم سے پھیر ہو تھوڑا سا راہ کا
رحمت ہے جس کا نام کرم جس کا عرش عام — وہ اک کنارہ ہے مرے بحرِ گناہ کا
حسن نظارہ سوز و نگاہِ نظارہ جو — اطہر معاملہ ہے باہم برق و کاہ کا

جگر میں درد ہوا دل میں اضطراب ہوا — کسی کے عشق میں اک گھر کا گھر خراب ہوا
گیا تھا اسکے خطِ شوق آج تک نہ پھرا — پیام بر نہ ہوا یہ مرا شباب ہوا

شبِ فراق یہ عالم ہے میرے نالوں کا
کلیجہ ہاتھوں اچھلتا ہے سننے والوں کا

خدا ہی جانتا ہے حال اپنی کارسازی کا
بتوں کے ناز میں جلوہ ہے شانِ بے نیازی کا
وہ کافر کیا خدا سے بھی نہیں اب التجا کوئی
دیا ہے لطف ترکِ آرزو نے بے نیازی کا

نشاں کہاں اب دل حزیں کا رکھا نہ اس عشق نے کہیں کا
دھواں ہوں اک آہِ آتشیں کا نہ آسماں کا نہ میں زمیں کا
مجھے فلک نے خراب رکھا مرے نشار محمدؐ نے پیا
وہ دور پہلے تھا آسماں کا یہ دور آیا ہے اب زمیں کا
یہ رعب تھا ان کا مجھ پہ اطہرؔ کہ کہہ سکا کچھ نہ حال ابتر
سنایا ان کو فسانہ شب بھر کہیں کہیں کا کہیں کہیں کا

کہاں کی داد خواہی اور اب کیسا گلا کرنا
قیامت ہے کسی کا حشر میں عذر جفا کرنا

اطہر نفیس

پیدائش سنہ ۱۹۳۸ء بمقام علی گڑھ

تیرے فراق نے بندہ بنا دیا ہے اطہر
ترے فراق سے پہلے مگر یہ خواب نہ تھے
آج پھر سے گلوں کے تارے ملے
شاید ان سے کبھی اپنا درد ملے

اسحٰق اطہر

سال پیدائش سنہ ۱۹۳۰ء دھورہ بریلی

کچھ ایسے خاص مناظر ہم کبھی گزرے تھا
کبھی خیال کبھی آیا تو آنکھ بھر آئی
گھنیری زلفوں کا سایہ بھی رہے تھا
شریفؔ ہی دنیا یہاں کبھی دور آئی

سید انور علی شاہ گیلانی

اظہر

سید انور علی شاہ اظہر ابن سید علی اصغر شاہ بن سید محمد شاہ گیلانی زمیندار اصغر آباد تحصیل گھوٹکی ڈسٹرکٹ سکھر (سندھ)

پیدائش اوّل ذیقعد ۱۳۳۲ھ بوقت نماز ظہر۔ ابتدائی تعلیم گھوٹکی، پنو عاقل، روہڑی میں شروع ہوئی اور انگریزی مڈل پاس کرنے کے بعد علوم مشرقی کی طرف توجہ کی گئی اس کی ایک حد تک تکمیل کرنے کے بعد شعر و سخن کی ابتدا کی جو ابتداءً صوفیانہ رنگ تک محدود تھی کچھ عرصہ کے بعد سندھ کے ایک مشہور صوفی شاعر محمد دل فقیر کی صحبت سے فیض حاصل کیا اور اصول قواعد شاعری سے بہرہ مندی حاصل کرنے کی سعی جاری رکھی آخر ایک استاد کامل تارک الدنیا حضرت فقیر ہدایت اللہ صاحب المتخلص بہ تجلی تھم تارک (مرحوم و مغفور) کے روبرو زانوئے تلمذ طے کیا، ممدوح کی تصانیف میں سندھی، اردو اور فارسی نظم و نثر کی متعدد کتابیں موجود ہیں حضرت تارک کے فیض صحبت سے تقریباً دو سال کسب فن کیا اور سند فارغ الاصلاح حاصل کی میرے سندھی کلام کا حصہ تقریباً تیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے پاکستان بننے کے بعد اردو شاعری کا شوق ہوا اور اردو کی نزاکتوں کے پیش نظر ایک اہل زبان استاد کی تلاش ناگزیر ہوئی اور خوش قسمتی سے حضرت علامہ شمس زبیری سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

میری ایک ذاتی لائبریری ہے جس میں سندھی۔ اردو۔ فارسی کی کم و بیش بارہ سو کتابیں موجود ہیں۔ ان میں سے (قطع نظر اخبارات و رسائل) اس وقت تک میں ایک لاکھ چھبیس ہزار دو سو پچیس صفحات کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ باایں ہمہ زندگی کا زیادہ حصہ سیر و سیاحت میں گذرا ہے جس میں نہ صرف پورے ہندوستان کی بلکہ ایران کی سیاحت بھی شامل ہے۔

پاکستان بننے کے بعد میں ریڈیو پاکستان کراچی میں سندھی سیکشن کا اسسٹنٹ انچارج ہوا اور تقریباً ایک سال اپنے فرائض منصبی خوش اسلوبی سے انجام دیئے اسی دوران میں "H.M.V" کمپنی کراچی نے مجھے سندھ اور بلوچستان کے لیے ریکارڈنگ ریہرسلر منتخب کیا

قبل اس سے ۱۹۵۳ء میں ینگ انڈیا ریکارڈنگ کمپنی سندھ کی طرف سے ریکارڈنگ ریپرزینٹیٹو ہوکر تین سال کے لئے بمبئی بھیجا گیا۔

میری سندھی غزلیات و نغمات کا کافی حصہ سندھ کے مشہور مغنیوں کی آواز میں ریکارڈ ہوچکا ہے۔ نیز میری تصنیفات ہیں سے مندرجہ ذیل کتابیں "آوازِ عشق" "سخنِ بے نظیر" اور "خونِ طبع" ہوکر مقبول خاص و عام ہوچکی ہیں۔ "روحِ سخن" "کلامِ تارک" "کلیاتِ اظہر" اور "رہنمایانِ عالم" زیرِ طبع ہیں۔ فی الوقت مقام گھوٹکی (سکھر) سے ایک ہفت روزہ اخبار "ذوالفقار" اور ایک ماہنامہ "عالمگیر" میری سرپرستی میں جاری ہیں اور مقبولیت حاصل کرچکے ہیں۔

نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

منهنجي متاع دل کي الفت جي قافلي مان ڌاڙو وفا بروينديءَ ڪنهن بيوفا ڪيو آ

میرے سرمایۂ دل کو محبت کے قافلے میں جادۂ وفا میں چلتے چلتے کسی بے وفا نے لوٹ لیا ہے

سر جو سودا ڪر جي تو ڪان سرگهري تو بخت پاڻ ۽

سر کا خریدار اگر تیرے سر کا طالب ہے تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھ

سر ڏيڻ ۾ ڪر نه سستي سرڏي سردار ٿي

اور سر دینے میں تساہل نہ کرتے ہوئے سر دیکر سردار بن جا

آهي گل اندام خود جنهن جو پسينو عطر آ

وہ تو سراپا گل اندام ہے اور اس کا پسینہ عطر آگیں ہے

ناهي هي انصاف تنهن تي مشڪ ۽ عنبر موڪليان

یہ شرط انصاف نہیں کہ مشک و عنبر اس کو تحفے میں بھیجوں

لخت دل جيڪي اکين مان نڪري گوڙها ٿا ڪيان

وہ دل کے ٹکڑے جو آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے رواں ہیں

ڇو نه تن جو هار جوڙي اندڙي اظهر موڪليان

کیوں نہ انہیں چن کر ان کا ہار گوندھ کر اظہر ان کو تحفہ میں بھیجدوں

اردو کی دو غزلیں ملاحظہ فرمائیے:

دل تعالیٰ اللہ ان کی یاد سے معمور ہے آج ہر گوشہ چراغ جلوہ گاہ طور ہے

آج ہر اک گوشۂ دل کیف سے معمور ہے پھر مری تاب و تواں کا امتحاں منظور ہے

جبر میں بھی سارا عالم اس کے ہے زیرِ نگیں — اللہ اللہ آدمی بھی کس قدر مجبور ہے
دیکھیے کیا حشر ہوتا ہے مذاقِ دید کا — طالبِ دیدار ہے اور جلوہ گاہِ طور ہے
اک جھلک دکھلا کے تم کو یوں نہ چھپنا چاہیے — دیکھنا تابِ نظر تک دید کا دستور ہے

جرم ہے مانا تقاضائے نظر پر کیا کرے
دل کے ہاتھوں آپ کا اظہر بہت مجبور ہے

تصوّر آگیا جس وقت اس کے روئے روشن کا
خیال آیا تڑپ کر میرے دل میں برقِ ایمن کا

ذرا وہ بھی تو دیکھیں اضطرابِ دل کی کیفیت
اگر جذبِ نظر کوتہ اٹھا دے ان کی چلمن کا

مجھے تو خون کا دعویٰ نہیں لیکن یہ ڈرتا ہوں
بھرے مقتل میں چرچا ہے ترے آلودہ دامن کا

مرا دل قید کر لیا، مجھکو بھی آزاد کر صیاد
خیال آتا ہے رہ رہ کر مجھے اپنے نشیمن کا

کبھی بے ہوش کرتے ہیں کبھی ہشیار کرتے ہیں
یہ اک ادنےٰ سا ہے اعجاز ان کی چشمِ پرفن کا

اسیری نے کیا ہے اس قدر مایوسِ آزادی
تصوّر بھی نہیں آتا ہے مجھکو اب تو گلشن کا

نہیں ہے ایسے معمورہ میں اہلِ دل کی گنجائش
جہاں ہے تفرقہ دیر و حرم، شیخ و برہمن کا

ہوا بے مہری اہلِ جہاں سے اس قدر بے حس
نہیں میری نظر میں امتیاز اب دوست و دشمن کا

بساطِ شعر میں مجھکو نہیں تھا دسترس لیکن
کرم ہے مجھ پہ اظہر شمس جیسے ماہرِ فن کا

اعجاز احمد اعظمی

پورا نام اعجاز احمد اعظمی ہے۔ چونکہ وطن یو۔پی۔ (اعظم گڑھ) ہے اسلئے اعظمی لکھتا ہوں تعلیم اعظم گڑھ میں پائی آجکل مشرقی پاکستان میں ایک جوٹ کی فرم میں ملازم ہوں ادب کو زندگی سمجھتا ہوں اور زندگی کو سب سے بڑا فن کبھی کبھی غم روزگار کو رومان کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتا ہوں۔ بولتا ہوں کم لیکن سوچتا ہوں زیادہ شاعری اپنا محبوب شغل ہے۔

کبھی جور و ستم سے دل کو شاداں دیکھتا ہوں میں
کبھی لطف و کرم سے بھی گریزاں دیکھتا ہوں میں

بہائے جا رہا ہوں کشتیٔ امید اک جانب
نہ ساحل دیکھتا ہوں میں نہ طوفاں دیکھتا ہوں میں

کسی نے سینۂ گرداب پر ساحل بنا پایا
اور اب ساحل پہ ہو کر خوف طوفاں دیکھتا ہوں میں

تبسم زیر لب شانوں پہ بل کھائی ہوئی زلفیں
نگاہ شوق سے کیا برق و باراں دیکھتا ہوں میں

چراغاں کر رہے ہیں اہل زر انساں کی چربی سے
مئے گلرنگ میں خون غریباں دیکھتا ہوں میں

سنبھل کر لے چلو اعجاز الفت کے سفینے کو!
زمیں سے آسماں تک ایک طوفاں دیکھتا ہوں میں

رہبر بنے ہیں رہزن اور ناخدا کمینے — بھٹکیں نہ کارواں کیوں ڈوبیں نہ کیوں سفینے
سہمے ہوئے زری سے قائم زرداری کی فضیلت — بخشا ہے نور انجم جس طرح تیرگی نے
کچھ ختم کر چکے ہیں کچھ موڑ آ رہے ہیں — کیسا حسین رستہ پکڑا ہے زندگی نے

افق

سید حبیب احمد کاظمی امروہوی

میری سن پیدائش ۱۳۱۱ھ ہے۔ دو شعر ملاحظہ فرمایئے

منزلوں دور ہوئی منزلِ جاناں مجھ سے اور کیا چاہتی ہے گردشِ دوراں مجھ سے

آپ بیتی ہی ہر آوارۂ صحرا سے سنی

کوئی کہتا نہیں رودادِ گلستاں مجھ سے

اقبال

اقبال صفی پوری

سنہ پیدائش ۱۹۱۶ء وطن صفی پور ضلع اناؤ

مفہوم شراب وشعر لئے وہ آنکھ اٹھائی جاتی ہے

کچھ ہوش بھی ہے بیداری کا کچھ نیند بھی آئی جاتی ہے

جو آنکھ سے دامن تک آیا لرزاں ہیں اسی سے کون و مکاں

اس اشک کی قیمت کیا ہوگی جس اشک کو میں پی جاتا ہوں

ڈاکٹر جی۔ ایم۔ اکمل

۱۵ر جنوری ۱۹۳۱ء کی کسی ساعت میں سرگودھا کے ایک نواحی دیہات میں پیدا ہوا والد بزرگوار کا نام علی محمد اور وطن مالوف بھکر ضلع میانوالی ہے والدین نے بڑے ناز و نعم سے مجھے پالا پوسا اور پانچ چھ برس کی عمر میں ابتدائی تعلیم کی غرض سے اسکول میں داخل کرا دیا۔ لیکن اسکولی تعلیم راس نہ آئی اور خود اپنے ذوق کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔ کثرت مطالعہ نے مجھے بہت فائدہ پہونچایا اور نتیجہ میں میری تحریر پختہ ہوتی گئی۔ ادبی جرائد کا مطالعہ میرے دبے ہوئے جذبات کو ابھارنے میں معاون ہوا۔ چونکہ اساتذۂ سخن کے دواوین کو اچھی طرح پڑھ چکا تھا۔ اس لئے فطری رجحان پر شعر و شاعری کا بہت اثر ہوا۔ اور اشعار موزوں ہونے لگے۔ ایک سال کے قلیل عرصہ میں پنجاب یونیورسٹی کے تین امتحانات "منشی فاضل" "ادیب فاضل" اور میٹرک پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے امتیازی نمبروں سے پاس کئے اس کے بعد مولوی فاضل ایف۔ اے۔ اور ہومیو پیتھک کی ڈگریاں بہترین نمبروں سے حاصل کیں میرے مضامین اور منظومات مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ غیر مطبوعہ کلام تین مجموعوں کی صورت میں زیر ترتیب ہے جو ہنوز زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئے۔

"شاخ نبات" "گل نسرین" اور "خوشۂ پروین" میرے دو ناول "منچلا نوجوان" اور "حریم ناز" بالترتیب اسی اور ایک سو چھتیس صفحات کی ضخامت پر شائع ہو چکے ہیں میں نے تین ڈرامے "ہار جیت" "شرط" اور "بکھرے گیسو" لکھے ہیں۔ جن میں سے "شرط" اور "بکھرے گیسو" اسٹیج ہو چکے ہیں۔

۲۴ر جنوری ۱۹۴۹ء کو میرے اہتمام سے بھاگٹانوالہ ضلع سرگودھا میں ایک مشاعرہ ہوا جس کی صدارت جناب سید اصغر علی صاحب احسن ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز راولپنڈی ڈویژن نے فرمائی تھی۔ اس مشاعرے میں مقامی اور غیر مقامی سبھی شعراء

شریک تھے۔ یہ بزم سخن اسقدر معیاری اور شاندار تھی کہ بھاگٹا نوالہ کی ادبی محفلیں ہمیشہ اس کے تذکروں سے آباد رہیں گی۔

مولانا غلام رسول مہر مدیر انقلاب نے میرے کلام پر یوں رائے دی ہے۔

"عزیز بزم اکمل صاحب نے جب مجھے اپنی ایک نظم بغرض اصلاح دکھائی تو میں فرط حیرت سے استعجاب میں رہ گیا کیونکہ بجائے خود یہ نظم قادر الکلامی اور پختہ ذہنی کی بین دلیل ہے توقع ہے کہ موجودہ دور کے بہترین ادبا اور شعراء میں موصوف جگہ حاصل کر لیں گے آج کل بائی اسکول بھاگٹا نوالہ ضلع سرگودھا میں عربی کا ہیڈ ٹیچر ہوں اور بزم ادب اردو کا سکریٹری ہوں میں نے اصناف سخن میں سے کوئی موضوع تشنہ نہیں چھوڑا۔ نظمیں، غزلیں، رباعیات قطعات وغیرہ سبھی کچھ کہے ہیں۔ میرے شاگردوں کی تعداد بھی بحمد اللہ کافی ہے۔

متفرق اشعار

عجب افتاد یہ دل پر پڑی ہے
نظر اک بے مروت سے لڑی ہے

نہ حرف آئے محبت پر مبادا
دل ناداں سنبھل منزل کڑی ہے

رنگینیاں شباب کی پیری میں آئیں یاد!
فصل خزاں میں شوق ہے موسم بہار کا

خوش آمدید زحمت آمد ہوئی ہے کیوں
اتنے دنوں کے بعد ارادہ شکار کا

شگوفے پھوٹنے پائے نہ تھے دور خزاں آیا
تماشا ہے کہ تنبل انہ وقت وقت امتحاں آیا

بستر کے قریب آکے جو نہی پوچھی طبیعت
منہ پھیر لیا اور کہا تم کو غرض کیا

تصور ہی تصور میں ملاقاتیں ہوئیں ان سے
شب فرقت بھرے تھے پھول کانٹے میرے دامن میں

دونوں جہاں کے عیش ہیں میرے نصیب میں
مجھ کو نہ چھیڑ محو ہوں ذکر حبیب میں

ہوا بدلی ہے اکمل آج کل کچھ ایسی زنداں کی
ہر اک فیصدی جنوں میں کر رہا ہے چاک دامن کو

چند روزہ زندگی سے تونے حاصل کیا کیا
بستر غفلت سے اٹھ اکمل مآل کا سوچ

جس وقت کہ سر پہ پڑتی ہے اس وقت خدا یاد آتا ہے
دستور یہی ہے دنیا کا آرام میں کیا یاد آتا ہے

یاد ہے تیری محبت کا وداعی پیغام
چند قطرے جو پسینے کے جبیں سے چھلکے

الطاف مشہدی



۱ فروری ۱۹۱۴ء کو چک نمبر ۱۱ جنوبی سرگودھا میں پیدا ہوا بچپن ہی میں والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا یتیمی کی گود اور والدہ محترمہ کے سایہ میں پل کر جوان ہوا چک نمبر ۱۱ جنوبی ضلع سرگودھا لالیاں ضلع جھنگ، جاکی ضلع سیالکوٹ اور دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ ادب برائے زندگی کو ادب برائے ادب کے لباس میں پیش کرنا میرا آرٹ ہے۔ نظموں غزلوں اور گیتوں کے چھ مجموعے "ڈگر ڈاغ بیل" "الطاف کے نغمے" "الطاف کے گیت" "پُر بیت کے گیت" اور "تصویر احساس" کے ناموں سے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مجموعہ "زیبا" کے نام سے کہانیوں کا بھی چھپ چکا ہے۔ بہت سے رسائل و اخبارات میری ادارت میں مختلف مقامات سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ اور حال ہی میں ماہنامہ "ہم لوگ" کو ناقدردانی احباب کی نذر کر چکا ہوں۔ آجکل سرگودھا میں بیمار ہوں۔ اور موت کا منتظر اگر عزیزان احمد حسین رشک، مظہر گیلانی، صابر گیلانی اور نوازش گیلانی کی محبت کا پھاہا احباب کے عطا کردہ زخموں پر موجود نہ ہوتا تو شاید میں وقت سے قبل ہی اپنی محبوب موت سے جا ملتا۔ مجھے اپنا کلام تو قطعاً پسند نہیں ہے۔ ہاں دنیا کا اور احباب سے جن اشعار کی تعریف کبھی کبھی سننے میں آئی ان میں سے جو شعر یاد آتا جائے گا۔ نیچے لکھتا جاؤں گا۔

اپنا لیا ہے مجھ کو خزاں کے خلوص نے — تم سے بچھڑ رہا ہوں بہارو سلام لو
اس خراب آباد میں کچھ روز جینے کے لئے — دوستو ہر قدردار ہے مجبور پینے کے لئے
تمہارے گیسوؤں سے کھیلتے ہیں ہاتھ مگر — اٹھاؤ جام کہ یا دل کا انتظار نہیں
کھو یا گیا تھا اگلی نگاہوں کے آس پاس — خوابوں کی وادیوں سے چلا آ رہا ہوں میں
سوئے پڑے ہیں خاک میں اجڑے ہوئے شباب
آباد تربتوں کی قطارو سلام لو
کون بازار میں اس جنس کا گاہک ہوگا — آپ ہی اپنی وفاؤں سے لپٹ کر رو لوں
زندگی درد سے ہوئی محروم! — میکدہ ہے مگر شراب نہیں
جن کی دنیا میں مہ و مہر نہیں ہوتے طلوع — ایسے بیمار خداؤں سے لپٹ کر رو لوں
لے کے آغوش میں اک یاد کی کچھ تصویریں
کہیں پالا ہے مرے دل نے صنم خانے کا
جو اب تک ہیں زیبِ قبائے محبت — کچھ ایسے بھی موتی کبھی رو سکے ہم
کس کا حاصل مجھے سہارا ہے — تلخیٔ زیست بھی گوارا ہے
آہ انسان جس کی آنکھوں پر — اپنا انجام بے نقاب نہیں
محبت میں مجھ پہ یہ کیا وقت ہے — کہ روتے ہوئے مسکرانا پڑا
سلامت ترے دیرِ قناعت سلامت — خدائی پہ خنداں ہے میری گدائی
یہ کیا بات ہے اجنبی انکھڑیوں سے — کوئی جانی پہچانی صدا آ رہی ہے
کس نے الطاف دی دعا مجھکو — زندگی درد سے قریب سا ہے

امجد

امجد علی جج لکھنوی

میرا نام امجد علی جج ہے۔ "جج" کے لفظ کی تشریح کے سلسلہ میں مجھے مختصراً اپنا خاندانی حال بھی لکھنا پڑے گا۔

میرے دادا کرنل اسپنسر الفریڈ ٹیلر جج لندن کے ایک معزز اور مشہور خاندان سے تھے جو بسلسلہ ملازمت ہندوستان تشریف لائے اور ۱۸۹۵ء میں بخوشی اور برغبت مشرف بہ اسلام ہوئے اسلامی نام محمد عبداللہ جج رکھا گیا۔ ۱۸۹۶ء میں انھوں نے بنارس کے ایک معزز مسلمان خاندان میں شادی کرلی اور وہیں سکونت پذیر ہوئے۔ کچھ زمانے کے بعد ۱۸۹۷ء میں والد مرحوم نے بنارس کی بود و باش ترک کر کے لکھنؤ کو اپنا وطن بنا لیا۔

میری تاریخ ولادت ۱۹۰۳ء ہے اردو فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم ایک مدرسہ میں ہوئی اور ۱۹۲۲ء میں ایف۔ اے۔ سی کا امتحان پاس کیا۔

مجھے بچپن ہی سے شعر و سخن کا ذوق تھا۔ ماحول اور مطالعہ کی بدولت بہت کم سنی میں مختصر افسانے اور شعر لکھنا شروع کئے شاعری کے ذوق نے مجھے شعرائے کرام کی صحبت کی طرف مائل کیا چنانچہ ابتدائی چند غزلیات سید مومن حسین صاحب فریاد دبیسل رائے بریلی کو دکھائیں۔

تعلیم کے لئے کالج میں داخل ہوا۔ لیکن چند ماہ گزرے ہوں گے کہ تحریک خلافت و ترک موالات کے سلسلہ میں تعلیم کو خیرباد کہکر اودھ اخبار لکھنؤ میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر ملازمت اختیار کرلی۔

باوجودیکہ میرا تلمذ کسی سے نہ تھا میں اکثر حضرت بہار لکھنوی مرحوم سے اپنی غزلیات پر اصلاح لیا کرتا تھا۔ چند سیاسی تقاضوں کے ماتحت ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ چھوڑ کر بمبئی چلا گیا۔ اور وہاں محکمہ ریلوے میں ملازمت کرلی۔ شدہ شدہ ۱۹۳۷ء میں فیض آباد آیا اور اسی دوران میں میری خوش طالعی سے مجھے حضرت علامہ محمد شفیع انصاری صاحب

مرحوم، سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ اور میں نے باقاعدہ ان سے تلمذ حاصل کیا
تقسیم ہندوستان و پاکستان کے سلسلے میں ہجرت کر کے پاکستان آ گیا۔ اور ۱۹۴۸ء سے اس وقت تک خانیوال ضلع ملتان میں بطور۔ ایس۔ ٹی۔ ای خدمت انجام دے رہا ہوں۔ میں حضرت مومن مرحوم کے رنگِ شاعری کا زیادہ گرویدہ ہوں۔ اپنی چند غزلوں کے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔

متفرق اشعار

توجہ کر کے پشیمان حیا ہو جائے! ڈر رہا ہوں کہ قیامت نہ بپا ہو جائے
شکوۂ جور و جفا کی یہ شرارت توبہ لب تک آنے بھی نہ پائے کہ دعا ہو جائے
حال تباہ عاشقی مظہر عاشقی کہاں قلب میں اب تڑپ کہاں آنکھ میں اب نمی کہاں
جنبش لب کے ساتھ ساتھ سارا جہاں نکھر گیا بارش حسن و نور ہے ان کی ہنسی ہنسی کہاں!

نہیں اشک آنکھ میں اور مسکرائے جاتا ہوں
جمال عشق کی زینت بڑھائے جاتا ہوں

قدم قدم پہ ادا کر کے سجدہ ہائے نیاز
قدم قدم پہ میں کعبہ بنائے جاتا ہوں

وہ اور آئیں نہیں اسکا اعتبار مجھے یہ خواب تو نہ دکھا چشم انتظار مجھے
بس ایک بار ہی پوچھا تھا عقل سے سر رہ کیا ہے عشق نے سو بار شرمسار مجھے

طبیعت بے نیازِ وصل و فرقت ہوتی جاتی ہے
بحمد اللہ تکمیل محبت ہوتی جاتی ہے

زباں رکتی ہے اور اسرار الفت فاش ہوتے ہیں
نظر جھکتی ہے اور شرح محبت ہوتی جاتی ہے

فطرت معصیت کا یہ جذبۂ انتقام ہے کل اسی لب پہ توبہ تھی آج جو غرق جام ہے
عارض نور پاش پر زلف سیہ ہے منتشر شام قریب صبح ہے صبح قریب شام ہے
زباں پہ لائے کہاں شکوہ ہر کسی کے لئے یہ دل بنا ہے ازل سے شکستگی کے لئے
کہاں میں اور کہاں یہ دیا رہے گا نہ بہانہ چاہئے کچھ مرگ بےکسی کے لئے
اسے اس ادائے تبسم پہ تو دریغ نہ کر تمام عمر میں رو یا ہوں اس ہنسی کے لئے

انجم ☆ محمد جان وزیرآبادی

نام محمد جان تخلص انجم قوم ذریعہ راجپوت وطن وزیرآباد (پنجاب) والد مرحوم کا نام ماسٹر میاں نبی بخش ہے۔ فوج کے محکمہ میں ٹھیکے لینے کا پیشہ آباؤ اجداد سے چلا آتا ہے۔
عرصہ بیشتر حصہ ہندوستان میں بسلسلہ کاروبار برٹش گورنمنٹ کے ساتھ گذرا ہے۔
تقسیم ہند کے بعد لاہور (پاکستان) میں مقیم ہوں۔

مجھے شاعری کا شوق حضرت سید قائم شاہ صاحب المعروف علامہ قتیل رضوی دانا پوری نے دلایا۔ ان دنوں میں دانا پور (پٹنہ) میں مقیم تھا۔ اصلاح سخن کی ابتدا ان سے ہی کی اور میں بہار میں ہر مشاعرے میں شرکت کرتا رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر میں بمبئی آ گیا۔ اور حضرت قتیل رضوی کے فرمان کے مطابق اصلاح ان کے بھتیجے حضرت احسن رضوی دانا پوری سے لیتا رہا۔ حضور احسن رضوی دانا پوری گویا میرے دوسرے مربی اور استاد ہیں۔

بمبئی کے بعد میں پونہ آ گیا اور بسلسلہ Military Contract تقریباً ۲ سال تک وہیں مقیم رہا۔ لسان الہند حضرت علامہ سیماب مرحوم سے میرا تعارف حضرت خیال انبالوی کے توسط سے بمقام جھانسی ایک آل انڈیا مشاعرے میں ہوا۔ اس کے بعد حضور سے خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور جب تک میں پونہ میں مقیم رہا۔ گاہے گاہے اپنا کلام برائے اصلاح حضرت مولانا سیماب صاحب کی خدمت میں روانہ کرتا رہا۔ حضرت مولانا کمال محبت اور خندہ پیشانی سے اصلاح فرماتے رہے۔ حضرت مولانا سیماب مرحوم آخری مرتبہ آل پاکستان مشاعرہ منعقدہ راولپنڈی سے واپس تشریف لائے تو لاہور میں ٹھہرے۔ میں حضرت مولانا حبیب اللہ خان صاحب مفتاؔ گجراتی کی معیت میں حضرت مولانا کی زیارت اور قدم بوسی کے لئے گیا۔ وہاں اور کئی حضرات بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ تقریباً گیارہ بجے رات تک ہم لوگ مولانا کے ارشادات عالیہ سے مستفید ہوتے رہے۔ اسی رات حضرت مولانا نے فرمایا۔ انجمؔ اب تم اپنا کلام مضطر صاحب کو دکھا لیا کرو چنانچہ اسی دن سے حضرت

مولانا مقتطر صاحب کا حلقہ بگوش ہوں۔ شاعری سے بڑھ کر ان کے اخلاق حمیدہ نے اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔

[illegible] مارٹن کا مقولہ ہے کہ شعر میں صداقت ہو۔ اور حقیقت میں اسی مقولہ پر کاربند ہوں۔ ہند و پاک کے جرائد و رسائل میں میرا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک نعت نظم اور غزل ملاحظہ فرمائیے۔

نعت شریف

جمال مصطفےٰ جس دل میں جلوہ گر نہیں ہوتا
وہ دل نورِ حقیقت سے کبھی بہرہ ور نہیں ہوتا

جھکا یا ہے تو اب سر کو کبھی نذرِ آستاں کر دے
کہ ایسے احترام روضۂ انور نہیں ہوتا

بہر سو دیکھتے ہیں تیرا جلوہ دیکھنے والے !!
یہ وہ جلوہ ہے جو محدودِ بام و در نہیں ہوتا

میں اپنی آپ بیتی کیا سناؤں مختصر یہ ہے !
خدائی کا کوئی لمحہ سکوں پرور نہیں ہوتا

خدا سے مانگ لیں بازوئے حیدر۔ قلب فاروقی
کہ جب تک یہ نہ ہوں نظمِ دو عالم سر نہیں ہوتا

نہ ٹپکے بن کے جو خونناب ان کے ہجر میں انجمؔ
وہ قطرہ اشک کا ہوتا تو ہے گوہر نہیں ہوتا

درسِ بیداری

وہ ناداں ہیں جو گرداب بلا سے خوف کھاتے ہیں
کبھی ساحل پہ آ کر بھی سفینے ڈوب جاتے ہیں

تلاطم خیز موجوں کو سفینا وہ بہنا تا ہے !
دلیری اور جواں مردی سے جینا جس کو آتا ہے

سبق اسلاف کا جو قوم دنیا میں بھلا بیٹھی !

برنگ نقش پا ہر اک نشاں اپنا مٹا بیٹھی
یقیناً تو بھلا بیٹھا ہے ارشاداتِ قرآنی!
دگرنہ تیری ٹھوکر میں تھا اورنگ جہانبانی
خود آگاہی تجھے حاصل تھی اور آہ سحر گاہی
جو درویشی میں بھی کرتا رہا ہے تو شہنشاہی
فروزاں سوزِ ایماں سے جو تیری ہر رگِ جاں تھی
تری خاطر بھڑکتی آگ بھی گلشن بداماں تھی
بھروسہ حضرتِ یزداں کی رحمت پر کیا تو نے
جبھی بیڑے جلا کے درسِ بیداری دیا تو نے
سرِ عرشِ بریں تجھ کو مقامِ خاص حاصل تھا
فرشتوں کا پہونچ جانا جہاں لاریب مشکل تھا
ترے سینے میں اب باقی نہیں وہ نورِ ایمانی
دگرنہ تیرے پاؤں چومتی پنہائے امکانی
اجالوں کی جگہ تاریکیاں ہیں تیری محفل میں
بجائے نور اب ظلمت برستی ہے تیرے دل میں
ثبات اس زندگانی کو ہے جو شعلوں میں پلتی ہے
کہ تقدیرِ امم کی شمع طوفانوں میں جلتی ہے

غزل

ہم ان کی یاد بن کے زمانے پہ چھا گئے … ایسے بھی لمحے عمرِ محبت میں آ گئے
بے اختیار زمزمہ فگن ہے کائنات … شاید وہ پھر بہار کے پردے میں آ گئے
میں چل پڑا تو کر دیا منزل کو بے سراغ … میں رک گیا تو راہ میں شمعیں جلا گئے
کرتے بیاں کو کبھی جہاں کرنے لگے سجود … ایسے مقام بھی مرے رستے میں آ گئے
ہوش و خرد میں کس کو ملا جادۂ مراد … وحشت جنوں میں آ کے جو منزل کو پا گئے
اٹھی نگاہ شوق جو الفت میں ڈوب کر … گھبرا کے خود ہی سامنے انجم کے آ گئے

اوج

نورالزمان احمد ہاشمی

اپنی کہانی اپنی زبانی کچھ معیوب سی معلوم ہوتی ہے ۔ اور پھر کوئی کارہائے نمایاں بھی تو سرانجام نہیں دیئے ۔ زندگی ہے کہ لا اُبالی میں کٹ رہی ہے ۔ اور احساس جوانی یا احساس تنہائی بری طرح ستا رہا ہے ۔ شاید اسی لئے برے بھلے شعر بھی کہہ لیتا ہوں قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ احساس و ذوق شعریت رکھتے ہوئے آجکل بہاولپور میں جیل خانے کے تاریک ماحول کا نگہبان ہوں ۔ ویسے بھی ؎

کہانی تو میری بڑی مختصر ہے — مگر جو سنو گے تو سن نہ سکو گے

قطعات

کسی کی یاد میں جب دل کے داغ جلتے ہیں
نفس کی لو پہ نظر کے چراغ جلتے ہیں
یہ کس فریب میں ہے جذبۂ وصال ابھی
بہار روٹھ گئی اور باغ جلتے ہیں

مٹ جاتی ہے جب ظلمت شب نور سحر میں
بہہ جاتے ہیں تارے بھی مرے دیدۂ تر میں
اک لذت پر کیف کی دنیا میں بسا ہوں
آتا ہے نظر ایک جہاں درد جگر میں

دل دلنظر میں نئے سہاروں کی یاد سی رہ گئی ہے باقی
مرے چمن میں حسین بہاروں کی یاد سی رہ گئی ہے باقی
حسین راتوں کے دھندلکوں میں حریم الفت سجا نہ لو لے
کسی کے سینے میں چاند تاروں کی یاد سی رہ گئی ہے باقی

بہار آ ہی گئی دامنوں کو چاک کرو
گلوا شباب کو تم اور تابناک کرو
شباب اور امنگوں کی کارفرمائی
حسینوں دیکھو محبت سے اشتراک کرو

جوانی کی تسلی کو محبت ہم رکاب آئے
کبھی وہ آپ ہی آئیں کبھی خط کا جواب آئے
دھڑکتے دل ملیں لیکن اداؤں میں نوازش ہو
ادھر پاس ادب ہو اور ادھر ان کو حجاب آئے

غزل

اثر بہار کا لے کر خزاں چلی بھی گئی!
تڑپ سکے برق نہ آشیاں جلی بھی گئی
مجھے چمن میں حقیقت کی جستجو ہی رہی
کلی سمیٹ کے نام و نشاں چلی بھی گئی
غضب کیا مرے دامن میں آگ جو رکھ دی
حیات آئی بھی دامن کشاں چلی بھی گئی
نگاہ ناز کے ڈر سے یہ دل جو بیٹھ گیا
نگاہِ ناز تو شعلہ بجاں چلی بھی گئی
جوانی جو تری زلفوں سے کھیلتی آئی
مثال سایۂ ابر رواں چلی بھی گئی

متفرق اشعار

غرورِ حسن تمہیں تو اک بہانہ تھا
مجھے بھی تیری نگاہوں میں ڈوب جانا تھا
فریب عشق کی منزل بھی کیسی منزل تھی
قریب آئے تو سمجھا کہ دور جانا تھا

مشتاقِ دید تشنہ نظر کس لئے رہے!
تکتے وہ تیری راہ گذر کس لئے رہے
تارے بھی ڈوب ڈوب گئے انتظار میں
وہ بھی شریک دیدۂ تر کس لئے رہے

آسودہ نظر وقتِ خرابات ہوئی ہے
بیٹھا لئے ہیں ساقی سے ملاقات ہوئی ہے

ایثار بدایونی

ایثار

۱۶ جون ۱۹۳۰ء کو بمقام بدایوں پیدا ہوا اور دہلی میں ہوش سنبھالا ۱۹۴۷ء کے خونیں انقلاب نے دہلی سے اٹھا کر اوکاڑہ میں پھینک دیا مضمون نگاری اور افسانہ نویسی کا شوق ہے شعر بھی کہتا ہوں اس لیے مستقبل قریب میں حضرت شفا گوالیاری سے تلمذ کا ارادہ ہے چونکہ ابھی تک کسی سے شرف تلمذ حاصل نہیں اس لیے اشعار تشنۂ اصلاح ہیں۔

متفرق اشعار

ابھی اے دل نہیں واقف تو رسمِ راہِ الفت سے
جو واقف ہے تو پھر بیتاب کیوں ہے دردِ فرقت سے

بے نیازِ ساغر و مینا ہے وہ   ان کی نظریں جس کو متوالا کریں

اگر مرنا تری الفت میں اے جانِ جہاں ہوتا
میسر پھر مجھے لطفِ حیاتِ جاوداں ہوتا

ان کی اس پردہ نشینی کی ادا پر دل نثار   ہم سے یوں چھپتے ہیں وہ جیسے کبھی دیکھا نہ ہو

ابھی حجاب و حجاب سے باہر   دیکھنے کو نظر ترستی ہے

آہ محرومِ اثر فریاد بے تاثیر ہے   میری ہر تدبیر کی دشمن مری تقدیر ہے

ہم قفس برق گلستاں پہ گری ہے شاید
تیلیوں میں سے ابھی میں نے دھواں دیکھا ہے

وقتِ نظارہ الٰہی تاب نظارہ بخیر   جلوہ گاہِ ناز میں جلووں کا اک طوفان ہے

یہی تو ہیں میرے ہنستے ہوئے خوابوں کی تعبیریں
نظر جو آنسوؤں میں شام غم آتی ہیں تصویریں

تمام زمانے کی نگاہوں سے نہ دیکھو مجھ کو   ہوتی آئی ہے ان آنکھوں کو برا کہتے ہیں

برق محمد یوسف بارہ بنکوی

میں یکم مارچ ۱۹۲۹ء کو کلکتہ میں پیدا ہوا ——— میری پرورش ایسے ماحول میں ہوئی جہاں اردو سے زیادہ بنگالی بولی جاتی تھی اور یہ کسی حد تک صحیح بھی تھا اردو جو ہم لوگوں کا اوڑھنا بچھونا ہے وہ بنگال میں برائے نام تھی۔ میری زبان پر اس کا بہت برا اثر پڑا۔ چنانچہ میں جب تک کلکتہ میں رہا مجھے صحیح اردو بولنا نہیں آئی جب میں نے یو۔ پی کی سرزمین پر قدم رکھا تو مجھے اس کی شیرینی اور لطافت و رعنائی کا احساس ہوا۔ آہ زبانِ اردو آج جس پر واگ کے اس پار کلہاڑے چلائے جا رہے ہیں۔ اور اس کو نیست و نابود کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ جو کبھی یو۔ پی کے ہر طبقہ کی زبان تھی۔ اور آج ایک مخصوص طبقہ اس کو دیس نکالا دینے کی فکر میں ہے۔ ہیں بھی کہاں سے کہاں چلا گیا۔

ہاں تو جب میں کانپور آیا تو اردو میری رگ رگ میں سما گئی اور یہ اسی کا فیض ہے کہ آج میرے اشعار آپ کے سامنے ہیں۔

مجھکو اچھی طرح نہیں یاد لیکن یہ ضرور بتا سکتا ہوں کہ میں درجہ نہم ہی سے شعر گوئی کی طرف مائل ہو گیا تھا اور اشعار کی صورت میں اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس کم عمری میں کہے ہوئے اشعار حسن اثر سے خالی ہوتے تھے لیکن پھر بھی مجھے شعر کہنے کا شوق بڑھتا گیا۔ مجھے مسرت ہے کہ میرے اس ذوق کی صحیح رہنمائی حضرت شمیم کانپوری نے فرمائی ۱۹۴۹ء میں استاذی شمیم صاحب نے مجھے اپنا شاگرد بنا لیا تھا اور خدا کا شکر ہے کہ یہ تعلق آج تک قائم ہے سچ پوچھئے تو استاد محترم ہی کا فیض ہے جس کی بدولت میں شعر و ادب کی پیچیدہ راہوں سے واقف ہو سکا ہوں۔ میں اپنی زندگی میں کوئی خاص بات نہیں پاتا جسے آپ کے سامنے پیش کروں ہاں یہ آرزو ضرور ہے کہ میری زندگی اردو و ادب و شاعری کی خدمت میں بسر ہو۔

متفرق اشعار

کتنا حسیں فریبِ تجسس ہے الاماں
منزل پہ آ کے دور ہے منزل ابھی کارواں

کچھ اس ادا سے بہار آئی صحنِ گلشن میں
گلوں کے حسن میں خود جذب ہو گئی شبنم

کشتی کی اپنی آپ جو چاہیں سلامتی
دریا کو موڑیے، موج کو ساحل بنائیے

بس تمنا ہے تو یہ ہے ساقیٔ محفل مجھے
کر عطا اک جام میرے ظرف کے قابل مجھے

جا رہا ہوں کس کی محفل کی طرف دیوانہ وار
میرے قدموں پہ جھکے پڑتے ہیں ماہ و آفتاب

جو آ رہا ہے لہو دل کا کھینچ کے آنکھوں میں
یہ اہتمام ہے تکمیلِ داستاں کیلئے

چشمِ نظارہ کوش کی خود ہی اسے تلاش تھی
پردے سے حسنِ دلنواز ہو نہ آشکار کیوں

قسمت کو رو رہا ہوں کہ محفل سے آپ کی
ناکامیوں نے دور بہت دور کر دیا

ترے حضور جو آنکھوں میں آ گئے آنسو
ترے کرم نے مجھے مسکرا کے چھوڑ دیا

اب کیا قفس میں ذکرِ گلستاں سے فائدہ
جب دل سے اپنے آرزوئے بال و پر گئی

محرومیٔ نصیب تھی ہمراہ کارواں
منزل کے پاس نبضِ مسافر ٹھہر گئی

طوفاں کو بنا لیجئے دمسازِ سفینہ
ہر موج میں ہے عشرتِ ساحل کا خزینہ

اس شاہدِ رعنا کی جو آمد ہے چمن میں
آنے لگا ہر پھول کو غیرت سے پسینہ

تھی بحرِ محبت میں جو ساحل کی تمنا
ڈوبا کیا، ابھرا کیا موجوں میں سفینہ

تو کر لے جو مقبول تری بندہ نوازی
ورنہ مجھے آتا نہیں سجدوں کا قرینہ

ابھرا ہی تھا مژگاں پہ ادھر اشکِ ندامت
لٹنے لگا اس سمت سے رحمت کا خزینہ

اے برقؔ یہ حسرت ہے کہ جب جان فنا ہو
رُخ ہو طرف کعبہ نظر سوئے مدینہ

بہزاؔد سردار احمد خاں لکھنوی

سنہ پیدائش ۱۹۰۰ء وطن لکھنؤ ہے مکان لکھنؤ کے محلہ امین آباد میں تھا۔ غالباً تیسرے درجہ سے شعر کہنے شروع کئے۔ سن شعور کو پہونچنے کے بعد جب کھانے کمانے کی فکر ہوئی تو ریلوے میں عرصہ تک ٹی ٹی آئی رہا۔ اختلاج قلب کی شکایت کی بنا پر ملازمت چھوڑی، سات برس تک عالم جذب میں رہا لیکن ہوش تھا قدرے سکون کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں دہلی میں مصنف کی حیثیت سے رہا ۱۹۳۲ء میں پنچولی فلم کمپنی لاہور میں بطور مکالمہ نویس ۱۹۴۲ء تک رہا ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں بطور مصنف ۱۹۴۶ء تک رہا ۱۹۴۶ء میں گیت نگار کی حیثیت سے راج کمل کلا مندر بمبئی میں ملازم ہو گیا اور ۱۹۵۱ء تک فلمی حیثیت سے زندگی بسر کرتا رہا۔ متعدد مجموعۂ کلام نکلے "نغمۂ نور" "کیف و سرور" "موج طہور" اور "چراغ طور" وغیرہ کافی مقبول ہوئے۔ چالیس پینتالیس فلموں کے گانے لکھے۔ آدمی مذہبی ہوں میرا تعلق خانقاہ نیازیہ بریلی شریف سے ہے۔ گوشہ نشین آدمی ہوں۔ نعت کہنے کا ذوق ہے۔ جیسا کہتا ہوں وہ آپ کے سامنے ہے۔ اور کیا عرض کروں۔

گر نام و نشانِ من پرسند بگو قاصد
آوارہ و مجنونے رسوا سرِ بازارے

مری بے خودی کا نظام اللہ اللہ — سرِ شوق خم گام گام اللہ اللہ
زہے فیضِ ساقی زہے کیف میکش — رہا رقص میں خود ہی جام اللہ اللہ
زِ نطق تمنا حدیثِ محبت — کلیم اللہ اللہ کلام اللہ اللہ
ہر اک گام جلوہ ہر اک گام حیرت — سرِ راہ یہ اہتمام اللہ اللہ
مری آہ ناکام اللہ اکبر — مرا نالۂ ناتمام اللہ اللہ
ہوا ایسے میں چپ چپ فضا بے ستم کش — دبے پاؤں ان کا خرام اللہ اللہ
زہے جذبِ الفت جنوں کی یہ ہمت — کہ چھینا خرد کا مقام اللہ اللہ

فروغِ دریا پہ بہزاد نکلا
مرا سجدہ ہے قیامِ اللہ اللہ

وہ ہزار سامنے ہوں کریں لاکھ رونمائی
انہیں دیکھنے نہ دے گی یہ نظر کی پارسائی

یہ تو ہی بتا دے زاہد ہے ریا کہ بے ریائی
مرا جذبۂ ندامت تری شانِ پارسائی

ترے آستاں کے صدقے کوئی حد بھی کیف کی ہے
کہیں مست ہو نہ جائے مرا ذوقِ جبہ سائی

میں جہاں سے منہ پھرا کے ترے پاس آ رہا ہوں
کوئی اور کیا بھرے گا مرا کاسۂ گدائی

مری الجھنوں سے پوچھو مری دھڑکنوں سے پوچھو
بڑی منزلوں سے گزری ہے فغاں کی نارسائی

مری زندگی ہے مستی مری زندگی کا حاصل
نہ جنوں نہ ہوشمندی نہ وفا نہ بے وفائی

مری بے خودی تصدق مری مستیاں نچھاور
وہ ادھر ہی آ رہے ہیں یہ کمال دلربائی

تری رہ گزر کے پھیرے ترے آستاں کے سجدے
یہی ہیں مری خدائی یہی میری پارسائی

خبر نہ تھی تیری جستجو میں کشاکشِ رہروی ملے گی
قدم قدم پر جبیں جھکے گی قدم قدم آگہی ملے گی

تجھیں مبارک مرا تڑپنا مجھے مبارک تمہارے جلوے
یہ دونوں عالم رہیں سلامت جہاں کو آسودگی ملے گی

نہ ڈھونڈ ہم کو جہانِ عالم میں پا رہے ہوں جہاں یہ وہ ہیں
جہاں بھی کھویا ہوا ملے گا وفا بھی کھوئی ہوئی ملے گی

ابھی نہ چھیڑو ابھی نہ چھیڑو ابھی تو ذوقِ طلب میں گم ہوں
یہ راز کیوں مجھ پہ کھولتے ہو کہ اور مشکل ابھی ملے گی

خرد کے دھوکے میں آ رہا ہوں جنوں سے دامن بچا رہا ہوں
سمجھ رہا ہوں یقیں ہے پا کر سکون کی زندگی ملے گی

یہاں تو ہر ذرہ میکدہ ہے کہ ہم تو ہیں تیرے رند ساقی
مگر یہاں مستیاں ملیں گی مگر کہاں بے خودی ملے گی

گماں کے ہاتھوں تباہ خستہ کدھر یہ دیوانے جا رہے ہیں
کہیں نہ کعبہ نہ بتکدہ ہے ملی تو ان کی گلی ملے گی

بہار

محمود الحسن خاں کوٹی

میرا نام محمود الحسن خاں ہے۔ ضلع فتحپور ہسوہ (یو۔پی۔ بھارت) کے قصبہ کوٹ میں جو دریائے جمنا کے بائیں کنارے پر آباد ہے اور لکھوکھر پٹھانوں کی مشہور بستی ہے جولائی [illegible] کی کسی تاریخ میں ایک متوسط درجہ کے زمیندار کے گھر میں پیدا ہوا۔ میرے والد کا اسم گرامی بدر الحسن خاں ہے جو بفضلہ بقید حیات ہیں اور بھارت ہی میں رہ رہے ہیں۔ میرے جد اعلیٰ (ملک بہل خاں) کو شاہانِ مغلیہ سے ۲۰ گاؤں معافی میں ملے تھے۔ کوٹ انھیں میں سے ایک ہے۔

اُردو۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ قرآن شریف مولینا مولوی حافظ محمد حسن صاحب ایرانی مرحوم نے ختم کرایا۔ ورناکیولر فائنل کا امتحان اُردو اور ہندی میں کوٹ کے ٹاؤن اسکول سے پاس کیا اور ۱۹۳۰ء میں میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول فیروزپور پنجاب سے۔ جہاں کچھ عرصہ تک کالج میں زیر تعلیم رہا لیکن بعض خاندانی الجھنوں کے باعث ڈگری نہ لے سکا

میری زندگی کا بیشتر حصہ اجمیر میں گزرا جہاں کمشنر اجمیر میرواڑہ کے دفتر میں کلرک اور پھر برانچ انچارج کی حیثیت سے تقسیم ملک کے قبل تک مامور تھا۔ فروری ۱۹۵۰ء میں پاکستان آیا اور جب سے اب تک ایک فرم میں کام کر رہا ہوں۔

مجھے اُردو۔ انگریزی۔ فارسی۔ اور ہندی ادب سے برابر کا لگاؤ ہے اور ان چاروں زبانوں سے بے تکان استفادہ کرتا ہوں۔

شعر ۱۵-۱۶ سال کی عمر میں کہہ لیتا تھا۔ سب سے پہلی غزل ۱۹۲۸ء میں لاہور کے "ادبی دنیا" میں شائع ہوئی اور جب سے اب تک رسائل میں برابر لکھ رہا ہوں۔ میرے کلام کا بیشتر حصہ میری لاپروائی سے ضائع ہو گیا۔ میرے قبضے میں اب صرف اتنی نظمیں اور غزلیں ہیں کہ مشکل ایک مجموعہ مرتب ہو سکے جس کی اشاعت کی فی الحال کوئی توقع نہیں۔

متعدد حضرات مجھ سے مشورۂ سخن کرتے ہیں لیکن میں انھیں نہ شاگرد سمجھتا ہوں اور نہ خود کو اُستاد۔

میں نے مختلف رسائل میں وقتاً فوقتاً سو سے زیادہ علمی ادبی اور تاریخی مقالے لکھے ہونگے

لیکن اب نہ میرے پاس ان مقالات کا مسودہ محفوظ ہے اور نہ وہ رسائل ہیں جن میں شائع ہوئے۔

ایک زمانے میں افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ غالباً ۱۹۴۵ء میں رائل ایجوکیشنل بک ڈپو نے "خاکستر" کے نام سے شائع کیا تھا جو اب ناپید ہے۔ دوسرا مجموعہ "گل گیر" اسی بک ڈپو نے ۱۹۴۶ء میں مجھ سے لے لیا تھا۔ یہ مجموعہ مارکیٹ میں آیا ہی تھا کہ فسادات شروع ہو گئے اور اس طرح یہ بھی ناپید ہو گیا۔

میں شعر ترنم سے نہیں پڑھ سکتا۔ اگر مجھے ترنم سے پڑھنا آتا بھی ہوتا تو تحت لفظ کو ترجیح دیتا اس لئے کہ جہاں تک میں نے غور کیا ہے مترنم شعراء عمق و فکر سے بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں۔

حضرت عشق فیروزپوری (خاندان امیریہ) کے تلمذ کا مجھے فخر حاصل ہے جنھوں نے میرے طالب علمی کے زمانہ میں میرا کلام دیکھا۔ ۱۹۳۱ء میں "فارغ الاصلاح" قرار پایا۔

ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ نظمیں زیادہ کہیں۔ نظموں میں جوش کو پسند کرتا ہوں لیکن جہاں تک ٹکنک کا تعلق ہے ان کا قائل نہیں

غزل میں میر۔ مومن۔ غالب اور فانی کا قائل ہوں۔ تمام پیشروؤں کا احترام کرتا ہوں اور ملکہ شعر کو موہبتِ عظمیٰ گردانتا ہوں۔ فکر معاش سے جب بھی فرصت میسر آتی ہے۔ خدمتِ ادب میں صرف کرتا ہوں۔ شعر جلد کہہ سکتا ہوں مگر دیر میں کہتا ہوں۔ شعر زیادہ تر گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر جاتے ہوئے کہتا ہوں اس لئے کہ ملازمت کے علاوہ ٹیوشن کرنے پر مجبور ہوں اور بہت کم وقت نکال پاتا ہوں۔

زندگی سادہ اور ضروریات بجد مختصر رکھتا ہوں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ مطمئن اور پرسکون زندگی بسر کی۔ ہر قسم کے "شوق" سے بریٰ ہوں۔ خوشامد و تملق سے فطری طور پر متنفر ہوں۔ خودداری عزیز ہے۔ دو نظمیں اور دو غزلیں حاضر ہیں۔ انتخاب کی ضرورت نہیں محسوس کرتا اس لئے کہ جو کچھ کہتا ہوں بزعم خود "چھان پھٹک" کر کہتا ہوں۔

ایک کروٹ اور ابھی

وہی عالمِ پیچ و تاب آج تک ۔۔۔۔۔ وہی شورشِ اضطراب آج تک
وہی سوزشِ روحِ تشنہ سا ہنوز ۔۔۔۔۔ وہی جاں گسل التہاب آج تک

وہی بندگی کی فتادہ روش — وہی خواجگی کا عذاب آج تک
وہی التجائے کرم گستری — وہی بابِ عالی جناب آج تک
وہی عجز و افتادگی کا جنوں — وہی رنگِ چشمِ عتاب آج تک
وہی میگسار و میکش و میکدہ — وہی دورِ جامِ شراب آج تک
وہی رامش و رنگ کی بارشیں — وہی جلوۂ بے حجاب آج تک
وہی پیاسی پیاسی حریص انکھڑیاں — وہی بہکا بہکا شباب آج تک
وہی ٹوٹتے ٹوٹتے سرو و سمن — وہی چھلکے چھلکے گلاب آج تک

کہاں کا اُجالا کہاں کا سحر — ہے شیشوں میں بند آفتاب آج تک
تلاطم ہے اک عمر سے تہ نشیں — اُبھرتے رہے ہیں حباب آج تک
کبوتر ہے مصروفِ صید افگنی — نشیمن گزیں ہے عقاب آج تک
ہے اس مردِ حق کوش کا منتظر — خدا کی قسم انقلاب آج تک

کہ جس کی ہر اک سانس میں مشتعل
دھڑکتا ہے[1] سبطِ محمد کا دل

شاعر کا گھر

ہم جیسے کس مپرس پراگندہ حال لوگ — رہتے ہیں اس دیار میں گاندھی نگر ہے یہ
مسکن کثافتوں کا وباؤں کا مستقر — مامن غلاظتوں کا عفونت کا گھر ہے یہ
یہ پست جیسے پیڑ سے شکستہ مکاں یہ پھول — ویرانہ در کنار بیاباں بسر ہے یہ
روداد بے نیازیٔ اربابِ حل و عقد — آئینہ دارِ غفلتِ اہلِ نظر ہے یہ
بھونچال لے رہے ہیں ہر اک موڑ پر یہاں — اک تازہ انقلاب کا پیغامبر ہے یہ
اس پر بھی منطبق نہ کہیں ہو نظامِ نو — حیرت فزائے چشمِ حقیقت نگر ہے یہ
زندانِ غم کا حال چھپایا نہ جائیگا — زندانِ غم کا حلقۂ بیرونِ در ہے یہ
بکتا ہے قصر جو کہ ڈھانے جو کارواں — اس کارواں کو شمعِ سرِ رہگزر ہے یہ
جیسے ہوں فریب خوردۂ لیلائے حریت — ماتم گسارِ وعدۂ فردا کا مستقر ہے یہ
گاندھی نگر ہے یہ

---

[1] جوش کا شعر تصرف کے ساتھ۔

اس کال کوٹھری میں نفاست گزیں ہوں میں — آرام گاہِ طائرِ بے بال و پر ہے یہ
صرف اس پہ ہو چکا ہی بس اندوختہ تمام — کل کائنات زندگی مختصر ہے یہ
تنگ اور چشمِ حاسد کم ظرف سے بھی تنگ — تاریک اور قبر سے تاریک تر ہے یہ
شدت النہار سے بھی پرے جا چکا ہے مہر — اب تک امیدوار نمود سحر ہے یہ
پابندگی میں رشکِ طلسم خیال و خواب — کہنہ سنی میں غیرتِ عمرِ خضر ہے یہ
پھر بھی نزولِ شعر سے ہوتا ہے مفتخر — اس حال میں بھی مہبطِ شمس و قمر ہے یہ

شاعر کا گھر ہے یہ
گاندھی نگر ہے یہ

مآلِ ضبط سعی رائیگاں معلوم ہوتا ہے — تبسم بھی اک اندازِ فغاں معلوم ہوتا ہے
سکون منجمد وہم و گماں معلوم ہوتا ہے — جو قفس ہے برائے آشیاں معلوم ہوتا ہے
نہ جانے کتنے سورج ہو گئے پیوندِ خاک اب تک — زمیں کا دوسرا رخ آسماں معلوم ہوتا ہے
جنوں کی ابتدا یا آگہی کی انتہا کہیے — نگاہِ شوق پر جلوہ گراں معلوم ہوتا ہے
بقدرِ وحشتِ دل ڈھال لی جاتی ہیں زنجیریں — جہاں سر تھا وہاں سنگِ آستاں معلوم ہوتا ہے
یہ مانا ایک قدرِ مشترک ہے دردِ دل لیکن — یہاں محسوس ہوتا ہے وہاں معلوم ہوتا ہے
جلے ہوں گے نشیمن اٹھ رہا ہوگا دھواں لیکن — مجھے تو یہ غبارِ کارواں معلوم ہوتا ہے

غزل

کر دیں جو کر رہے ہیں مجھے رنگ و بو سے دور — دستِ جنوں سے دور ہیں پتھر نہ سر سے دور
تا پستیِ کہیں کہ لوگ شرارے کہیں انھیں — کچھ اشک جا پڑے مرے دامن تر سے دور
ہیں اک نظر خود اپنی حقیقت پہ ڈالتا — اتنی ہی دیر بھی نہ رہے وہ نظر سے دور
اک جانِ میکدہ کا تصور کیے ہوئے — بیٹھا ہوا ہوں گردشِ شام و سحر سے دور
کچھ احترامِ عشق بھی واجب ہے حسن پہ — دانستہ رہ گیا ہوں تری رہگزر سے دور
یہ حسن کا کرم ہے جنوں کے تصرفات — سر سنگِ در پہ رہ کے رہا سنگِ در سے دور
کچھ اپنے اعتبارِ نظر سے بھی کام لے — چل کارواں کے ساتھ مگر راہبر سے دور

شاید مریض اب کوئی کروٹ نہ لے سکے — وہ مسکرا رہے ہیں کھڑے چارہ گر سے دُور
یہ اپنے اپنے جذبۂ وحشت کی بات ہے — ورنہ چمن قریب تھا ویرانہ گھر سے دُور
خوش اعتمادیوں کا ستایا ہوا ہوں میں — جب بھی لٹا۔ لٹا ہوں رہِ پُر خطر سے دُور
شاید ہی باریابِ ادب ہو سکوں بہار
پھینکا گیا ہوں مجمع اہلِ نظر سے دُور

پرویز گل

۱۹۳۲ء میں تولد ہوا۔ حیران ہوں کہ ابھی تک زندہ ہوں۔ لوگ مجھے پرویز گل کہتے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا چند اشعار بیخودی کے عالم میں "سرزد" ہو گئے۔ اس لئے آپ سن لیجئے۔

مدہوشِ تمنا کو اوروں کی خبر کیا ہو — پروانے سے محفل میں بیگانہ ہے پروانہ
معلوم نہیں کیا ہے مقصد مرے جینے کا — تقدیر سے ناواقف تدبیر سے بیگانہ
مجھ رند کی یہ قسمت ہر وقت کھلے در ہیں — اک سمت در توبہ اک سمت درِ میخانہ

اعجاز حسین جالندھری

سال پیدائش ۱۹۲۷ء نام اعجاز حسین

جس گلستاں کا مقدر ہو رہا ہے تو بچیں — اس گلستاں میں اُجڑنے کو بہار آئیگی
پیامِ موت جسے ہچکی کو کہتے ہیں جہاں والے — ترے بیمار کو آئی ہیں ایسی ہچکیاں برسوں

تاثیر

نعمان تاثیر

پیدائش :۔ اپنی پیدائش کی تاریخ مجھے یاد نہیں۔

آغازِ زندگی :۔ خلوص اور احساس دوستی نے جب دل میں انگڑائی لی تب خود کو زندہ دلوں کی صف میں پایا ؎

کل ہنس رہا تھا کوئی پس پردۂ بہار
مجھ کو یہی خیال ہے اے دوست تو نہ ہو

تعلیم و تربیت :۔ فطرت خود سب سے بڑی معلم ہے مگر ؎

نشو و نما کی یا تو نہ تھیں ہم میں قوتیں!
یا فطرتِ چمن نے ابھارا نہیں ہمیں

شاعری :۔ شعر صرف ذوق و وجدان کے تحت کہتا ہوں اور کہنے والے مجھے تاثیر کہا کرتے ہیں

مقصدِ زندگی :۔ جستجوئے دوست میں دستِ قدرت کو بے اثر ثابت کرنے کی سعی لیکن

نہ کوئی دوست نہ دشمن کوئی ہمارا ہے
بس اک تعلقِ بے وجہہ پر گذارا ہے

ناکامی شاید اس لئے ہے کہ

ابھی لگی نہیں لگنے کی طرح دل میں آگ
رکا ہوا سا ابھی آنسوؤں کا دھارا ہے

لیکن یہ دل یوں تسلی دیتا ہے کہ ؎

یہ غم نہ کر کہ ہوا کامگارِ عشق نہ تو
اسی کی جیت ہے جو عاشقی میں ہارا ہے

سرمایۂ زندگی :۔ ایک سو شعر جو ضبط نے کہنے نہ دیا ؎

غیر [illegible] کہ ضبط سے روکا
آج سب راز کہہ دئے ہوتے

محبت :- محبت اک سبک تر موج ہے اک غنچۂ نورس
محبت وہ نہیں ہے جو کسی پر بار ہو جائے

انجام زندگی :- رخ بدلتی ہے زندگی اپنا
موت کا صرف اک بہانہ ہے

۵ جنوری سنہ ۱۹۲۷ء بمبئی میں پہلا شعر ہوا۔

مری توبہ کے ٹکڑے ہیں کہ ابر تر کے ٹکڑے ہیں
فضاؤں میں پریشاں یاران مضطر کے نالے ہیں

اور یہ اشعار جو قصداً بھی اور غیر ارادی طور پر بھی قلمبند ہوتے رہے

کیوں یہ آنسو بہا رہا ہوں میں — حاصل غم لٹا رہا ہوں میں
جب ہوا خود اپنے عکس کی تصویر — پھر کسی کو بلا رہا ہوں میں
جذب ہو کر فضائے عالم میں — لے تری سمت آ رہا ہوں میں
ساری دنیا کے دکھ درد کا درد — ان کی نظروں میں پا رہا ہوں میں
آنکھ میں اشک اور لب پہ آہ — درد دل یوں چھپا رہا ہوں میں
اے ستمگر یہ سب مظالم تو دیکھ — غم میں بھی مسکرا رہا ہوں میں

دل نے آج آواز کو دی کچھ اس انداز سے — خود بخود اٹھنے لگے پردے حریم ناز سے
آرہی ہے آج یوں کانوں میں چھم چھم کی صدا — جیسے رات کوئی پکارے دور کی آواز سے
جن کی نظروں میں بہاریں ہوں خیال حسن کی — روک سکتا ہے انھیں [illegible] پرواز سے
ہے ترا پہلو زندگی ہے وقت ہے [illegible] — ہے وہ دل [illegible] سوز و ساز سے
کس نے پایا دل کی خاموشی پر ان کو جیسے [illegible] — کیا کبھی آواز آتی ہے شکستہ ساز سے
وہ بہاریں [illegible] گلشن [illegible] — آ [illegible] دونوں اک آواز سے
حسن [illegible] پاؤں تک اک درد بن کر رہ گیا — عشق نے کس کو پکارا دکھ بھری آواز سے

کس میں ظرف رازداری ہے جو سن کر چھپا سکے
کس کو واقف کیجئے تاثیر دل کے راز سے

رخ سے پردہ اٹھا دیا تو نے
روح کو جگمگا دیا تو نے

دل درد آشنا دیا تو نے
خواہشوں سے بچا دیا تو نے

یہ بھی تیرا کرم غنیمت ہے
مجھ کو جینا سکھا دیا تو نے

میں کہ تیرے بغیر کچھ بھی نہیں
تو کہ مجھ کو بھلا دیا تو نے

خواہش زندگی نے کروٹ لی
اے خلش وہ مزا دیا تو نے

روح بھی رقص میں ہے اے ساقی
آج یہ کیسا پلا دیا تو نے

وہی آنسو تھا تیرے غم کا امین
آنکھ سے کیوں گرا دیا تو نے

میں تو اک مجرم محبت تھا
کیوں نہ مجھ کو مٹا دیا تو نے

جب سکوں تیرے بس کی بات نہ تھی
درد دل کیوں بڑھا دیا تو نے

غم دیا وہ بھی جاوداں نہ رہا
اے خدا مجھ کو کیا دیا تو نے

نہیں تاثیر سے جو وابستہ
کیوں وہ دست دعا دیا تو نے

پیغام شب ہجر ہیں نظروں میں چھپائے
ڈھلتی ہوئی یہ دھوپ سمٹتے ہوئے سائے

اشکوں سے لئے کچھ داغ بھی سینے کے مٹائے
کام آئے محبت میں نہ اپنے نہ پرائے

یوں ہیں رخ رنگیں کو وہ زلفوں میں چھپائے
جس طرح سر شام ہوں کچھ چاند کے سائے

دل طور تجسم ہے نظر نور سراپا
جلوے ہیں کہ بستے ہیں مری آنکھوں میں سمائے

یہ جبر محبت ہے کہ ہے طلسم محبت
وہ جان تمنا ہیں تو خود آئے نہ بلائے

دل حسرت نظارہ سے دم توڑ چکا ہے
اس پر بھی اگر ان کو جو آنا ہے تو آئے

آتش دل سوزاں کی کبھی بجھ نہیں سکتی
تو شام و سحر لاکھ یونہی اشک بہائے

اک حیرت نا دید کی نظروں میں بسا ہوں
پروا نہیں دنیا مجھے نظروں سے گرائے

کیا اب بھی سزاوار غم عشق نہیں ہم
طوفان اٹھے دل میں اور آنسو نہ بہائے

جاتی ہے بہار اور ہے دل مائل نغمہ
کلیوں کی یہ رت لوٹ کے اے کاش پھر آئے

اٹھ چکے رہ گئے کچھ اور شب غم
اے ڈوبتے تارو کہیں دل ڈوب نہ جائے

وقت سحر دوست ہے تاثیر کی بستی
اب اور اسے گردش دوراں نہ مٹائے

وقت آ ہی پہونچا ہے کیا خزاں کے آنے کا
کر رہے ہیں کیوں غنچے قصد مسکرانے کا

خوف ہے ہر لمحہ دل کے بیٹھ جانے کا
اب گزر گیا شاید وقت ان کے آنے کا

یہ نہ دیکھ کیا منشا سر کو ہے جھکانے کا
رابطہ دیکھ سجدوں سے اپنے آستانے کا

یوں مری خطاؤں سے حیلہ کار ہاں کب ہیں
تھا ترا کرم خوگر صرف اک بہانے کا

اور کچھ بڑھے شدت حسرت نظارہ کی
غالباً یہ مطلب ہے چھپ کے بیٹھ جانے کا

نیند دھڑکنیں دل کی روح کچھ کچلی سی
اہتمام تو دیکھو شام غم کے آنے کا

یہ نہ ہوں تو تنکوں کو کون زندگی بخشے
بجلیوں سے قائم ہے نام آشیانے کا

سوچنا یہ ہے ان سے بار عشق اٹھے گا!
میں تو خیر خوگر ہوں کلفتیں اٹھانے کا

بھر دیئے ہیں رگ رگ میں اپنی یاد کے شعلے
یہ بھی اک طریقہ ہے ان کو بھول جانے کا

دل کی زندگی تاثیر ان کی بے رخی تک ہے
کاش انھیں نہ ہوش آئے اب مجھے منانے کا

نہ کوئی دوست نہ دشمن کوئی ہمارا ہے — بس اک تعلق بے وجہ پر گذارا ہے!
عجیب چیز غم عاشقی ہمارا ہے — یہ حال ہے کہ گوارا بھی ناگوارا ہے
اگر نگاہ کا تیری یہی اشارا ہے — تو جو بھی غم ہو محبت کا وہ گوارا ہے
ہوا ہے دہر ہے کوئی نہ ماہ پارا ہے — جسے قبول کرے دل وہی ہمارا ہے
یہ غم نہ کر کہ ہوا کامران عشق نہ تو — اسی کی جیت ہے جو عاشقی میں ہارا ہے

غمِ فراق غمِ انتظار فکرِ وفا — ہمارا دل بھی عجیب آفتوں کا مارا ہے
ابھی لگی نہیں سلگنے کی طرح دل میں آگ — رکا ہوا سا ابھی آنسوؤں کا دھارا ہے
ہمارے پاس اسی طرح تھے کبھی وہ بھی — کہ جیسے چاند کے پہلو میں اک ستارا ہے

وہ دوست ہو کہ ہو دشمن ہے ربط اک تاثیر
ہمیں خود اپنی ہی اس سادگی نے مارا ہے

شعورِ عشق تھوڑی دیر ہی بیدار ہو جائے
ادھر بھی کچھ توجہ اے نگاہِ یار ہو جائے

مزا آئے نظر ان سے اگر دو چار ہو جائے
اک ہنگامہ قریب جلوہ گاہِ یار ہو جائے

محبت اک سبک تر موج ہے اک غنچۂ نورس
محبت وہ نہیں ہے جو کسی پر بار ہو جائے

ہے سب کو اپنی اپنی فکر طوفاں کے تھپیڑوں میں
کسی کو یہ نہیں پروا کہ بیڑا پار ہو جائے

بہت بیتاب ہے دوشِ خزاں اس کے اٹھانے کو
جنازہ رنگ و بو کا باغ میں تیار ہو جائے

محبت میں اشارہ دل سے کسی کو ہوش آتا ہے
وہ دیوانہ نہیں جو خود بخود ہشیار ہو جائے

نظر پر ہو نظر ہنگامِ عرضِ مدعائے دل
خبر کیا ہے پس انکار ہی اقرار ہو جائے

نہ ہو مایوس بے رنگی نہ ہو دلگیر ویرانی
نہ جانے کب چمن میں زندگی بیدار ہو جائے

بُری کیا ہے محبت میں یہ دل کی مصلحت کوشی
کبھی دیوانہ بن جائے کبھی ہشیار ہو جائے

فسونِ حسن و جذبِ عشق دونوں ہی برابر ہیں
یہ ٹکرائیں تو ذہنِ آدمی بیکار ہو جائے

مشامِ روح میں ہیں نکہتیں ان کی جوانی کی
نہ کیوں تخیل اسے تاثیر پھر گلکار ہو جائے

دل کی دنیا تو ہے مانوس جراحت بخشی — ان سے کس طرح تمنائے مداوا کرتے

محبت کی مجبوریاں اللہ اللہ — ستم سہہ رہا ہوں جسے جانتا ہوں

خوشی جاوداں ہے نہ غم دائمی ہے — ابھی نامکمل مری زندگی ہے

ہوئی ہیں مدتیں بچھڑے ہوئے تجھے دل کو — ترا خیال ستاتا ہے بار بار ہنوز

وہ جلوہ گر ہیں اور میں پہچانتا نہیں — کتنا عجیب رنگ مذاقِ نظر ہے آج

دل کہیں ہے سر کہیں نظریں کہیں — بندگی کا یہ بھی اک معیار ہے

ہم بھی پرتو ہیں کسی کی ذات کا — کیوں نہ اپنی ذات کو سجدہ کریں

کون ان میں چھپا ہے عذر یہ کر — میری نظر دل کو دیکھتا کیا ہے

کبھی فغاں کبھی آہیں کبھی تڑپ کبھی اشک — ہزار طرح ترا انتظار کرتا ہوں

ایک آتش کدہ ہے پہلو میں — اپنی دل کی لگی کو کیا کہئے!!

پھولوں کی جوانی سے اے کھیلنے والے — دیکھ ایسے ہی غنچے کہو کہاں کچلے ہیں

یوں بھٹک کے راہِ شوق میں بیٹھے ہوئے ہیں ہم — جیسے کہ انتظار رہا رہنما نہیں ہمیں

گرتی رہیں کسی کی نگاہوں سے بجلیاں
دیکھا کئے کسی کی طرف بار بار ہم

[illegible] کانٹوں سے ہم الجھ ہی گئے — لاکھ دامن بچا بچا کے چلے

تاروں کو سب نے ڈوبتے دیکھا ہے پچھلی شب
دیکھا کسی نے دل بھی ہمارا ڈوبتا ہوا

طوفاں بپا تھا سینہ میں ان کی یاد کے — کشتی ہو فنا ہوا یا ناخدا ہوا

یہ تیرہ زندگی ہے کہ تو جینا زندگی — جینا نہیں ہے [illegible] جا رہا ہوں میں

بھولے سے [illegible] کی [illegible] کا [illegible]

اک عمر کی [illegible] باقی ہے

ہم اپنے آشیاں کی [illegible] — [illegible]

پھر بھی تو ان کی یاد میں [illegible] — [illegible]

وقتِ رخصت کا نہیں لگتا ہے دل — یوں نہ دو مڑ مڑ کے ہمیں دیکھا کریں

طوفاں سے آہ کے شعلوں سے اشکباری سے — بہر طور سہی تجھے ہم بلا کے چھائیں گے

اگر ہے آسودگی کا جویا تو بڑھ کے دو چمن سے آگے

چمن تو ہے خود خزاں رسیدہ چمن سے کیا تازگی ملے گی

جب کوئی بے کلی نہیں ہوتی! — زندگی زندگی نہیں ہوتی!!

جانے کیا رابطہ خاص ہے اس سے — وہ اُفق پہ جو اک ستارہ ہے

کیا لفظِ عشق لب تک لاؤں کہا جاتا ہے — اک حرف سے بھی اکثر افسانہ ہو گیا ہے

وفا کر گئے وہ جو اہلِ وفا تھے — وفا آج کل صرف نقلِ وفا ہے

دل کبھی تا تیر گیا اس ڈھنگ سے ڈوبا اپنا — جس طرح ڈوب کے پھر صبح کو تارے نہ ملے

چاک دامن سیا رفوگر نے — دل کے زخموں کے منہ سئیے ہوتے

عبدالرشید گیاوی

تابش

وطن گیا، پیدائش ۱۹۳۳ء تاریخِ پیدائش یاد نہیں۔

دل شکستہ آ گیا وہ سوختہ جاں آ گیا — تیری محفل میں کوئی پھر پا بجولاں آ گیا

پھر نظارا سامنے جنت بداماں آ گیا — یاد اپنا جب مجھے خوابِ گلستاں آ گیا

میری امیدوں کی دنیا ہو گئی آباد پھر

دامنِ صحرا پہ پھر رنگِ بہاراں آ گیا

رشید تبسم

تبسم

نام رشید تبسم۔ پیدائش سیالکوٹ ۱۹۱۹ء تعلیم ۱۹۳۵ء تک گورنمنٹ ہائی اسکول شملہ میں تعلیم حاصل کی اور بعد ازاں ہربرٹ کالج دہلی میں تعلیم پائی جہاں سے ۱۹۳۹ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ شعر و شاعری کا اوائل عمر ہی سے شوق تھا۔ اور پہلی غزل جب درجہ ہشتم میں تھا کہی۔ شعر و شاعری کے علاوہ اپنی تعلیم کے دوران میں ملکی سیاسیات سے خاص شغف تھا چنانچہ آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا بنیادی رکن تھا۔ صوبہ دہلی کی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا دو سال تک جنرل سکریٹری رہا۔ ہربرٹ کالج کی بزم ادب کا نائب صدر اور ہربرٹ کالج میگزین کا ایڈیٹر بھی رہا۔ صوبہ دہلی کے مسلم لیگی حلقوں میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ اور دہلی میں مسلم لیگ کی مقبولیت میں میری مساعی کو بہت کچھ دخل تھا ۱۹۴۰ء گورنمنٹ آف انڈیا کے سپلائی کے محکمہ میں ملازمت اختیار کر لی مگر بہت جلد محسوس کر لیا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے سپلائی ڈیپارٹمنٹ میں ہندو گردی ہے اور مسلم ملازمین کی حالت ناگفتہ بہ ہے چنانچہ مسلم عمال کے حقوق کی حفاظت کے لئے اسپلائز ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ اس ایسوسی ایشن نے تقسیم ہند سے پہلے مسلم عمال کے حقوق کے لئے بہت بڑا کام کیا جس کا اعتراف خود سردار پٹیل کو بھی کرنا پڑا اس دوران میں میں نے بہت سی قومی نظمیں کہیں اور مسلم لیگ کے شاید ہی کوئی ایسا جلسہ ہو جس میں میں نے اپنی قومی نظم نہ پڑھی ہو خاص طور پر وہ نظم جو میں نے قائد اعظم کی صدارت میں پڑھی جس کے چند شعر یہ ہیں۔

ہم خون سے لیں گے پاکستان ! — ہم جاں کا چڑھانا کیسا جانیں
اب بٹ کے رہیگا ہندوستان ! — ہم بات بنانا کیسا جانیں
ہے مقصد پاکستان اپنا ! — یہ مقصد ہے ایمان اپنا
جان دینا ہے ارمان اپنا — ہم جان چرانا کیا جانیں
اک حکم پہ اپنے قائد کے — ہم جان کو قربان کر دیں گے

ہم خون سے ہولی کھیلیں گے — ہم جان بچانا کیا جانیں

ادبیات اور سیاسیات کے علاوہ مجھے کھیلوں سے بالعموم اور فٹ بال سے خاص دلچسپی رہی ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے جناح فٹ بال ٹورنامنٹ منعقد کیا جس کے سرپرست خود قائد اعظم تھے۔ قائد اعظم نے خود اس ٹورنامنٹ کا افتتاح فرمایا اور اپنے زریں مشوروں سے بھی نوازتے رہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد میری کوششوں سے پاکستان فٹ بال فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا۔ میں نے جناح ٹیم نامی فٹ بال ٹیم کو لے کر برما اور سیلون کا کامیاب دورہ بھی کیا۔"

پاکستان کے مشاعروں میں شرکت کرتا رہتا ہوں۔ آل پاکستان اردو مرکز کا بنیادی ممبر اور ڈائرکٹر آف پبلسٹی بھی ہوں۔ کچھ اشعار درج ہیں۔"

انتخابِ کلام

داستانِ حیات ختم ہوئی — دن نکل آیا رات ختم ہوئی
گلے شکوے تو ہوتے رہتے ہیں — پر یہ سمجھو کہ بات ختم ہوئی
ہم نے سر رکھ دیا ترے در پر — گردشِ شش جہات ختم ہوئی

ہاں مرے ہمرہان تیز قدم — راہبر سست گام سے پہلے
ہائے وہ دل کسی مسافر کا — بیٹھ جائے جو شام سے پہلے
وہ تری محفلیں ہیں یاد اب تک — دعوتِ خاص و عام سے پہلے
کتنا بے کیف سا تبسم تھا — غم کے کیفِ دوام سے پہلے

کارِ محبت اور مجھ سا نہ — کیا بے ادب ہیں اہلِ زمانہ
گر جائیں گر جائیں اشکوں کے گوہر — کتنا لٹے گا غم کا خزانہ
کیسا ستم ہے عنواں نہیں ہے — ہو کوئی قصہ، کوئی فسانہ
خونِ تمنا خونِ تمنا — وہ دشمنی ہو یا دوستانہ
آج ان کے لب پر بھی ہے تبسم — ہے کامیاب اب اپنا فسانہ

مہر و ماہ لرزاں ہیں آدمی کی رفعت سے — اس جہانِ ہستی میں آدمی غنیمت ہے
کل کی بات کیا سوچیں آج کی حقیقت کیا — جتنی بھی گزر جائے جو گزر گئی غنیمت ہے
باوفا کہاں ڈھونڈوں جب وفا نہیں ملتے — اب کسی ستمگر کی یاد ہی غنیمت ہے

حکمت کائنات میں رات ہے کس قدر حسیں
حسنِ چمن کی شوخیاں دامنِ گل پہ سو گئیں

کس کو ملا وہ سنگِ در لیتے ہی کیا آیا نظر
سجدے سے سر اٹھا لیا مست نگاہ کی تری جبیں

دشمنِ دیں تجلیاں رہزنِ جاں ہیں بجلیاں
عرش پہ ہے یا زمیں امن و اماں کہیں نہیں

چشمِ مست ساقی سے دل ہو خراب آباد
اہلِ میکدہ ہم ہیں تو ہر جگہ باد آباد

عیش کوششیں توبہ رنج کوششیں توبہ
کس قدر مقید ہے تیرا بندۂ آزاد

سینۂ تبسم میں تیر کر دیا پیوست
عشق خانماں برباد ساختہ آباد

ہماری گردشِ تقدیر سے ملا ہم کو
وہ کارواں کہ جسے میرِ کارواں منزل

ہم اپنی گردشِ تقدیر پہ بھی شاکر ہیں
اب اور گردش ایسی نہ ہو کہ بربادی

پیشِ دو عالم کی حقیقت تمام ہو تو سہی
کوئی نظام ہو لیکن انتظام ہو تو سہی

ابھی سے ختم ہوا جا رہا ہے جشن کا دن
شبِ فراق کا قصہ تمام ہو تو سہی

وہ اپنی جاں سے گئے ہائے انتظار نہ ہو
دلِ سکوں طلب اتنا بھی بے قرار نہ ہو

ہنوز چھپائے چھپا نہ ہنسوں کے غبار
یہ رات ہے تو سحر آنے کا رکیا ہوگی

یوں گناہوں کی سزا دیتی ہے رحمت تیری
رونقِ بزمِ جہاں آہ لغزشِ آدم سے ہے

تم نے کیا افسانۂ الفت میں دکھلایا کمال
ابتدا بھی ہے تمہیں سے انتہا بھی تم سے ہے

محمد تراب خاں

تراب

طبیعت میں آزادی اور رفعت سے نوازا
انداز ضبط کی ترتیب سے ہم آشنا ہیں

زندگی سے ہے ذوق بندگی سے
دل کو حسن کی سب خوبیاں معلوم

تسلیم — فیض الرحمٰن خواجکزئی

نام فیض الرحمٰن تاریخ و سنہ پیدائش یاد نہیں۔ جب سن شعور کو پہنچا۔ تو خود کو شاعر پایا۔ وہ دن اب تسلیم تخلص کرتا ہوں۔ اور مختصر تسلیم ادبی نام ہے۔

میرے ہونٹوں کی ہنسی لیکر مجھے غم دے دیا
میرا سب کچھ لے لیا کیا اور بھی کچھ چاہیئے؟

تمنا — عبدالقیوم گوالیاری

میرا نام عبدالقیوم اور تخلص تمنا ہے شرف تلمذ حضرت شفا گوالیاری سے حاصل ہے شعر و شاعری سے بچپن سے شوق تھا۔ ادبی ماحول نے مجھے ترقی کرنے کا موقع دیا۔ اور حضرت شفا کی نوازشوں سے ادا سے کسی حد تک مکمل کر دیا۔ گوالیار کا رہنے والا ہوں۔ حالات نے اوکاڑہ کینٹ کا ہو رہا اور آجکل یہیں مقیم ہوں طرحی مشاعروں میں شرکت کرنے کا شوق رہتا ہے اپنی چند طرحی غزلوں کا انتخاب پیش کرتا ہوں

متفرق اشعار

مسکرا کر دیکھنے والے خبر بھی ہے تجھے — بجلیوں کے حوصلوں کو تو نے پسپا کر دیا

تاریکیوں میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں تجھے
تاروں کی انجمن سے ذرا جگمگا کے دیکھ

رشک قسمت شب غم میری خاطر — ستارے جاگتے ہیں آسماں پر
آرزو اور آرزو بھی آپ کی — کفر ہے پھر اجتناب آرزو

نمبر

عبدالکریم اچھروی

حالات جو چھپنے کے لئے لکھے جائیں۔ اُن میں خواہ مخواہ ایک بناوٹ سی پیدا ہو جاتی ہے اور آپ کا فرمان ہے کہ رودادِ حیات خود لکھوں۔ ۱۹۰۰ء میں اچھرہ لاہور میں پیدا ہوا صغیر سنی میں ہی والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکا ابتدائی تعلیم کے بعد ریلوے کے محکمہ سے منسلک ہو گیا حکمت اور عربی۔ فارسی کی تعلیم بعد میں ہوئی میں ایک غریب لیکن شریف گھرانے کا فرد ہوں۔ میں خود گر (SEEFMADE) ہوں میں نے اپنے نام اور کام کی کبھی تشہیر نہیں کی۔ اگر میں پروپیگنڈا کے فن سے واقف ہوتا تو لاتعداد حزف ریزے جو ہزاروں کے بازار کی زینت نہ ہوتے اور نہ ہی انمول گوہر خاک کے تودوں میں پامال ہوتے میری خودداری نے کمزوری کی حد تک محدود کر رکھا ہے ادبی ذوق اور تخلیق شعر کا جذبہ فطرت سے عطا ہوا جو عمر کے ساتھ ساتھ ترقی پذیر ہوتا رہا۔ میری شاعری کی ابتدا پنجابی زبان کی شاعری سے ہوئی لیکن اس ذوق کی تکمیل اُردو شعر نے کی ہے

میں نے خود شعر کہنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ البتہ جب کبھی خود شعر نے ضرورت محسوس کی کہ میرے قلم سے نکلے تو مجھے بھی تیار دست بستہ پایا۔ ع "شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما"

میں نے زیادہ مسلسل غزل کہی ہے۔ میرا مطمح نظر شاعری میں حقائق و معارف انسانیت کا ارتقا اور سیاست و قیادت پر تنقید رہا ہے شعر سے ملک و ملت کی نوع انسان اور اسلام کی خدمت میرا مقصود رہا ہے۔

ثنائے سرورِ عالم ستائشِ اسلام   مری نگارشِ پیہم کا ہے یہی مقصود

میرا قلم مسلمان ہے۔ اور میرا ایمان ہے کہ قلم کی طاقت کے اظہار پر میں خدائے عز و جل کی بارگاہ میں جواب دہ ہوں۔ ترقی پسندی اور دیگر قسم کی شاعری میرے فن کا رنگ نہیں۔ میرے نزدیک شاعری ذریعہ پیغام ہے۔ میرے فکر و نظر کا معیار کتاب و سنت ہے۔ میں دنیا کی ہر شے کو اسی زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اسی طرز پر سوچتا ہوں۔ اور جو چیز اس معیار سے گری ہوئی نظر آتی ہے۔ اس پر بے خوف تنقید کرتا ہوں۔ میرے طنز سے ارباب قیادت و سیاست کی ناکھول

پر نشیب میں نمودار ہو جاتی ہیں لیکن میرا قلم نہ رکا ہے۔ اور نہ رکے گا۔ میری طبیعت بے نیاز ہے میں کسی لالچ اور فریب میں نہیں آ سکتا۔

میرا پہلا مجموعۂ کلام "کاخِ بلند" جو ۱۹۴۷ء میں تاج کمپنی لاہور نے شائع کیا تھا۔ اربابِ فکر و نظر کو دعوتِ غور و فکر دے چکا ہے۔ اب دوسرا مجموعۂ کلام مرتب کر رہا ہوں اور توقع ہے کہ بہت جلد شائع ہو جائے گا۔

کسی شاعر کے لیے اس کے اپنے اشعار کا انتخاب آسان نہیں ہوتا۔ اور خصوصاً مجھ سے تو اپنے اشعار کا انتخاب بہت ہی مشکل ہے۔ بہرحال سرسری مطالعے سے جو اشعار سامنے آ گئے ہیں۔ وہی لکھ رہا ہوں۔

پہلے مٹ جانا کسی پر شرط ہے — پھر عطا ہوتی ہے عمرِ جاوداں

عزم، ہمت، قوت، بازو، محبت، اتحاد — ان عناصر سے مرکب ہے قوامِ زندگی

جلاؤں حسن کے سینے میں آرزو کے چراغ — ضمیرِ عشق میں پیدا نئے شرار کروں
شعارِ تازہ کو بخشوں میں آب و رنگ نیا — رسومِ کہنہ کے دامن کو تار تار کروں

فلک بھی ہے تیرا ستارے ہیں تیرے — یہ صبح و مسا کے نظارے ہیں تیرے
یہ شبنم، یہ گلشن، یہ خزاں، یہ بجلی — میں سب جانتا ہوں اشارے ہیں تیرے

خود نگہداری چاہی مٹ گیا — لوگ کہتے ہیں مگر مغرور ہے

تیرا تخیلِ آرزو شاید مگر — جل کے پھر تازہ شرر پیدا کرے

خودی مقامِ ثریا خودی ستودہ صفات — خودی میں نعرۂ منصور کا جو راز رہا
خودی سے کھل جائیں گے تقدیرِ عالم کے رموز — تم ذرا کاکلِ جہاں کو پریشاں کر دو

ہے میرے روحِ ثبات پر نیابت بھی خلافت بھی — براہِ راست ہوں میں عکسِ فطرت کا نمائندہ

جہانِ عشق میں ہموار و زبوں ہیں — دلِ شاعر کا سوزِ اندروں ہیں
مجھے تیری حضوری کی تمنا — خداوندا خدائی کیا کروں میں

تیری نظر کے فیض سے گلشن ہے شاد کام — جانِ بہار دعوتِ صحرا بھی کر قبول
ہے مجھ کو بھی آرزو ایسی نماز کی — صف بستہ اک قطار میں ہوں خواجہ و غلام
ہر بوند جس کی چشمۂ حیواں کا ہو جواب — دنیا کو وہ شرابِ محبت پلائیں ہم
شوق کرتا ہے ہمیشہ خونِ شہ رگ سے وضو — عشق پڑھتا ہے شمشیروں کے سائے میں نماز

جب مذاقِ دید سے محمود ہوگا آشنا ۔۔۔ اور بڑھ جائے گی کچھ تابانیٔ حسنِ ایاز

پابندِ علائق ہو جاتا غیرت یہ گوارا کرتی کیا ۔۔۔ تو میری خودی کو سمجھا غلط مغرور نہیں خوددار ہوں میں

مری جبیں کا ستارا چمک اٹھا ہے ثمر ۔۔۔ حضورِ سرورِ عالم کی چوم کر دہلیز

تیری نظر میں دولتِ افرنگ کا شکوہ ۔۔۔ لیکن کبھی تو جلوۂ فاراں پہ غور کر

کرگس ہو آسماں کی فضاؤں میں پرکشا ۔۔۔ شاہیں ہو زیرِ دام تعجب کی بات ہے

کرے گا کون نیابت تری زمانے میں ۔۔۔ تمہیں جو محفلِ کونین سے اٹھائے گئے

دنیائے محبت کی تقدیریں بن بن کے بگڑتی جاتی ہیں
جب اس میں تمہارا ہاتھ بھی ہو پھر چپ ہی رہے کوئی کیا کہیے

کچھ لوگ ابھی اس محفل میں منصور سے ہم سے بیٹھے ہیں
جب دل ہی انا الحق کہہ بیٹھا پھر دار و رسن کو کیا کہیے

وہی کریں گے یہاں دل کی بستیاں آباد ۔۔۔ جنہوں نے عہدِ وفا کی اٹھائی تھی تمہید

تجھے سعادتِ دارین ہو نصیب ثمر ۔۔۔ حضورِ خواجۂ کون و مکاں کی کر تقلید

لذتِ صبحِ محبت کی ہے تلاش مجھے ۔۔۔ سکوتِ شب کی فضاؤں میں زندگی پا کر

گلشن تو ان کی یاد میں شاداب ہے ثمر ۔۔۔ پھر بھی نہ [illegible]



محمد شریف جالندھری

نام : محمد شریف ۔ تخلص : ثمر ۔ وطن : جالندھر

[illegible] جالندھری [illegible] تعلیم [illegible] اور [illegible] تک پائی ۔ دوران تعلیم [illegible] ویکلی لاہور میں شائع ہوئی [illegible] اور ایک [illegible]

نہ تھا جتنا آج ہے۔ اس لئے شاعر کی قدر و منزلت بھی ہوتی تھی۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں سفر شروع کیا۔ اس سفر کے محرک چند ایسے ہی واقعات تھے جن کا ذکر چنداں مفید نہیں، البتہ ایک ضد کی بنا پر سفر اختیار کیا۔ مختصرہ ہندوستان کا کونہ کونہ چھان مارا، عروس البلاد بمبئی پہنچا تو تھوڑی تھوڑی مدت کے لئے دو ہفت ناموں اور ایک ماہنامہ کی ادارت کی، سنہ ۱۹۴۰ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک پونہ میں رہا۔ نظم کے ساتھ نثر کا شوق بھی بڑھا۔ علمی ادبی اور مذہبی مضامین لکھے اور ملک کے پرچوں نے امتیاز سے شائع کئے۔ شعر کہے اور شائع ہوئے۔

کئی انجمنوں کا صدر، نائب صدر، ناظم نشر و اشاعت اور سکریٹری و خازن رہا، باقاعدہ طور پر کسی کی شاگردی قبول نہیں کی اور اس کمزوری کا احساس آج تک ہے۔ ابتداء میں آغا صبا مرحوم سے مشورے لئے۔ پھر متفرق اساتذہ سے استفادہ کا موقع ملا۔ میراجی مرحوم نے "ادبی دنیا" کی ادارت کے زمانہ میں اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازا۔

سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کے مختلف گوشوں میں گھومتا رہا مگر سکون کہیں نصیب نہ ہوا، فسادات نے مجھے بھی عام لوگوں کی طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اور پاکستان کو دارالامان سمجھ کر یہاں آباد ہو گیا۔

راولپنڈی سے 'گرداب' جاری کیا۔ لاہور میں "اتحاد کمیٹی" کی بنا ڈالی، پھر راولپنڈی میں "ادارۂ فنکار" قائم کیا۔ کئی بیرونی پرچوں کو اعزازی طور پر ترتیب دیا کرتا ہوں۔ جو لکھتا ہوں وہ شائع ہوتا ہے۔

اشعار کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ افسانوں اور علمی و ادبی مضامین کے مجموعے بدستور موجود ہیں۔ اس لئے کہ میری طبیعت ازلی اور ابدی طور پر کچھ پردہ دار واقع ہوئی ہے۔ اور میں ناشرین اور ابن الوقت قماش کے دوسرے لوگوں کی خوشامد سے گریزاں ہوں۔

میرے افسانوں کے متعلق نقادوں اور فنکاروں نے بہت کچھ لکھا ہے میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ شاعر کم اور افسانہ نگار زیادہ ہوں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ شاعر کی حیثیت سے ہی ان حالات و واقعات کی عکاسی سے قاصر تھا جو وقتاً فوقتاً میرے سامنے آئے، جن میں سے مجھے میرے احباب اور میرے عزیزوں کو گذرنا پڑا۔ بہرحال میں نے شعر کہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

جوش آگیا ہے رحمت پروردگار میں — کیا ایسی بات تھی نگہ شرمسار میں
ہم فقط وعدۂ دیدار پہ قربان ہیں مگر — جن کو دیدار میسر ہے وہ کیا کرتے ہیں

اب آباد کر، چاہے برباد کر دے — مرا دل نہیں ہے ترا آستاں ہے
سنبھال اپنی نظریں، سنبھال اپنی محفل — ترا نام لے کر اٹھا چاہتا ہوں

پیدا ہے چمن ایک میرے دیدۂ تر سے — گر ابر کو توفیق نہیں ہے تو نہ برسے

بیٹھی نظر میں دل کا مول — دل کیا، اک مستی کا ڈول
دینے والے تیرے صدقے — بھر دے میرا بھی کشکول

گو شوق نے کر دیا حالت کو تباہ — اب تک وہ کہہ رہا ہے صنعت گیا
دیدار کی احتیاج اوروں کو ہے — کافی ہے مرے واسطے بس ایک نگاہ

گلشن بدوش حشر بداماں لئے ہوئے — وہ آرہے ہیں بن کے نسیم بہار آج

اللہ کس خطا پہ سزا یہ ملی مجھے — پایا نہیں سب نے شادی سے کبھی مجھے

ہیں شادی و غم سے مبرا نہیں ہوں — ہوں انسان کوئی فرشتہ نہیں ہوں

خود جا رہی ہے کشتی مرکز کی طرف اپنی — بہتا ہوا پانی ہے کھینچے ہوئے ساحل تک

آ رقص کریں زہرہ و انجم کی طرح — کھل جائیں گل و باغ و ترنم کی طرح
آ جا چاند کی کرنوں میں سمائیں اے دوست — اس نور میں بہہ جائیں تلاطم کی طرح

کوئی مے نوش نہ ہوگا ترے مے نوشی کے بعد — تیرے مے نوش سے پہلے کوئی مے نوش نہ تھا
تعلق سے انسان انسان سے — نہ ہو یہ تو سمجھو خدا ہو گیا
اٹھا رہا ہوں حقیقی مواصلت کے مزے — کسی کا در ہے میرے جگر ہے ہم آغوش



محمد حمید خاں

نام۔ محمد حمید خاں تخلص ثنا۔ وطن:۔ ریواڑی ضلع حصار۔ (مشرقی پنجاب)
تاریخ پیدائش ۱۹۱۱ء

نمونہ کلام:

پرسش حال دل زار تک آپہونچے ہیں — منحرف عشق کے معیار تک آپہونچے ہیں
کل جنہیں بات بھی کرتے ہوئے شرم آتی تھی — آج بیباکی گفتار تک آپہونچے ہیں

جاوید

فریدہ جاوید

سنِ پیدائش ۱۸۔ اپریل ۱۹۲۷ء - وطن سہارنپور

اپنے ابتدائی زمانۂ طالب علمی سے مجھے شاعری سے ایک والہانہ مناسبت رہی ہے اِس دور میں مجھے احساسِ جمال ضرور تھا لیکن جمالیاتی شعور پیدا نہیں ہو سکا تھا۔ آج تک اپنا تمام وقتِ عزیز میں نے اپنے ذہن کی اسی تہذیب اور عرفانِ حسن کے لئے مسلسل و پیہم وقف کر رکھا ہے، اور اب یہی شغف میری زندگی کا مقصد ہو کر رہ گیا ہے میں زیادہ تعداد میں شعر نہیں کہہ سکا ہوں پھر بھی مجھے کوئی احساسِ زیاں نہیں بقول عرفی

شائستہ ہست ار کہ نبیند دو بیں شہر
شائستگیِ جنس چہ بسیار و چہ کم را

نمونۂ کلام:

کیا کیا ذکر دورِ الم کے / بیت گئے اور یاد نہ آئے
دل نے کیا کیا ستم سہے جاوید / دل ہے کتنی لطیف و نازک شے

دنیا دھیما سہی اُٹھتے ہوئے انفاس کا راگ
ایک آواز تو ہے دل کے بہلنے کے لئے

ہمیں حیات سے پہلے پیامِ مرگ آیا / بقدرِ شوقِ تبسم کلی کھلی ہی نہیں
جلوہ فشاں تھا آفتاب آپ کا انتظار تھا / آپ کا انتظار ہے ڈوب رہا ہے آفتاب
زندگی کو بہت عزیز ہوں میں / ڈھونڈ لیتے ہیں حادثات مجھے

جری ☆ مرزا دلاور بیگ چغتائی

دنیائے ادب مجھے ابوالحمید جری ہوشنگ آبادی کے نام سے جانتی ہے۔ لیکن میرا نام مرزا دلاور بیگ چغتائی ہے۔ ابوالحمید میری کنیت اور جری تخلص ہے۔ والد بزرگوار کا اسم گرامی میرزا امراؤ بیگ چغتائی ہے۔ میری تاریخ ولادت ۲۵ دسمبر ۱۹۱۵ء ہے۔ اور وطن ہوشنگ آباد ہے جو کہ ہندوستان کے صوبہ متوسط و برار کا ایک ضلع ہے۔ خاندان کا موجودہ ذریعہ معاش سرکاری ملازمت و تجارت ہے۔ اور آبائی پیشہ سپہ گری تھا۔ جس کی آخری کڑی میرے جد امجد مرزا رستم علی بیگ قلعہ دار قلعہ ہوشنگ آباد تھے۔

اردو پرائمری کی تعلیم میں نے مقام ہرودہ ضلع ہوشنگ آباد میں حاصل کی۔ اور انگریزی تعلیم (بذریعہ ہندی) سیونی مالوہ ضلع ہوشنگ آباد سے پاس کی پھر دو برس تک (بذریعہ اردو) گورنمنٹ ہائی اسکول ہوشنگ آباد میں پڑھا۔ اور بعد ازاں چند خانگی و مالی مجبوریوں کے باعث انگریزی تعلیم منقطع کر کے تین سال تک گورنمنٹ اردو نارمل اسکول امراؤتی میں مدرسی کی تعلیم حاصل کی۔ اور پھر جبل پور میں بحالت مدرسی پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انٹرمیڈیٹ کی پرائیویٹ تیاری کی لیکن ۱۹۳۹ء کی جنگ کے اثرات و گرانی کے باعث آئندہ تعلیم کے عزم کو خیرباد کہنا پڑا۔ اور آمدنی بڑھانے کی غرض سے جبل پور ہی میں چند ماہ آرڈیننس ڈپو اور ساڑھے تین سال تک فوج میں مدرسی کی لیکن ... وردی کو ٹھیس لگنے کا وقت آیا تو اس ملازمت کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ اور فوج سے علیحدہ ہوتے ہی ریلوے میں ٹکٹ کلکٹر ہو گیا لیکن اس ملازمت کے ماحول کو میری فطرت نے ابھی تک قبول نہیں کیا ہے۔ اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ اسے کب خیرباد کہنا پڑے۔

مجھے ذوق شعر گوئی لڑکپن سے ہے۔ پرائمری تعلیم کے زمانہ میں یہ ذوق بشکل بیت بازی پرورش پاتا رہا لیکن باقاعدہ طور پر اس کا ظہور بصورت نظم ۱۹۳۰ء سے ہوا جس وقت سے میں نے ہوشنگ آباد کے مشاعروں میں شرکت شروع کی۔ اردو نارمل اسکول میں یہ ذوق اور نکھرا جس کا مولوی محمد سلیم صاحب ناظم کاکوری مقیم دیباچہ نے وقتاً فوقتاً داد دے کر بڑھایا ان

جبلپور میں سنہ ۱۹۴۳ء میں محترمی ابوالفاضل محمد صادق صاحب رازؔ چاندپوری مدظلہٗ کے توسط سے علامہ سیمابؔ اکبرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کا حلقہ بگوش ہو گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہ نسبت علامہ سیمابؔ کے میں نے حضرتِ رازؔ سے زیادہ فیض حاصل کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو علامہ موصوف سے دوری اور حضرت رازؔ سے قرب تھا۔ اور دوسری وجہ خود علامہ کی اجازت تھی جو انہوں نے میرے اور حضرت رازؔ کے خواجہ تاش بھائی ہونے کی وجہ سے دے رکھی تھی۔ اسی لئے میں حضرت رازؔ کو اپنا استادِ ثانی تصور کرتا ہوں۔

سیمابؔ لٹریری سوسائٹی جبلپور کا سنگ بنیاد ۲۵ دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء کو ناخدائے سخن حضرت نوحؔ ناروی مدظلہٗ کے دستِ مبارک سے میری ہی کوششوں کے باعث رکھا گیا حتیٰ کہ جب مدیر شاعر آگرہ حضرت اعجاز صدیقی صاحب نے بحیثیت چیف سکریٹری ہندوستان کی تمام سیمابؔ لٹریری سوسائٹیوں کا باہم موازنہ کیا تو جمشید پور کی سوسائٹی کو پہلا اور جبلپور کی سوسائٹی کو دوسرا درجہ عطا فرمایا۔ اور باقی تمام سیماب لٹریری سوسائٹیوں کو ان دونوں کی تقلید کا مشورہ دیا۔

میری شاعری کسی اور کے لئے کارآمد و مفید ہو یا نہ ہو لیکن میرے لئے ضرور مفید ثابت ہو چکی ہے اور وہ اس طرح کہ میری موجودہ ملازمت یعنی ٹکٹ کلکٹری کے مقابلہ و انتخاب کے موقع پر افسرانِ متعلقہ کو میرے تخلص کی وجہ سے میرے شاعر ہونے کا علم ہو گیا۔ اور ان کی فرمائش پر مجھے انٹرویو میں اپنی ایک نظم "دعوتِ اتحاد" سنانی پڑی جس کو سن کر وہ لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ مجھے انٹرویو میں اتنے نمبر دیئے کہ منتخب شدگان کی فہرست میں میرا نام سرِ فہرست پہنچ گیا۔ (اس کا تذکرہ جناب توکل حسین صاحب ایم۔ اے۔ ڈبائیوی رسالہ شاعر آگرہ کی دسمبر سنہ ۱۹۴۴ء کی اشاعت میں کر چکے ہیں)

میں نظم اور غزل دونوں کہتا ہوں۔ اور کبھی کبھی نثر بھی لکھ لیا کرتا ہوں۔ نظم میں اظہارِ خیال کے لئے زیادہ وسعت و آسانی پاتا ہوں۔ پھر بھی غزل ہی زیادہ کہا کرتا ہوں۔ اور وہ اس لئے کہ اگر غزل کا وش و فکر سے کہی جائے اور حقیقت کی ترجمانی کی جائے تو اس کا ہر شعر ایک نظم مکمل ہوتا ہے۔ پہلے میری غزلوں میں عشق۔ حسن۔ محبت اور محبوب کا ذکر خیر ہوا کرتا تھا۔ لیکن جب سے مہاجر خانہ بدوش ہوا ہوں تو آپ بیتی اور جگ بیتی بیان کرنا ہی غزل گوئی سمجھتا ہوں۔ اور جب اس طرح دل کا غبار ہلکا کر لیتا ہوں تو سکون سا محسوس

کرتا ہوں۔ میرا مجموعۂ کلام "گلِ الوہیہ" اشاعت کو ترس رہا ہے۔

"قیاس کُن ز گلستانِ من بہارِ مرا"۔

محبت میں زمانہ بھر سے جو بیگانہ ہوتا ہے
اُسے دیوانہ کہتے ہو وہ کیا دیوانہ ہوتا ہے

شریکِ دور جب خود ساقیٔ میخانہ ہوتا ہے
دوبالا پھر تو لطفِ لغزشِ مستانہ ہوتا ہے

وہ میکش جو مریدِ ساقیٔ میخانہ ہوتا ہے
وہی تو بے نیازِ شیشہ و پیمانہ ہوتا ہے

اُسی کا حق ہے سچ پوچھو تو معراجِ محبت بھی
جو محفل میں شریکِ قسمتِ پروانہ ہوتا ہے

شکستیں کھا چکا سو بار پھر بھی دل مرادل ہے
کہ یہ اب بھی حریفِ جلوۂ جانانہ ہوتا ہے

محبت جلوۂ حق ہے محبت پرتوِ حق ہے
محبت کیش دیوانہ نہیں فرزانہ ہوتا ہے

قیامت ہے جری کی تیرا جری کیا محروم رہ جائے
کرم ایسا کہیں ملے ساقیٔ میخانہ ہوتا ہے

یہ زندگی ہے کوئی روحِ زندگی نہ رہی
حریفِ ہوش و خرد تھی جو بے خودی نہ رہی

تغیراتِ زمانہ کی انتہا یہ ہے
کہ دوستوں کے دلوں میں بھی دوستی نہ رہی

حریمِ حسن کے اسرار کھل گئے شاید
نگاہِ شوق کو اب فکرِ آگہی نہ رہی

بدل گیا ہے کچھ ایسا نظامِ میخانہ
کہ میکشی بھی حقیقت میں میکشی نہ رہی

کہاں وہ فکرِ نشیمن کہاں وہ ذکرِ چمن
چھٹے قفس سے تو پرواۓ زندگی نہ رہی

فضا ہے دھوئیں تاریک تو تعجب کیا
چراغِ خانۂ دل میں ہی روشنی نہ رہی

غمِ حیات ہی سب کچھ ہے اب جری کیلئے
خوشی کا کیا ہے ٹھکانہ رہی رہی نہ رہی

قطعات

غلط کہ گردشِ لیل و نہار نے مارا
قسم خدا کی ہمیں اعتبار نے مارا
فریب دے گیا ہم کو پیامِ آزادی
قفس سے لا کے چمن میں بہار نے مارا

جبیں در پر ترے ہم نے بُت نامہرباں رکھدی
تو اب یہ اُٹھ نہیں سکتی جہاں رکھدی وہاں رکھدی
خدا کو چھوڑ کر اے بت ترے در پر رکھا ہے سر
ذرا تو غور کر کیا چیز تھی ہم نے کہاں رکھدی

جلیل قدوائی

۱۶ مارچ ۱۹۰۴ء کو بمقام اناؤ (اودھ) ہندوستان پیدا ہوا۔ ۱۹۲۱ء میں اناؤ سے ایس۔ایل۔سی کا امتحان پاس کیا اور اسی سال علی گڑھ چلا گیا۔ جہاں سے ۱۹۲۵ء میں بی۔اے کی ڈگری لی۔ طالب علمی کے دوران میں علی گڑھ میگزین (اردو) کی ادارت میرے سپرد رہی۔ بی۔اے کرتے ہی مولانا ظفر الملک علوی کی تحریک پر رسالہ الناظر سے متعلق ہو کر لکھنؤ چلا گیا۔ چند ماہ بعد علی گڑھ واپس گیا اور قانون میں داخلہ لے لیا۔ مگر میں قانون کا امتحان پاس نہ کر سکا۔ میں نے ۱۹۳۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔اے (اردو) کلاس میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۳ء میں ایم۔اے کی ڈگری اول درجہ میں حاصل کر کے پھر علی گڑھ واپس ہوا اور شعبۂ اردو میں لکچرار مقرر ہوا۔

یکم مئی ۱۹۳۷ء کو خان بہادر سید نجم الدین احمد جعفری نے مجھے سابق گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمہ اطلاعات میں جس کے وہ ڈپٹی ڈائرکٹر تھے سرکاری اخبار نویس اور اردو و ہندی زبانوں کے شعبہ کا انچارج بنا کر بلا لیا اور دہلی و شملہ مستقر قرار پائے۔ ۱۹۴۰ء میں اسی محکمہ میں اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر کا عہدہ ملا۔ جنوری ۱۹۴۶ء میں مرکزی حکومت کے اس صیغہ کو لاہور منتقل کر دیا گیا اور تقسیم ہند سے تقریباً ایک ماہ قبل تک میں وہاں رہا۔ اس زمانے میں مجھے اپنی والدہ کے انتقال اور بعض دیگر خانگی وجوہ سے دہلی میں رہنا پڑا۔

۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو واپس کراچی ہوا اور انفارمیشن آفیسر مقرر ہوا۔ ابتدائے ۱۹۴۹ء میں چند ماہ وزارت داخلہ و اطلاعات میں سکرٹری پبلسٹی پلاننگ بورڈ بھی رہا۔ اب سنہ ۱۹۵۰ء سے اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمہ مطبوعات ہوں۔

میرا سابق وطن اناؤ (اودھ) کے قدیم مردم خیز اضلاع میں شمار ہوتا ہے جس نے چند نہایت بلند پایہ شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ اسی ضلع کو مولانا حسرت موہانی مرحوم کی جائے پیدائش ہونے کا فخر حاصل ہے۔ مشہور مورخ اسلام جسٹس سید امیر علی کے خاندان کی اقامت بھی قصبہ موہان میں تھی۔ حضرت غالب کے شاگرد اور فارسی کے مشہور شاعر جناب ولایت علی عزیز مرحوم قصبہ صفی پور کے متوطن تھے۔ جسٹس سید محمد رضا (والد ماجد سید ہاشم رضا و آل رضا صاحبان) کی

ضلع کے قصبہ نیوتنی کے رہنے والے تھے۔ میرے طالب علمی کے زمانے میں چودھری جگت موہن لال رواں آنجہانی نے جو اناؤ کے قصبہ موراواں کے باشندے تھے اردو شاعری بالخصوص رباعیات لکھنے میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ حضرت آثر لکھنوی اور جناب جگر مرادآبادی ان دنوں اناؤ میں مقیم تھے۔ جگر کی وجہ سے اصغر صاحب بھی اناؤ آتے۔ حضرت عزیز لکھنوی رواں اور آثر کے استاد بھی لکھنؤ کے قرب کی وجہ سے اناؤ آتے رہتے تھے غرض کہ فی الجملہ اناؤ میں علم، ادب اور شعر و شاعری کا خوش گوار ماحول تھا۔

میرے خاندان میں بھی علمی روایات موجود تھیں۔ بالخصوص خان بہادر قاضی نذیر احمد قدوائی مرحوم (جو میرے حقیقی پھوپا اور چچا تھے) کو شعر سے خاص لگاؤ تھا۔ ان کے پاس بعض مشہور و معیاری رسالے دیکھنے اور پڑھنے کو ملے۔ پھر تذکرۃ الصدر شعرا کی صحبتیں نصیب ہوئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ پہونچنے سے بہت پہلے میں چھٹے درجہ ہی سے شعر گوئی کا مذاق پیدا ہو گیا تھا۔

علی گڑھ پہونچنے کے بعد مسیح تقی وحید صاحب یلدرم مرحوم اور مولانا احسن مارہروی مرحوم نیز پروفیسر خواجہ منظور حسین صاحب کی حوصلہ افزائی سے میری شاعری کو نئی زندگی ملی خواجہ مسعود علی ذوقی بھی جو میرے ہم جماعت تھے۔ میری شاعری کو پروان چڑھانے میں بہت مساعی ہوئے اگرچہ میں نے نظمیں بھی لکھیں مگر واقعہ یہ ہے کہ طبیعت کو جو لطف غزل کہنے میں ملا نظم نگاری میں نہ ملا۔ علی گڑھ میں مولانا حسرت کی شاعری کی روایات پہلے سے موجود تھیں۔ اس زمانے میں اقبال فانی اور اصغر کا سکہ رائج تھا۔ جگر کی شاعری کے قدم ابھی پورے طور سے جمنے نہ پائے تھے۔ میری طبیعت نے فانی کی "یاسیات" کا اثر بالکل قبول نہیں کیا اور شاید نہ کرتے۔ اپنے ساتھ لائے ہوئے تاثرات کی بنا پر حسرت ہی کا انداز اپنے لئے منتخب کر لیا۔ اصغر کی شگفتگی و تازگی نے بھی شاید کسی حد تک متاثر کیا اسی طرح اقبال کا اثر بھی ان کی "بانگ درا" میں شامل شدہ غزل تک محدود رہا اگرچہ اب میں ان کی "بال جبریل" کی غزلوں کا بے حد معترف ہوں۔ بہرحال علی گڑھ کے زمانے کا سارا مجموعہ "نقش و نگار" کے نام سے ۱۹۳۲ء میں کتابی شکل میں شائع ہو چکا

مندرجہ بالا سطور سے ظاہر ہو چکا ہے کہ مجھے شاعری میں کسی سے تلمذ نہیں رہا لیکن مولانا حسرت کا رنگ سخن مرغوب تھا [illegible] کلام توجہ سے پڑھا [illegible] اور اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔

میں نے کچھ فیض ہر اُستاد سے پایا ہے جلیلؔ
تب کہیں جا کے میسر ہے سخن داں ہونا

علی گڑھ کے دورانِ قیام میں میں نے بہت سے افسانے بھی لکھے جن کے مجموعے "سیرِ گل" اور "اصنامِ خیالی" کے نام سے شائع ہوئے۔ ان افسانوں کی شکل میں روسی افسانوں کے طرز پر اردو میں پہلی بار "زندگی کی لاشعور" پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایک ڈرامہ ترجمہ کیا، جو "موتی دانا" کے نام سے چھپا۔ ان کے علاوہ مولانا حسرت موہانی کے کلام کا انتخاب کیا اور اس پر مقدمہ لکھا جسے "انتخابِ حسرت" کے نام سے جامعہ بک ڈپو دہلی نے کتابی صورت میں شائع کیا۔ الٰہ آباد کے دورانِ طالب علمی میں ہندوستانی اکیڈمی کی فرمائش پر میر و سودا کے ایک معاصر میر محمدی بیدار دہلوی کا دیوان مرتب کیا اور اس پر مقدمہ لکھا۔ یہ کتاب "دیوانِ بیدار" کے نام سے اکیڈمی مذکور نے شائع کی۔ تقسیمِ ہند سے کچھ دن قبل ایک رسالہ "اپنی امی کی یادیں" کے نام سے اپنی والدہ ماجدہ کی وفات سے متاثر ہو کر احباب میں تقسیم کرنے کی غرض سے شائع کیا تھا۔ یہاں سے اپنی زندگی میں بہت سے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان کے مجموعے زیرِ ترتیب ہیں۔ "نقش و نگار" کی اشاعت کے بعد کا کلام "نوائے سینہ تاب" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

مگر سچ یہ ہے کہ شعر و ادب کی خدمت گذاری بہت بڑا کام ہے اور جو کچھ کرنا چاہتا ہوں اب تک نہیں کر پایا۔ سرکاری ملازمت نے بیکار کر دیا ہے۔ ادبی کام پورا وقت چاہتا ہے جو سر دست میسر نہیں۔ ارادے بڑے بڑے ہیں۔ شاید ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق نصیب ہو۔ اس دن کا بڑے ذوق و شوق سے انتظار ہے جب اپنی پوری زندگی شعر و ادب کے لیے وقف کر سکوں گا۔

ابرِ بہار

اٹھ رہی ہے سمتِ مشرق سے گھٹا مستانہ وار — پھیلتا جاتا ہے تا حدِّ نظر ابرِ بہار
چھا رہا ہے پردۂ ابریشمیں آسماں — چل رہی ہے کوہساروں میں ہوائے خوشگوار
وادیوں میں ہر طرف چھائی ہوئی ہے خامشی — کس قدر وجد آفریں ہے یہ سکوتِ کوہسار
جلوہ دکھلاتی ہے اپنا پھر زبانِ سحاب — تو عروسِ برق ہے دخترِ ابرِ بہار
ذرہ ذرہ میں نظر آنے لگی ہے تازگی — انبساطِ روح سے لہرا رہا ہے سبزہ زار

کالی کالی یہ گھٹائیں، موجزن آبِ رواں
بھینی بھینی یہ فضائیں مایۂ صبر و قرار
طائرانِ خوشنوا پیغامِ آزادی لیے
اُڑتے پھرتے ہیں ہواؤں میں ہر طرف مستانہ وار
نغمہ ہائے سرمدی جو دل میں ہیں ان کے بھرے
ہیں نکلنے کے لیے سینوں سے اُن کے بیقرار
بارشِ ابرِ کرم سے یہ فضائے کائنات
دیکھتے ہی دیکھتے ہو جائے گی جیب لالہ زار
شور سے اس دم اُٹھا لیں گے یہ سر پر آسماں
دم زدن میں ٹوٹ جائے گا سکوتِ کوہسار

ہو گئی محفل نشیں پھر دل میں یادِ روئے دوست
پھر رواں ہونے کو ہے آنکھوں سے اپنی آبشار
پھر ہوا لانے لگی خوشبوئے زلفِ عنبریں
دل سے پھر اُٹھنے لگا رنج و الم کا اک غبار
آنکھ ہے لبریز فرطِ اشتیاقِ دید سے
منتظر ہے پھر کسی کا یہ دلِ امیدوار
موجۂ بادِ بہاری گو سبک رفتار ہے
چھیڑ سے اس کی مگر ہوتا ہے دل کو انتشار
آہ! یہ دل بھی کبھی تھا باریابِ بزمِ دوست
ان مناظر کی کبھی ہوتی تھی اس نے بھی بہار
اب نہیں افسوس حاصل دل کو عیشِ قربِ دوست
اب نہیں دل کو ذرا تابِ خلش ہائے بہار

آرزو ہے دل کی کھیتی بھی کبھی سرسبز ہو
گلشنِ حسرت میں بھی اے کاش آ جائے بہار
اپنے دل سے بھی کبھی ایسی اُٹھے کوئی گھٹا
جس سے کم ہو جائے کچھ میرے غمِ الفت کا بار
سینۂ سوزاں میں بھی بجلی چمک اُٹھے کبھی
اس سیہ خانے سے بھی اُٹھنے لگیں غم کے غبار
کاش میرا طائرِ دل بھی صدا دینے لگے
ہو کبھی میرا بھی ظلمت خانۂ دل مرغزار

بوئے الفت سے مرا سینہ بھی بس جائے کبھی
کاش دل کی بھی گھٹا بارے برس جائے کبھی!

غزلیات

حاصل جو اس کا عشق فراواں ہے آج کل
دل باغ باغ مثلِ بہاراں ہے آج کل
غفلت سے اس کی عشق کی جو آگ سرد تھی
اس کے کرم سے شعلہ بداماں ہے آج کل
برسوں جو میرے عشق سے کرتا رہا گریز
وہ حسن میرا تابعِ فرماں ہے آج کل
سایہ سے اپنی خود جو بھڑکتا رہا کبھی
مجھ سے قریب تر رگِ جاں سے ہے آج کل

جس کی زباں پہ میری برائی تھی روز و شب
وہ صدق دل سے میرا ثنا خواں ہے آجکل

جتنے کیے تھے مجھ پہ ستم ہائے ناروا
ان پر وہ شوخ دل سے پشیماں ہے آج کل

اس کی نگاہِ لطف کا اعجاز دیکھیے
جو درد تھا کبھی وہی درماں ہے آج کل

وہ کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا
قبضہ میں میرے گردشِ دوراں ہے آج کل

سمجھوں میں کیوں نہ دولتِ کونین کو بھی ہیچ
مٹھی میں جب وہ لعل بدخشاں ہے آج کل

دہلی و لکھنؤ و علی گڑھ کو چھوڑ کر
لاہور میں جلیل غزل خواں ہے آج کل

نقاب اپنے چہرہ سے اس نے اٹھا دی
کہ میری تمنا کی صورت دکھا دی

وہ یوں مسکراتے ہوئے دل میں آئے
محبت کی دنیا مری جگمگا دی

محبت میں ہے ایک ایسی بھی منزل
جہاں صرف حسرت ہے غم ہے نہ شادی

یہ حاصل بھی کیا کم ہے بے حاصلی کا
تری راہ میں عمر ساری گنوا دی

توجہ نہ دینے پہ بھی اس نے اسے دل
توقع جو تھی تجھ کو اس سے سوا دی

مجھے پیار کر کے کہیں کا نہ رکھا
مرے جرمِ الفت کی اچھی سزا دی

شبِ غم مرا دل کچھ اس طرح دھڑکا
میں سمجھا کہ اس بت نے مجھ کو صدا دی

بلانا تھا مجھ کو حرم میں جو ان کو
مجھے راہ کیوں بت کدہ کی دکھا دی

جلیل اب کہیں گے کہ میرے ہوئے وہ
کہ جب میں نے ہستی ہی اپنی مٹا دی

متفرق اشعار

شب کو تھی ذوق کو میرے جو رعایت منظور
خود کو اس شوخ نے گلدستہ بنا رکھا تھا

پھر غضب یہ کہ مرے شوق کے بھڑکانے کو
سر بسر عطرِ محبت میں بسا رکھا تھا

اللہ ری تری شوخیِ رفتار کا عالم
انداز ہے کل موجِ نسیمِ سحری کا

اللہ ری چشمِ ناز کی شوخی کا یہ اثر
اٹھی نہ تھی نگاہ کہ دل پائمال تھا

گدازِ قلب وہ نعمت ہے جو نہیں ملتی
بشر کو آنکھ سے خونِ جگر بہا سکے بغیر

مٹ چلے ہیں دل سے کچھ کچھ داغ ہائے آرزو
پھر چمک اٹھیں نہ اس ظالم کو ہنستا دیکھ کر

عشقِ کامل کی سرمستی و شوریدہ سری — عشق کی پہلی ہی منزل پہ آ سکتے کیا معلوم!
نظر کے سامنے پھرتی ہے کس لئے ہر دم — وہ اک ادا جو اسے خود بھی کچھ پسند نہیں
جہانِ حسن میں کھائی ہیں ٹھوکریں اتنی — تمیزِ دشت ہے باقی نہ امتیازِ چمن

کہاں کہاں دلِ صد چاک اشکِ خوں روئے
دبے ہیں سیکڑوں افلاک ان زمینوں میں

سمجھ سکے تو سمجھ میری وجہ خاموشی — بیانِ رازِ حقیقت میں کچھ بھی راز نہیں
کرم کہوں اسے قدرت کا یا ستم سمجھوں — کہ دل دیا ہے مگر کوئی دل نواز نہیں
عطائے خاص ہے تیری مرا یہ ذوقِ جنوں — عطا پہ ناز ہے مجھ کو جنوں پہ ناز نہیں
یوں بھی ہوتا ہے کہ بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں — اتفاقاتِ زمانہ سے یہ کچھ دور نہیں
ہم جو چاہیں تو کریں غم میں بھی راحت پیدا — حسن مختار ہے تو عشق بھی مجبور نہیں
یاد کو تیری ہیں اس طرح لئے بیٹھا ہوں — جیسے دنیا میں کوئی اور مجھے کام نہیں
عشق کی لذتِ جاوید نہ پوچھو مجھ سے — یہ وہ آغاز ہے جس کا کوئی انجام نہیں
سچ یہ ہے ہم تو فنا کے بھی سزاوار نہیں — یہ بھی اک آپ کا احسان لئے بیٹھے ہیں
حیرت کی بات کیا ہے کہ دنیا بدل گئی — اپنے کو دیکھتا ہوں کہ کیا ہو گیا ہوں میں
ہے مجھے اپنے سے یوں بیگانگی — غیر کا ہوتا ہے اکثر اشتباہ
مہرباں ہو کہ نہ ہو اس کی نہیں کچھ پروا — وہ مری کشمکشِ دل سے خبردار رہے
ہم تو ایں حسن کے قائل ہیں جسے اہلِ نظر — دیکھتے بھی رہے اور تشنۂ دیدار رہے

کثرتِ عیش کہ طوفانِ حوادث ہو جلیل
دل کو لازم ہے کہ ہر حال میں بیدار رہے

مل کے دیکھا تو وہ کچھ اور ہی نکلا لیکن — دل میں اک اس کی بنائی تھی جو تصویر سو ہے
خلوص پر بھی وہ عادت سے اپنی تھے مجبور — وفائیں کیں تو انھیں شکل دی جفاؤں کی
اُن میں یہ حسن و رنگ و طراوت بھلا کہاں — تشبیہ لب کو دیتے ہیں برگِ گلاب سے!
کل یک بہ یک کہیں سرِ محفل وہ آ گئے — سب رند رہ گئے تھے وہ ساغر لئے ہوئے
کبھی جو آئینۂ نقش و نگار دل تھی — وہی سینہ پہ اب سنگِ گراں معلوم ہوتی ہے
ابھی ہے دور سرحد لذتِ دردِ نہانی کی — ابھی تو لذتِ دردِ نہاں معلوم ہوتی ہے

جمالی

طفیل احمد

سن پیدائش ۱۹۱۰ء وطن بنارس

نیاز و عجز سے کچھ روز اور جی لیتے — نیاز و عجز ہمارا مزاج بھی تو نہیں

میں گدائے بے نوا ہوں مرے پاس اور کیا ہے
تری راہ میں لٹا ہے مرے اشک کا خزانہ

جوہر

شیخ محمد الیاس

سنہ پیدائش ۱۹۲۱ء

یادِ حبیب پاک میں آنسو بہائیں گے — اے چشمِ شوق تجھ کو درافشاں کریں گے ہم

جوہر

تجمل حسین ڈبائیوی

تجمل حسین نام تخلص جوہر تلمذ علامہ سیماب اکبرآبادیؒ سے حاصل ہے

چھپ جاتے ہیں جو آنسو وہ گر جاتے ہیں آنکھوں سے — جو رہ جاتے ہیں آنکھوں میں وہ موتی بن کے سجتے ہیں

حاوی معین الدین احمد

تاریخ پیدائش:- ۷ دسمبر ۱۹۲۲ء
سلسلۂ نسب:- چشتی۔
وطن مالوف:- احمد پور شرقیہ (ریاست بہاولپور)
والد کا اسم گرامی:- امیر الحکما قاضی حکیم مفتی الحاج حافظ محمد یار صاحب چشتی مدظلہ
تعلیم:- مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل، ایف۔اے، حکیم حاذق (پنجاب یونیورسٹی)
فاضل ادب (الٰہ آباد یونیورسٹی) کو الیفائڈ ان اردو شارٹ ہینڈ۔
ملازمت:- لکچرار گورنمنٹ نائٹ اورنٹیل کالج۔ ریڈر ہائی کورٹ بغداد الجدید بہاولپور

مختصر خاندانی حالات:- میرے اسلاف عظام مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں ڈسکہ ضلع سیالکوٹ سے نواب بہاول خاں رابع مرحوم کی قدر افزائی پر ہجرت کرکے ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۴ء احمد پور شرقیہ میں مستقلاً قیام پذیر ہوئے۔ وہ اپنے زمانہ کے متبحر عالم اور پیر طریقت تھے۔ چنانچہ ان کے ظاہری علوم و فنون۔ رشد و ہدایت اور باطنی تصرفات بلند نظری شہادت نفس پر آج تک ایک عالم فخر کرتا ہے۔
سرکار فرنگ کی عملداری سے پیشتر میرے بزرگان ریاست کے قاضی القضاۃ اور مفتی اعظم کے عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز رہ کر ایک دنیا کو مستفیض فرماتے رہے ہیں۔ اب بھی حضرت قبلہ والد صاحب کی بدولت خاندانی روایات تازہ ہیں۔ ذوق شاعری مطالعہ علم و ادب کا نتیجہ ہے اور اب تک اپنے آپ کو طالب علم سمجھتا ہوں۔

انتخاب غزلیات

اساس عشق پر قائم نظام بزم ہستی ہے — عدم ہے سلسلۂ مسدود ہونا ہستی انساں کا
بڑی دل سے چپ تھی آوارگی دشت محبت کی — جب الجھا خار میں دامن خیال آیا گلستاں کا
مرے دامن کا ٹکڑا رکھ دیا کس نے پھولوں میں — مجھے ڈر ہے گلستاں پر نہ ہو دھوکا بیاباں کا

آشنا اپنی حقیقت سے اگر ہو جائے   عشق خود حسن کا عنوانِ نظر ہو جائے
دل وہ ہے جو ہو ترے دردِ محبت کا امیں   عمر وہ ہے جو ترے غم میں بسر ہو جائے

اے شوقِ دید عام متاعِ نظر نہ کر   جب تک نہ جذبِ حسن تقاضا کرے کوئی
منت پذیرئ اثرِ جذبِ عشق سے   بہتر یہ ہے کہ ترکِ تمنا کرے کوئی

حسن نظر نواز ہے نظارہ سوز بھی   آخر کس اعتبار سے دیکھا کرے کوئی

شہیدِ ناز تمہارا جو لے ابھی کروٹ   تمام عالمِ امکاں خراب ہو جائے
نصیب اس کے ہیں محرم اس کا آرزو مند   حریمِ ناز میں جو باریاب ہو جائے

چلے جاتے ہو تم امید یہ آسانی نہیں جاتی   بسا اوقات برسوں گھر کی ویرانی نہیں جاتی
تعجب ہے اگر ہو باخبر اس کی حقیقت سے   وہی جس سے حقیقت اپنی پہچانی نہیں جاتی
بہ شغل مری دیوانگی ہے اور ہنسی آپ کی   سمجھ لو اب کہاں تک عقلِ انسانی نہیں جاتی

عشق ہے مبتلائے جمال بے خبر غمِ مآل   حسن ہے بے نیازِ حال ذوقِ نظر کو کیا کروں
دل میں نہیں کوئی امید اور نہ کوئی آرزو   اب میں دعا کو کیا کروں اب میں اثر کو کیا کروں

اگر کثرت ہی وحدت ہے تو وحدت میں نہاں کیوں ہو   جو آزادِ تعین ہو وہ پابندِ مکاں کیوں ہو
نہ مر مر کے جینا ہے اسے جی جی کے مرنا ہی   ترا بسمل طلب گارِ حیاتِ جاوداں کیوں ہو
اگر ضبطِ محبت صرف معیارِ محبت ہے   تو دل وقفِ تپش کیوں ہو زباں وقفِ فغاں کیوں ہو

کسی کی آرزو ہے اور میں ہوں   مرا افسانہ کتنا مختصر ہے
ادھر جلووں کی ارزانی ہے عالم   ترقی پر ادھر ذوقِ نظر ہے

چلیں ہوائیں گریں بجلیاں اٹھے طوفاں   مگر نظامِ تمنا نہ مٹ سکا دل کا
جو کشتیوں سے طلبگار رہوں وہ کیا جانیں   ہے موج موج کے سینے میں رازِ ساحل کا
بھٹک رہا ہے مسافر سرائے غربت میں   بگولے اٹھ کے بتا دیں نشانِ منزل کا

دیکھ کر دوستوں کا رنگِ خلوص   دشمنوں سے مجھے گلا نہ رہا
دعوتِ التفات اب کیوں ہو   دل میں جب کوئی مدعا نہ رہا

حریمِ ناز میں جو باریاب ہو نہ سکا   وہ نامرادِ وفا کامیاب ہو نہ سکا
ہزار آئینہ خانے بنائے دنیا نے   مگر تمہارا کسی سے جواب ہو نہ سکا
چھپا لیے تری رحمت نے یوں گناہ مرے   کہ روزِ حشر بھی ان کا حساب ہو نہ سکا

تو بھی آ

فضا سے مشک آفریں ہوا زلال بار ہے
گہر طراز و گلفشاں جو ایک شاخسار ہے
نظر فروز چار سو بہشت لالہ زار ہے

ورق ورق کتاب زندگی کا زرنگار ہے
"نشاط" تو بھی آ کہ آج موسم بہار ہے

قدم قدم پہ خیمہ زن ہیں رنگ و بو کے کارواں
فرازیں نشیب ہیں ادھر ادھر یہاں وہاں
ہوا کے دوش پر لطافتوں کا سیل ہے رواں

کنار آب وگل میں اہتمام برگ و بار ہے
"نشاط" تو بھی آ کہ آج موسم بہار ہے

یہ سیل آب و رنگ اک سراب ہے جو تو نہیں
پیام عیش سربسر عذاب ہے جو تو نہیں
حیات منتقل خیال و خواب ہے جو تو نہیں

تجھی سے کائنات پر شباب ہے نکھار ہے
"نشاط" تو بھی آ کہ آج موسم بہار ہے

سرودِ رفتہ

تغیر آفریں ہے سر بسر تنظیم امکانی
ازل سے ہے سکوں نا آشنا یہ عالم فانی

مسلسل گردشوں کی زد میں ہے تعمیر دنیا کی
تصرف میں ہے صبح و شام کے تقدیر دنیا کی

کبھی شامل تھے ہم بھی اس چمن کے نونہالوں میں
وہ دن اک ایک کر کے ہو گئے تبدیل سالوں میں

غرض رہ رہ کے وہ لمحات رنگیں یاد آتے ہیں
نیاز و ناز کے پیماں زیر لب یاد آتے ہیں

وہ فصل گل وہ گہوارے سجاوٹ وہ برساتیں
وہ لہراتی ہوئی صبحیں وہ اترائی ہوئی راتیں

وہ دل کے راز کہنا اور آنکھوں کے اشاروں سے
وہ چھوٹے چھوٹے سے ہم خیالی جانثاروں سے

بالآخر اب سنہری ہوں گی تعبیریں یاران محفل کی
کہ آ پہنچی ہے منزل آخری اب اپنی منزل کی

مآل زندگی پر ہر ادا روتی جاتی ہے
اجالوں پر بساط ظلمت شب ہوتی جاتی ہے

رہی خوش آنے والے کارواں سیداتی تبیا
بچھڑ ہو لیا بقدر آرزو دلستان ہستی میں

زیادہ سے زیادہ سانس ہے بس دینا شانی
جوانی کے حسیں لمحوں کی دھندلی یاد باقی ہے

حامد

مرزا حامد حسین لکھنوی

ولادت ۱۸۸۵ء شروع سلسلۂ تعلیم ۱۸۹۵ء تا ۱۹۰۲ء ابتدائے شعر و سخن ۱۹۰۶ء ہوا اور جناب سید مصطفیٰ میرزا عرف پیارے صاحب رشید اعلی اللہ مقامہ نبیرۂ جناب میر انیس مرحوم و مغفور کی خدمت میں زانوئے ادب طے کیا۔ لکھنؤ کے مشاعروں میں بسبب بیچمدانی شرکت سے قاصر رہا آج بھی کچھ نہیں آتا۔ مگر احباب کے حکم کی تعمیل مجبوراً کی جاتی ہے۔

نمونۂ کلام

ممکن نہیں ہے دل سے بھلانا　　پہلی محبت پہلا فسانا
یوں اُس گلی میں گزرا زمانا　　بیتاب جانا مایوس آنا
چھیڑا تو ہونا کرکے بہانا　　غم کی کہانی سنتا زمانا
نظریں جو پھیریں بدلا زمانا　　برہم ہوا ہے کیا کارخانہ
ذکر وفا پر کہتا ہے ظالم　　چھیڑا وہی پھر قصہ پرانا
پھولوں کا بستر ان کو مبارک　　ہم سے غریبوں کا کیا ٹھکانا
یہ کہہ کے آخر گزرا مسافر　　یکساں ہے اُن کا آنا نہ آنا

الفت کا خوگر ہے یہ ازل سے
دل کے کہے میں حامد نہ آنا

ہے سامنے منزل تو نہیں پاؤں میں دم اور　　ہمت کا تقاضا ہے کہ دو چار قدم اور
اس طرح تڑپتا ہے کہ دیکھا نہیں جاتا　　کچھ دل کا کہیں حال اگر درد ہو کم اور
دل ہی میں کہیں حسرت دیدار نہ رہ جائے　　اے آنکھ رکی ہوئی سانس ٹھہر جا کوئی دم اور
وہ زخم دل کشتۂ غم دیکھ رہے ہیں　　اے چشم کرم آج ہے انداز ستم اور
شکوہ کیا نا راستی نہ سمجھے تھے اپنا　　یہ اب ہوا معلوم کہ تم اور ہو ہم اور

حامد ابھی خاموش ہی رہنا ہے مناسب
کرتے ہیں اگر آہ تو کھلتا ہے بھرم اور

الفت بے اثر کو کیا کہیے — شجر بے ثمر کو کیا کہیے
غفلت چارہ گر کو کیا کہیے — اور دردِ جگر کو کیا کہیے
خوب بیٹھے بٹھائے مول لیا — مفت کے دردِ سر کو کیا کہیے
دل جگر ہو گئے تہ و بالا — اُن کی نیچی نظر کو کیا کہیے
ارے پتھر کہیں پسیجا ہے — نالۂ بے اثر کو کیا کہیے
بات بھی اُن کو کی نہیں جاتی — ہائے دردِ جگر کو کیا کہیے
بن گئی ہے نشان منزل کا — گردِ راہِ سفر کو کیا کہیے
ذرے ذرے میں اس کو دیکھا ہے — آپ کی راہ گزر کو کیا کہیے
ہو گئے خاک تکتے تکتے راہ — آہ اس بے خبر کو کیا کہیے
شب فرقت کی تیرگی توبہ — قبر ہے اپنے گھر کو کیا کہیے
ہے عدم ہی نشان ہستی کا — اس فریب نظر کو کیا کہیے

کس پہ الزامِ عشق ہے حامد
دل کو کہیے نظر کو کیا کہیے

کوئی پرسان حال ہو تو کہیں — یعنی ہم سے سوال ہو تو کہیں
درد میں اعتدال ہو تو کہیں — کچھ جو حالت بحال ہو تو کہیں
جب سخن کی مجال ہو تو کہیں — گفتنی دل کا حال ہو تو کہیں
ستم و جور کا نہیں شکوہ — دل میں گرد ملال ہو تو کہیں
حسن یوسف ہے قصۂ ماضی — ان کی کوئی مثال ہو تو کہیں
فائدہ کیا کہ بات بھی جائے — آپ کو کچھ خیال ہو تو کہیں
سانس اکھڑتی ہے بات کریں کیا — طاقت عرضِ حال ہو تو کہیں
آپ ہی کا خیال ہے ہم کو — اور کوئی خیال ہو تو کہیں

کیوں چھپائیں نہ دردِ دل حامد
کہنے کا کچھ خیال ہو تو کہیں

حامد
آغا حامد حسین بنگش

میں مورخہ ۴ نومبر ۱۹۲۸ء بروز اتوار بوقت صبح بمقام ہنگو پیدا ہوا اور حامد حسین کے نام سے پکارا گیا۔

آج کل لوگوں میں حبیب حسین کے نام سے مشہور ہوں لیکن مجھے اپنا اصلی نام پسند ہے۔ تخلص حامد کرتا ہوں۔ صرف ایک شعر ملاحظ فرمایئے۔ شاید پسند آ ئے۔

نہ جانے یاد کس کی آ رہی ہے
گھٹا فرقت کی دل پر چھا رہی ہے

حسرت
حسرت ترمذی

ہم ادبی دنیا میں حسرت ترمذی کے نام سے متعارف ہوں۔ حسرت میرا تخلص ہے اور ترمذی میری خاندانی نسبت ہے۔

میری انگریزی تعلیم سے قبل فارسی کی تکمیل ہو چکی تھی عربی اور انگریزی کی تعلیم ساتھ ساتھ شروع ہوئی مگر ۴ سال تک باقاعدہ تعلیم ہونے کے بعد مجھے عربی ترک کرنا پڑی ۱۹۲۳ء میں میں نے الہ آباد یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ بی کی سند حاصل کی میرے نانا مشہور عالم اور شاعر تھے میری والدہ فارسی اور اردو میں قابل تھیں اور شعر کہتی تھیں میرے چچا احمد ترمذی عمر شعر کہتے تھے یہ میرا ابتدائی ماحول تھا بعض حالات کی وجہ سے مجھے ابتدائے سن شعور سے مشاہدات اور تجربات کا موقع ملتا رہا اور چونکہ میری طبیعت کا رجحان شروع سے غزل گوئی کی طرف تھا اس لئے آیندہ جب میں محبت کی لذتوں اور تلخیوں سے

آشنا ہوا تو غزل ہی کہنے لگا۔ عام طور پر میری شاعری خالص غزل کی شاعری ہے جس میں جذباتی شاعری نمایاں ہے۔ میں نے پہلی غزل اس وقت کہی تھی جب میں میٹرک میں زیر تعلیم تھا مگر ۱۹۵۲ء سے میں قریب قریب مسلسل اور پابندی سے شعر کہہ رہا ہوں۔ میں کسی کا شاگرد نہیں ہوں مگر میری دو غزلیں ناطق لکھنوی نے دو تین غزلیں میرے چچا اختر ترمذی نے اور دس بارہ غزلیں جوش ملیح آبادی نے دیکھی ہیں۔ ان غزلوں کے علاوہ میرا بقیہ کلام کسی کی اصلاح کا ممنون نہیں۔

نمونۂ کلام

میکدہ میں دورِ جامِ عیش چلتا ہی رہا   غم زدہ آنکھوں سے موجِ غم ابلتی ہی رہی

شفق کی سرخیاں، مے کی جھلک، پھولوں کی رعنائی
بہارِ حسن اور وہ بھی مجسم ہائے کیا کہئے

زسرتا قدم اک قیامت کا عالم   مگر حسن کی سادگی اللہ اللہ

اور کس انداز کو کہتے ہیں اے ظالم شباب
آنکھ میں مستی قدم میں لغزشِ مستانہ ہے

کس نے کہا کہ زندگی وقفِ جمالِ یار ہے   آج بھی زندگی کا نام کاوشِ روزگار ہے

ہمتِ عالی کو منزل چاہیئے   جادہ ہموار و ناہموار کیا

ذرہ ذرہ اک حجابِ راز ہے   رازِ ہستی کیا بتایا جائیگا

ہرچند کہ ہر پھول میں نشتر بھی نہاں تھا   اس عالمِ نیرنگی کا تماشا بھی بہت تھا

جب یہ دنیا نیا زخیر دشمن ہو جائے گی
زندگی دشوار سے دشوار تر ہو جائے گی

تغیر ہوتے رہتے ہیں تماشا گاہِ عالم میں   مگر جب دیکھئے دنیا وہی معلوم ہوتی ہے

ڈوب گیا جب سارا عالم   اپنا اپنا سفینا کیا

اعتبارِ عیش و رازِ شادمانی کچھ نہ پوچھ   سادگی پر اپنی اکثر مسکرانا ہی پڑا

یہ بے قرار موجیں یہ والہانہ موجیں   افسانہ کہہ رہی ہیں ساحل کی بے حسی کا

ہماری زندگی کا پوچھنا کیا   کہ اکثر عمر بھی پا کر نہ پائے

کچھ اور تلخیاں بھی ترے میکدے میں ہیں   ساقی تری شراب میں لذت نہیں رہی

کسی طرح تو ہمیں سکھانا ہیں دل کو انداز زندگی کے
اجڑ چکی ہے جو ایک محفل تو کیوں نہ ہم دوسری سجائیں

روح رہے جب تک آزاد   خوف اسیری کیا صیاد
نہ دیکھا حسن کا عالم کسی نے   محبت کی گئی بدنام کیا کیا
بہ ہزار نامرادی مجھے تیری ہی تمنا   بہ ہزار بے نیازی تجھے میری ہی ضرورت
وہی لمحے نشاطِ زندگی ہیں   وہی لمحے جو تڑپاتے ہیں اکثر

عابد حشری

تاریخ پیدائش غالباً ۱۱ جولائی ۱۹۲۴ء حالات زندگی کے متعلق کچھ لکھنا اس لئے ضروری نہیں سمجھتا کہ میں فن کو زندگی سے علیحدہ نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک فن میں اتنی جامعیت ہے کہ وہ زندگی اور اس کے عوامل کا نہ صرف صحیح تجزیہ ہی کر سکے بلکہ اس کے ارتقائی عمل کو آگے بڑھانے میں بھی مدد دے سکتا ہے۔

میرا مسلک ایں شعوری طور پر انسانیت دوست عناصر کے ساتھ ہوں۔ انسانیت کی ارفع، اعلیٰ اقتدار پر میرا ایمان ہے۔ میں سب کے درد کو اپنا درد سمجھتا ہوں۔ زندگی کو بہتر اور شاداب بنانا اپنا نصب العین سمجھتا ہوں اور اسی کا مظہر میری شاعری ہے۔

چند شعر بطور مثال پیش کرتا ہوں۔

ذوقِ تسکیں جستجو کی موت ہے منزل نہیں   میرا مسلک عیشِ طوفاں ہے غمِ ساحل نہیں
طلوع ہونے تو دو نوبہار کرنوں کو   نئے افق سے نئے مہر و ماہ ابھریں گے
چشمِ افسردہ میں اشکوں کے شرر جاگ اٹھے   مژدۂ رنگ کہ انوارِ سحر جاگ اٹھے
ظلمت سے رک سکے گا نہ اب کاروانِ نور   دنیا گذر رہی ہے ستاروں کی راہ سے
چھین لی ہے زندگی نے موت سے روحِ نشاط   ظلمتِ شب صبح کی پہلی کرن بھی دیکھ لے
زندگی کے لئے رکھ عظمتِ انساں کا بھرم   زندگی عظمتِ انسان سے وابستہ ہے
بجھی فضا میں جواں راہِ شعورِ کامل کی زندگی ہیں
اندھیری راہوں پہ چلنے والے چراغ منزل کی روشنی ہیں

حفیظ جالندھری

میرا خاندان تقریباً دو سو سال پیشتر ہندو راجپوت کہلاتا تھا میرے بزرگ ہندو سے مسلمان ہو گئے۔ اور پاداش میں اپنی املاک وغیرہ کھو بیٹھے البتہ سوچ ہندی ہونے کا عزم مسلمان ہونے کے باوجود ساتھ رہا۔ میری ذات تک پہنچا اور ختم ہو گیا۔ میں کم سن تھا جب مجھے محلے کی قدیم مسجد میں داخل کر دیا گیا۔ میں یقیناً اس زمانے میں ذہین لڑکوں میں شمار ہوتا تھا کیونکہ میں نے چھ برس کی عمر میں ہی قرآن شریف کا ناظرہ کر لیا۔ اس سے آگے مسجد میں نہ چل سکا۔ اس کے بعد مشن اسکول میں داخل کیا گیا۔ وہاں سے میں دوسرے دن سے بھاگ نکلا۔ سرکاری مدرسے میں داخل ہوا پھر مشن ہائی اسکول میں لے جایا گیا لیکن جتنا سے میری جان جاتی تھی۔ ہر روز نہ جانے کس وقت بھاگ جاتا تھا۔ اور دوسرے دن پکڑا جاتا تھا۔ بھاگنے پکڑے جانے کا یہ سلسلہ چار سال تک جاری رہا۔ آخر پکڑے جانے پر بھاگنا غالب آیا اور میں ہمیشہ کے لئے بھاگ نکلا۔ شعر گوئی یوں تو ساتویں سال سے شروع ہو گئی تھی لیکن گیارہ سال کی عمر میں اس مرض کا باقاعدہ حملہ ہوا۔ جب ابھی چھٹی جماعت میں تعلیم پاتا تھا۔ اس بیماری کا سبب عشق کی گرمی تھا کسی کم سنی ہی میں مجھے پہنچی [illegible] کاش میں اس کو بیان کر سکتا۔

مجھ کو اس سے باقاعدہ غزل گوئی کی طرف رجوع کی توفیق ہوئی [illegible] استاد کی ضرورت [illegible] ہوئی [illegible] مولانا غلام قادر گرامی صاحب [illegible] اپنی ابتدائی غزلیں دکھائیں لیکن انہوں نے کوئی خاص اصلاح نہ دی [illegible] کچھ عرصہ [illegible] دیا [illegible] اپنا کلام پنجابی [illegible] فارسی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] شاعر [illegible] حفیظ [illegible] معلوم ہوا [illegible] اپنا کلام اور خود ہی ناقدانہ نظر سے دیکھا کرتے [illegible] میں نے اسی شوق سے پڑھنا شروع کر دیا

پھر جب حضرت گرامی وظیفہ لے کر ہمیشہ کے لئے وطن میں مقیم ہو گئے۔ تو شاعری کے اس آفتاب لب بام کے سامنے میں نے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہ کیا۔ متاہل ہو جانے کے بعد ذہن [illegible] معاش کے لئے تھوڑے ہی عرصہ میں بیسیوں پاپڑ بیلنے پڑے [illegible] فروشی۔ فوج کی ٹھیکیداری خطوط نویسی مشاعروں کی [illegible] دینا [illegible] کمپنی کی منیجری سب کچھ کر ڈالا لیکن فراغت نصیب نہ ہوئی [illegible] کیا ملازمت چھوڑ کر وطن آ گیا۔ اور اردو زبان میں ایک ماہنامہ رسالہ [illegible] کی داغ بیل ڈالی جس کے سرپرست مولانا گرامی تھے۔ یہ رسالہ پانچ ماہ بعد آخری [illegible] دیکھ لیا اس وقت مایوسی سے میری حالت دیوانگی تک پہنچ گئی تھی۔ لاہور آ کر ماہنامہ "شباب" میں ملازمت کر لی۔ اس کے بعد "نونہال" اور "ہزار داستان" کی ادارت میرے سپرد ہوئی پھر "پھول" اور "تہذیب نسواں" میں کام کیا۔ یہاں سے مجبور ہو کر [illegible] شاعر [illegible] ہوا۔ لیکن یہ زندگی راس نہ آئی مجبوراً پلٹ آیا "نظم" "قاصد" اسی زمانے کی یادگار ہے۔ اب تک شعر و ادب میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کی اور ہزاروں کو ہمہ تن گوش اور ہمہ جان بے ہوش کر دیا ہے۔ [illegible] کی [illegible] مناظر قدرت کی [illegible] اور [illegible] شائع ہو چکے ہیں [illegible] "میرا شاعر" کا نام [illegible] ہے [illegible] اردو زبان سے مجھے خاص لگاؤ ہے [illegible] اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں [illegible] معلوم [illegible]

نمونۂ کلام

[illegible] | دل درد جان [illegible]
اب اشتیاق [illegible] تمنا [illegible] | اب ہر کوئی [illegible] تمنا لئے ہوئے
[illegible] زندگی ہے کہ مرنا پڑا [illegible] | [illegible] زندگی کی تمنا لئے ہوئے
[illegible] آج کون کہ ہر کوزۂ سفال | آتا ہے ایک نور کا دریا لئے ہوئے
[illegible] ہستی [illegible] | [illegible] لئے ہوئے [illegible] لئے ہوئے
پروانہ دل لئے ہوئے جل جانے کو [illegible] | [illegible] صورت [illegible] لئے ہوئے
یہ لن ترانیاں ہیں تو اب کون آ سکے | بیٹھے رہو گے برق تجلی لئے ہوئے

پیشِ خدا چلا ہوں فرشتے ہیں ساتھ ساتھ ساغر لئے ہوئے کوئی مینا لئے ہوئے
احباب ہی نہیں ہیں تو کیا زندگی حفیظ
دنیا چلی گئی مری دنیا لئے ہوئے

شہیدوں کی عید

فرض پورا کر چکے فرصت ملی ہر کام سے!!!
مقبروں میں سو رہے ہیں آج کیسا آرام سے

صبح کی صورت اٹھے تھے رات کی آغوش سے
ہو گیا زندہ عمل کا جوش ان کے جوش سے

ان کا اٹھنا تھا کہ تقدیر اخوت جاگ اٹھی
خوابِ غفلت میں پڑی تھی آدمیت جاگ اٹھی

ان سروں پر سایہ افگن تھا علم اسلام کا
ان لبوں پر ورد تھا اللہ کے پیغام کا

ابرِ رحمت تھے یہ سارے زمانے کے لئے
آئے تھے اجڑی ہوئی دنیا بسانے کے لئے

ہو گئیں آباد ان کے نام سے آبادیاں!
رشکِ جنت بن گئیں ان کے لہو سے وادیاں

بام و در کہسار و میدان خشک و تر پست و بلند
ہو گئے اللہ والوں کی صدا سے بہرہ مند

زندگی میں بس گئے آبادکاروں کی طرح
زیست کی مدت گزاری روزہ داروں کی طرح

ہو بکے بستی میں جب درسِ محبت کہہ چکے!
آئے تھے جس کام کو وہ کام پورا کر چکے

آخر ان کی عمر کا دن ڈھل گیا شام آ گئی
یعنی صبحِ عید کا شب یکے پیغام آ گئی

آخری روزہ کیا افطار حق کے نام پہ
پھر اظہار اطاعت جھک گئے سجدوں میں سر
قبلہ رو ہو کر مصلوں پہ نمازی سو گئے
فتح کر کے جنگ کو مردان غازی سو گئے

موت کا قافلہ

آتی ہے آواز درا!
یہ قافلہ ہے موت کا
دیکھو وہ گرد اڑتی ہوئی افلاک پہ چڑھتی ہوئی
ہر موڑ پہ مڑتی ہوئی ہر سمت کو بڑھتی ہوئی
حسرت بھری خاموشیاں
ہیں ساتھ ساتھ اس کے رواں
آہوں کے ڈیرے ساتھ ہیں گہرے اندھیرے ساتھ ہیں
یہ قافلہ ہے موت کا
آتی ہے آوازِ درا!

ہاں موت ہے یہ موت ہے
اپنا سفر کرتی ہے طے
یعنی دیار ہست کو پھرتی ہے سر کرتی ہوئی
ہر اک بلند و پست کو زیر و زبر کرتی ہوئی
کہسار کیا میدان کیا
آباد کیا ویران کیا
سب کو سمٹ کر لاتی ہوئی زیر نگیں لاتی ہوئی
اپنا سفر کرتی ہے طے

ہاں موت ہے یہ موت ہے
اس کے جلو میں ہیں رواں
گل پیرہن بانکے جواں

بوڑھے بھی ہیں بچے بھی ہیں — ہیں عورتیں بھی مرد بھی
محبوب بھی ہیں بچے بھی ہیں — احرار بھی دل سرد بھی
خاطی بھی ہیں معصوم بھی
مسرور بھی مغموم بھی!
مجبور بھی مختار بھی — مفلوک بھی زردار بھی
گل پیرہن ، بانکے جواں
اس کے جلو میں ہیں رواں
پیاروں سے دل برداشتہ
پیاروں سے دل برداشتہ

بچھڑا ہوا تھا موت کے — جو دور سے چل کر آئے ہیں!
ساتھی بچھڑا تھا موت کے — پھولوں میں چھپ کر آئے ہیں
عاشق وفا محبوب سے ہوئے
معشوق دو الجھے ہوئے
بیوی کا دل ٹوٹا ہوا — بچھڑے سہاگ والے ہوئے
پیاروں سے دل برداشتہ
پیاروں سے دل برداشتہ

کنجوس سرمایہ دار

آنکھیں اندھی دل بھی اندھا ، بندگی زر کی ہے دولت
قبر وہ پا گئے ، جس میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے دولت کا
تا عمر جیتے ہیں اس لیے کہ دل ٹوٹے ہیں
عمر کٹتی ہے تو چھپتے ہیں سب پیچھے چھوڑے جاتے ہیں

احمد شاہ ابدالی کا ذکر ہے آنکھوں کو دل ...
لاکھوں جانوں کا حساب کتاب اپنی قبر میں لے گئے

مال خزانہ پاس ہے تیرے لیکن اطمینان نہیں
اطمینان کہاں سے آئے جب دل میں ایمان نہیں
چھپے فیض خزانہ تیرا تیرے کام نہ آئے گا
تو نے دنیا کو ترسایا یہ تجھ کو ترسائے گا
چین تری تقدیر میں ہرگز او سرمایہ دار نہیں
مزدوروں کی چیخیں ہیں اشرفیوں کی جھنکار نہیں
تنہائی میں اندیشوں کے بھوت ستاتے ہیں تجھ کو
تیری دولت چھیننے والے ہاتھ ڈراتے ہیں تجھ کو
تھیلی کھول کے ہو جاتا ہے حال برا ہر بار ترا
کر دے گی یہ دولت آخر اک دن بیڑا پار ترا

محمد حفیظ روبانی

حفیظ

نام محمد حفیظ، ادبی نام حفیظ روبانی، سن ولادت ۱۲ مارچ ۱۹۲۹ء، جائے پیدائش کپور تھلہ اسٹیٹ، موجودہ رہائش ملتان شہر۔ بطور منیجر باٹا شوز اسٹور خانیوال میں ملازم ہوں۔

طبیعت کا رجحان شعر گوئی کی طرف بچپن ہی سے تھا، اکثر شعرا کا کلام حفظ تھا اور گنگنایا کرتا تھا۔ مشاعرہ سننے کا اتنا اشتیاق، معلوم ہو جائے کہیں مشاعرہ ہے؟ آندھی ہو یا طوفان موسم موزوں ہو یا غیر موزوں مشاعرہ سننے ضرور جاتا۔

پانچویں جماعت میں تعلیم حاصل کر رہا تھا کہ شعر کہنے کا شوق ہوا، دو تین شعر کہے کسی نہ کسی طرح اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو علم ہو گیا اور انھوں نے آفس میں بلا کر نہایت پیار اور خلوص کے لہجے میں کہا "حفیظ صاحب آپ کو شعر کہنے پر انعام دیا جائیگا" مگر انعام ملنے کے بجائے متواتر تین گھنٹے کان پکڑنے پڑے۔ اور تنبیہ کی گئی کہ اگر آئندہ معلوم ہو گیا کہ آپ شاعری فرماتے ہیں تو سخت سے سخت سزا دی جائیگی۔

کچھ بچپن کا شوق اور کچھ نئی نئی جبین ٹھوکروں نے تازیانہ کا کام کیا۔ آٹھویں کلاس میں آتے ہی طبیعت کو ذرا آزادی ملی، اور دبی ہوئی چنگاری پھر سلگ اٹھی، ان دنوں شاد عظیم آبادی کی ایک غزل اردو کے نصاب میں تھی، جس کا مطلع ہے۔

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

یہ شعر بہت ہی پسند تھا، اور اکثر گنگنایا کرتا تھا، میری سب سے پہلی غزل بھی اسی زمین میں ہے، اور وہ غزل آج تک میری بیاض میں یادگار کے طور پر اسی طرح لکھی ہوئی ہے جس طرح کہی تھی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس میں فنی خامیاں ہیں، جس کا مطلع حسب ذیل ہے۔

تمہارے غم میں تڑپایا گیا ہوں   نہ سمجھا پھر بھی اٹکایا گیا ہوں

اور مقطع یہ ہے:

حفیظ خستہ دل کا کیا ہے شکوہ   جہاں ڈھونڈا وہیں پایا گیا ہوں

غالب، داغ، حسرت موہانی اور جگر کے کلام سے دلی عشق ہے میرے اشعار میں مسرت اور قہقہوں کے بجائے رنج و غم، فکر و الم اور یاس و نامرادی کی جھلک ہی پائیں گے، چونکہ زندگی کے ہر نئے موڑ پر عجیب عجیب ٹھوکریں کھائی ہیں طبیعت نے صدمات پر صدمات جھیلے ہیں اور انھیں کے اثرات میری شعر گوئی پر بھی پڑے ہیں۔

شمعِ حیات بجھ گئی بادِ فراق سے
وہ شعلہ رو ہے اس کو ہماری خبر کہاں

دن جو تیرے بغیر گذرے ہیں
عمر میں کب شمار کرتے ہیں

شبِ غم سے کہہ دو کہ ہمت نہ ہارے
ابھی جی رہے ہیں محبت کے مارے

افسردہ دل ہوں خار ہیں میری نظر میں گل
جی چاہتا ہے آگ لگا دوں بہار کو

غم بھی اک جزوِ زندگانی ہے
مجھے غم میں قرار آتا ہے

آنسوؤں کے حسین چراغوں سے
دل کی محفل سجا رہا ہوں میں

یاد کا ان کی ایک ایک لمحہ
زندگی میں شمار ہوتا ہے

جانِ بہار رنگِ بہاراں تمہیں سے تھا
اب وہ بہار ہے نہ وہ دم ہے بہار میں

ساقی نے مسکرا کے نگاہیں جو پھیر لیں
اک دم چھلک کے رہ گیا امید کا ایاغ

جیب و دامن میں کوئی تار رہے کیوں باقی
شور سنتا ہوں کہ گلشن میں بہار آئی ہے

حمید
عبدالحمید صدیقی جہلمی

پورا نام عبدالحمید صدیقی تخلص حمید وطن جہلم تاریخ پیدائش ۱۰ اپریل ۱۹۱۵ء میں اپنی غزلیں حضرت زیبا ردولوی اکبرآبادی کو دکھاتا ہوں دو شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ساقی یہ بے سبب نہیں انگڑائیاں تری
کچھ اس میں اہتمامِ تمنا ضرور ہے

آتی ہے گھر کے گھٹا سوئے میکدہ
گیسو بدوش ساقیِ محفل سے پوچھئے

شیخ عبدالکریم صدیقی

شیخ محمد عبدالکریم صدیقی نام، حسرت تخلص، والد کا نام شیخ مصطفیٰ علی صدیقی تاریخ ولادت ۱۳ جولائی ۱۹۱۰ء آبائی وطن لکھنؤ (اودھ)

اسلامیہ ہائی اسکول لکھنؤ میں دسویں تک تعلیم حاصل کی، نویں جماعت تک شعر گوئی کی کوئی لگاؤ نہ تھا، لیکن اس اسکول کے ماحول سے ایک معجزہ کہئے یا کرامت، ریاضی اور شاعری سے جو بظاہر ایک دوسرے کا تضاد ہیں، بیک وقت شغف پیدا ہوا۔ اسی اسکول کی انجمن ارباب ادب کا سکریٹری دو سال تک رہا اور لٹریری یونین کا بھی دو سال تک سکریٹری رہا۔ تعلیم کا شوق مجھے بچپن ہی سے تھا، لیکن اچھا طالب علم نہ تھا۔ خاص طور سے نویں جماعت میں جبکہ والد صاحب رحلت فرما گئے تو میرے حالات بہت بگڑ گئے اور تعلیم پر بھی برا اثر پڑا۔ لیکن پھر بھی کسی نہ کسی طرح سے تعلیم جاری رہی۔

ایف اے لکھنؤ کرسچین کالج سے پاس کیا۔ [illegible] اساتذہ اور پروفیسر میرے جذبات اور اخلاق کے ہمیشہ معترف رہے۔ ایف اے پاس کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا۔ جس حسرت اور پریشانی میں [illegible] تعلیم حاصل کی وہ اب تک یاد ہے۔ کالج کی سیاست اور دیگر دلچسپیوں میں بھی پیش پیش رہا۔ کرسچین کالج میں بھی وہاں کی یونین کا نائب صدر رہا اور [illegible] میں نمائندگی کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ یونیورسٹی کی پارلیمنٹ میں بھی [illegible] کی حیثیت سے رہا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیاست میری زندگی کے ہر شعبہ میں دخیل رہی۔ [illegible] اسلامیہ اسکول ہی میں تھا کہ مولانا عبدالباری آسی الدنی [illegible] میں داخل ہوا۔ مولانا کا کرم اور عنایت کا یہ عالم تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں [illegible] اپنے شاگردوں [illegible] میں شرکت فرماتے [illegible] کے ساتھ ساتھ حسرت لکھنوی کو بھی اپنا [illegible] لکھنے کا شوق تھا لیکن کالج میں داخل ہونے کے بعد نثر لکھنے کا بھی شوق پیدا ہوا اگرچہ مولانا کو

نظموں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن مجھے کبھی اس سے منع نہ کیا بلکہ جب کبھی کوئی نظم بغرض اصلاح لے گیا تو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول فرما لیا۔

خدا ان کو غریق رحمت فرمائے۔ سنہ ۱۹۳۳ء تک جب کہ میں بی۔ اے کے پہلے سال میں تھا کانگریس زدہ تھا مسلم لیگ کے احیاء پر جو سیشن لکھنؤ میں ہوا اس میں ایک نظم پڑھی جو بہت مقبول ہوئی اسی روز سے یونیورسٹی میں میری پیشانی پر گویا بدنامی کا ٹیکہ لگ گیا۔ بالآخر سنہ ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے پاس کر لیا۔ مجھے انگریزی ملازمت سے ہمیشہ نفرت رہی یہاں تک کہ سرکاری ملازمت کی عمر نکل گئی۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں محمود آباد اسٹیٹ کی ملازمت اختیار کی۔ سنہ ۱۹۴۳ء تک وہاں رہا اور اسی زمانہ میں قصبہ پینتے پور (جو محمود آباد سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے) کے مولوی رونق علی صاحب وارثی کی صاحبزادی سے عقد ہوا۔ محمود آباد کی ملازمت ترک کرنے کے بعد سنہ ۱۹۴۶ء تک لکھنؤ اور پینتے پور میں رہا۔ بسلسلہ کار زمینداری شاہجہاں پور (یو۔پی) آ گیا جہاں سپلائی راشننگ انسپکٹر ہو گیا اس کے بعد سیلز ٹیکس میں لے لیا گیا۔ اسسٹنٹ سیلز ٹیکس آفیسر کے امتحان میں جو محکمہ کی جانب سے ہوا تھا میں اکیلا مسلمان کامیاب ہوا لیکن پھر بھی تعصب کی بدولت مجھے ترقی نہیں دی گئی۔ مجبوراً ترک وطن کر کے پاکستان آ گیا۔ اور اب وزارت انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ میں اسسٹنٹ کی جگہ اپنے فرائض انجام دے رہا ہوں۔

شام جدائی

بن گئی جاں پہ حیرت مضطر کیسے کٹے گی شام جدائی
ہم ہیں اکیلے بے کس بیٹھے ہم سے چھٹی ہے ساری خدائی
خوش نہیں ہے دل میں کدورت چین نہیں ہے کیونکر سوئیں
جان سے اپنی ہاتھ جو دھوئیں قسمت سے ہے ڈرتا پھر کی رسائی
رنج و الم سے دیدۂ تر مسلسل سر پہ مصیبت ان کا تسلسل
نالہ کی شدت صورت بلبل ہائے دہائی ہائے دہائی
بن گئی جاں پر حیرت مضطر کیسے کٹے گی شام جدائی

شوق محبت، حسن فرقت، عالم غربت، محرومی الفت
دل پہ یہ محنت، جان پہ آفت اپنی یہ حالت اُن کی یہ صورت

سوزِ محبت ان کا جلانا، ہمکو یہ حسرت اُن کا ستانا
دل میں تمنّا سر میں یہ سودا، آنکھوں میں جلوا اس پہ تکلیفت
سر پہ یہ آفت، دوریٔ منزل سخت مسافت پا بہ سلاسل
چین نہ راحت چپ ہوں تو مشکل رد ہیں تو اتنی تاب نہ طاقت
بن گئی جاں پر حیرت مضطر کیسے کٹے گی شامِ جدائی

کوئی نہ ہمدم کوئی نہ ساتھی کوئی نہ یاور کوئی نہ حامی
آئیں وہ آئیں خوب ستائیں ہم کو گوارا ان کی غلامی
نامہ بروں نے ساتھ جو چھوڑا رشتۂ الفت بیچ سے توڑا
ہم میں اور ان میں جذبِ محبت بن کے رہے گا مثلِ پیامی
دل سے مٹا دے دل کی سیاہی ہم سے چھڑا دے حالِ تباہی
آجا آجا دل میں سما جا جلوۂ دلبر ماہ تمامی
بن گئی جاں پر حیرت مضطر کیسے کٹے گی شامِ جدائی

خالد ڈاکٹر تصدق حسین

میرے کوائف حیات بہت مختصر ہیں بیسویں صدی کے اوائل میں بمقام پشاور پیدا ہوا۔ جہاں میرے والد میاں محمد بخش ان دنوں ملازم تھے۔ اصل وطن بٹالہ ضلع گورداسپور ہے۔ یہ شہر میرے آباؤ اجداد نے آباد کیا تھا۔ میرے بزرگ لودھی خاندان کے زمانے میں مسلمان ہوگئے اور اس وقت سے لے کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے تک بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز رہے چنانچہ ان کی خدمات کا اعتراف تقریباً ہر فرمانروائے ہند نے کیا۔ میرے بزرگ صرف ہندوستان کے سیاسی امور ہی میں دلچسپی نہ لیتے تھے۔ بلکہ ابتدا ہی سے اس خاندان میں علم و ادب کا شوق رہا۔

میری ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول راولپنڈی میں ہوئی۔ میں اپنے اسکول میں پہلا طالب علم تھا جس نے پانچویں آٹھویں اور دسویں جماعتوں میں وظیفے حاصل کئے اس کے بعد گارڈن کالج راولپنڈی سے اوّل درجہ میں انٹرمیڈیٹ کیا۔ وہاں کی منروالٹری کلب کا سکریٹری اور صدر رہا۔ بی۔اے کی ڈگری گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۲۱ء میں حاصل کی کالج میں اپنے جملہ مضامین کے تقریباً ہر امتحان میں اوّل رہا۔ اسی سال لیبر موومنٹ ان انڈیا کے موضوع پر ایک مقالہ "مالک رام اسٹے" پرائز کے سلسلہ میں لکھا گیا۔ انعام مجھی کو ملا۔

ناساز گار حالات کی بنا پر۔ ایم۔ اے میں داخلہ نہ لے سکا۔ میرے دوسرے بھائی مختلف جماعتوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس لئے میں نے اسلامیہ ہائی سکول پٹیالہ میں ملازمت اختیار کر لی دو سال بعد۔ ایم اے۔ اور پنجاب سول سروس کے مقابلہ کا امتحان دیا۔ اور دونوں میں کامیاب ہوا۔ ای۔ اے۔ سی کے امتحان میں ریکارڈ نمبر حاصل کئے ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۳۴ء تک پنجاب کے مختلف اضلاع میں بطور مجسٹریٹ متعین رہا فطرتاً آزاد طبع واقع ہوا تھا۔ اس لئے ملازمت کی وہ قیود جن سے ضمیر متنفر تھا۔ گوارا

نہ کر سکا۔ اسی بنا پر ۱۹۳۲ء میں لندن یونیورسٹی سے فارسی ادبیات میں بی۔ اے آنرز کیا اور اوّل رہا۔ اسی سال لنکن اِن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۵ء میں لندن یونیورسٹی نے انڈو ایرین فلالوجی کے شعبے میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی۔ سابقہ برطانوی ہند میں اس سے پہلے اس شعبے میں کسی نے یہ ڈگری حاصل نہیں کی۔ قیامِ انگلستان کے دوران میں پہلا [illegible] تھا جسے لندن یونیورسٹی یونین نے اپنا ڈپٹی پریذیڈنٹ منتخب کیا۔ اس سے پہلے یہ عہدہ ہمیشہ کسی پروفیسر کو ملتا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے اسے اپنا فیلو منتخب کیا۔ ۱۹۳۵ء سے لاہور ہائی کورٹ میں بطور بیرسٹر پریکٹس کر رہا ہے۔

شاعری کے ساتھ بچپن سے مناسبت تھی چنانچہ اسکول کے زمانے ہی میں مختلف وقتی موضوعات پر نظمیں تحریر کیں۔ انھیں کوئی ادبی اہمیت حاصل نہ تھی۔ ابتدا ہی سے [illegible] ضرور رہی اور عروض سے واقفیت ہوگئی۔ کالج کے زمانے میں اقبال اور غالب کے مطالعے سے ایک طرف تو طبیعت پر فلسفیانہ رنگ چڑھ گیا اور دوسری طرف غزلیں لکھنی شروع کر دیں۔ غالب اور اقبال کے مطالعے کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ طبیعت کو سوقیت اور عامیانہ پن سے سخت نفرت ہوگئی۔ اور الفاظ میں خاص احتیاط برتی جانے لگی۔ [illegible] پسندی کی ندرت اور ایجاد کی طرف رغبت زیادہ ہوتی گئی کہ [illegible] پا کر برطانیہ کے رومانی شعرا اور پری رفیلائیٹ دور کے شعرا [illegible] کا اثر بعد کی شاعری پر پڑا۔ اس دور میں [illegible] اسی زمانہ میں [illegible] انگلستان [illegible] شعرا [illegible] شاعری کا مطالعہ کیا [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

آزاد کرا دیں شعر و ادب میں جہاں آزادی کی خاص ضرورت ہے۔ کیونکہ ان کی زنجیریں فولاد کی زنجیروں سے بھی زیادہ کڑی ہیں اسی احساس کے تحت میں نے بے قافیہ شاعری کا آغاز کیا اور اس میں وہ اوصاف پیدا کیے جو محض خارجی تغیرات سے کہیں زیادہ اہم ہیں میری مراد ایمائیت رفعت تخیل شکوہ بیان تازگی الفاظ ندرت فکر اور حسی اسالیب سے ہے جو اپنے مروجہ مفہوم سے کہیں زیادہ وسعت معنی کے حامل ہیں۔

تصور

راہ دیکھی نہیں اور دور ہے منزل میری
کوئی ساتھی نہیں میں ہوں مری تنہائی ہے
دیکھتی ہے مجھے حیرانی سے تاروں کی نگاہ
[illegible] کہیں دور کھنچے جاتا ہے
اس بلندی پہ اڑے جاتا ہے توسن میرا
کہکشاں گرد سی دیتی ہے دکھائی مجھ کو
رفعت عرش سے ملتا ہوا مبہم سا شرار
میری منزل ہے کہاں؟ یہ کبھی سوچا ہی نہیں
اس کی فرصت ہے کسے؟
دل میں اک [illegible] ہے

درد

وہ درد کہ جس سے [illegible]
چاند کچھ راہ میرے ساتھ ہوا تھا
لیکن
رہ گیا دور کہیں [illegible] اپنی
[illegible]۔
اے بزم فلک کے قاصد
[illegible] ہی منزل میں ہوا تو کیوں کر؟

جب کہ وہ خاکی بے مایہ بڑھے جاتا ہے
پست ہر ایک بلندی کو کیے جاتا ہے
بھر کے اک آہ، کہا چاند نے یوں زہرہ سے
اے نگارِ رخِ زیبائے بہارِ افلاک
میں بھی اس ہمتِ عالی پہ ہوں حیراں
شاید
حسنِ سلمیٰ کے تصور کا یہ اعجاز نہ ہو
جوصدا اس کا کہیں پردہ دَرِ راز نہ ہو"

تمدّن

زندگی پیدا ہوئی۔
مسکراتی شوخیاں کرتی ہوئی
زندگی،
ظلم اپنی بربریت کے نشے میں چور
ظلم
اٹھتا ہے استقبال کو
تو محبت ڈھونڈتا ہے اس ستم آباد میں
آہ اس دنیا میں سب کچھ ہے مگر اک دل نہیں
رنجِ محنت عشرتیں رسوائیاں ناداریاں
ناداریوں کی لعنتیں
عشرتیں بیباکیاں حرص و ہوا کی ذلتیں
جلبِ زر میں اقتصادی حیلہ سازی کے فریب
حکمتِ ہیکاولی، نسلی تکبر، جوعِ ارض
یہ ضلالت کے دلِ انسان میں ہیں اب جانشیں
یہ تمدن ہے [illegible] پہ آج ہم کو ناز ہے

رفیق خاور

"زور قلم کا ذکر آیا تو ذہن خود بخود رفیق خاور صاحب کی نظم "آفتاب" کی طرف منتقل ہو گیا۔ خاور صاحب اردو نظم اور نثر میں برابر نئے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ امید ہے نظم کا یہ تجربہ آپ کو پسند آئیگا۔"

وقار عظیم (ماہ نو بابت دسمبر ۱۹۴۹ء)

راولپنڈی کے کڑکڑاتے جاڑوں کی ایک رات جب کہر نے قنات لگائی تھی اور پو پھٹنے کو تھی میں نے اس معمورۂ ہستی پر آنکھ کھولی۔

یہ فروری ۱۹۱۰ء کی پندرھویں تاریخ تھی اگرچہ سن اور تاریخ کے بارے میں راویوں کے بیانات کچھ مختلف ہیں۔ شاید قدرت یہی چاہتی تھی کہ میری ننھی روح اور ننھا جسم شروع ہی سے سرد و گرم زمانہ کا عادی ہو جائے۔ اس لئے اس نے رات کے بے پناہ پالے کے فوراً ہی بعد مجھے ایک دہکتی ہوئی انگیٹھی میں جھونک دیا جو کمرے کو گرم رکھنے کے لئے مسہری کے پاس ہی جل رہی تھی۔ لیکن اس بیسویں صدی میں بھی آگ قدرت حق سے گلزار بن گئی اور میں اپنے منہ پر دغل کی بدولت ایک معمولی سا داغ لئے ہوئے بچ نکلا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس چھوٹے سے کلیم کے لئے وہ انگیٹھی ذرا سی طور تھی اور یہ آگ کے ساتھ قدرتی لگاؤ بھی تھا جو میری روح ناشکیب کو اس کی طرف لے گیا۔ شاید اس لئے میری ہستی ایک اگنی کنڈ بن گئی ہے اور میرے خیالات اور اسلوب سے ایک نہ بجھنے والی جوالا جھلکتی ہے۔

آج بھی میرے چشم تصور میں راولپنڈی کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں، دور سے دکھائی دینے والے اونچے اونچے برف سے ڈھکے نیلگوں پہاڑوں، کمپنی باغ، ٹوپیا رکھ، دریا سواں اور اجلے پانی کے جوہڑوں کے ساتھ ساتھ جن پر جاڑوں میں کہرے کی وجہ سے برف کی ہلکی سی شفاف تہ جم جاتی تھی، زمین دوز قلعوں کے سرخ سرخ دروازے، چمکتی ہوئی نیزوں بھٹیاں جن میں اینٹیں پکائی جاتی تھیں، برسات میں امڈی ہوئی مٹی سے گدلا پانی اور کہیں دور دور تک سیدپور کی پہاڑیوں کا منظر دکھائی دیتا ہے جن پر کبھی کبھی

وہ آگ جسے جنگلات کی آگ کہا جاتا تھا۔ اِدھر اُدھر پھیلتی اور گھٹتی بڑھتی دکھائی دیتی ہے جس طرح توے کی پشت پر کبھی چمکتی کبھی بجھتی چنگاریوں کی پیچ بل کھاتی لکیر۔ غرض راولپنڈی ایک شاعر کے لئے خوب شاعرانہ شہر تھا۔

خوش قسمتی سے گھر کی فضا بھی نہایت علمی اور شاعرانہ تھی کیونکہ قبلہ والد صاحب کا علمی و فنی ذوق تمام بچوں (ہم آٹھ بھائی ہیں اور ایک بہن) میں منتقل ہوا تھا اور وہ مدرسہ بھر میں لائق فائق مشہور ہونے کے علاوہ شعر گوئی میں بھی طاق تھے جس طرح وہ آج وسیع تر حلقوں میں بھی معروف ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق اور ڈاکٹر تصدق حسین خالد سے قطع نظر جن کی حیثیت خالص ادبی ہے۔ دوسرے بھائی بھی شعر و ادب کا شدید ذوق رکھتے تھے گھر کے افراد اور مجلسوں میں اکثر شاعرانہ اکھاڑے جمتے اور خوب نوک جھونک ہوتی۔ غالب اور اقبال پر اکثر بحثیں ہوتیں چنانچہ میں دوسری تیسری جماعت ہی میں تک بندی کرتا تھا ایک دفعہ ایک ہم جماعت کی شان میں کچھ کہہ ڈالا جسے وہ ہیڈ ماسٹر کے پاس لے گئے جو اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ انہوں نے بہت ڈانٹا اور ہماری شاعری کرکری ہوگئی۔ پانچویں یا چھٹی جماعت میں اقبال کی "اسرارِ خودی" اور دیوانِ غالب بذریعہ شرح طباطبائی روشناس ہوا۔ بھائی کہتے تھے کہ یہ دونوں بہت مشکل ہیں لیکن میں پڑھتا تو ان میں کوئی خاص اشکال دکھائی نہ دیتا۔ اس لئے بہت حیران ہوتا۔ اس زمانہ میں گھر کے عروضیوں کی بدولت مشکل سے مشکل شعر کی تقطیع کر لینا اور راستا دول اور اور بعد میں پروفیسروں کے لئے عذابِ جاں بنا رہتا۔ نویں جماعت میں دیوانِ نظیری نقابہ عرفی اور سنئہ ظہوری کو گھنٹوں پڑھتا رہتا جو اتفاق سے ایک ہی جلد میں مجلد تھے اِن شعرا کا موازنہ غالب سے کرنے کے لئے ان کا "کلیاتِ فارسی" لکھنؤ سے منگوایا اور دن رات اسے پڑھتا رہتا یہاں تک کہ سوتے وقت بھی وہ سرہانے رکھا رہتا۔

کالج میں ایم۔ اے سے پہلے علمِ ریاضی اور سائنس ہی سے شغف رہا اور ان میں ہمیشہ امتیاز حاصل کرتا رہا جو انعامات کی صورت میں اتنا دبت سے خالی نہ تھا لیکن بی۔ اے میں ان سے روگرداں ہو کر ادبیات کی طرف رجوع کیا اور فارسی (بی۔ اے) میں ریکارڈ نمبر حاصل کئے۔ ایم۔ اے (انگریزی و فارسی) کے بعد دنیائے قانون کی سیر کی اور پھر اسلامیہ کالج۔ لاہور میں فارسی اُردو لیکچرار رہا۔ اگرچہ سیاسیات کا ذوق اتنا تیز نہیں پھر بھی ایک عرصہ تک بڑی شدومد سے تحریکِ پاکستان کی حمایت میں

مضامین لکھتا رہا چنانچہ میرے پھوپھیرے بھائی مہر کفایت علی نے "کانفیڈریسی آف انڈیا" کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اور جسے نواب محمد دین مرحوم نے شائع کیا تھا جس نے اس کی تلخیص اردو میں مسلم لیگ کی قرارداد پاکستان سے پہلے شائع کی تھی۔ اور "طلوع اسلام" میں بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی۔ آخر کار "شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما" کے مصداق ادارۂ مطبوعات۔ پاکستان کے ماہنامہ "ماہِ نو" کی کشش "علی الرغم دشمن" مجھے میدانِ صحافت میں لے آئی تب سے اب تک "تو من شدم من تو شدم" کا سلسلہ جاری ہے۔

ادبی زندگی کا آغاز کالج ہی میں ہو چکا تھا۔ ابتدا میں حافظ محمود شیرانی مرحوم کو اپنے وطن بٹالہ ضلع گورداسپور (مشرقی پنجاب) جہاں کے فرد جلیل میرے چچا میاں فضل حسین مرحوم کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ کی ادبی سرگرمیوں کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں جو "پنجاب میں اردو" میں شامل ہیں۔ ان دنوں گورنمنٹ کالج۔ لاہور پنجاب کا کیمبرج تھا۔ یہاں نئی روح اور نئے ذوق کا ناقوس زور و شور سے پھک رہا تھا۔ اس میں پہنچتے ہی رسالہ "راوی" کے کشتی رانوں میں شامل ہوا اور مختلف صحبتوں میں حصہ لینے لگا۔ خود بھی مقالے لکھتا اور شد و مد سے بحث بھی کرتا۔ یہی مشغلہ حلقہ ارباب ذوق" میں بھی جاری رہا۔ جس نے مجھے ایک طوفانی قسم کے نقاد کی شہرت دلا دی۔ ایسا نقاد جس سے دنیا دور بھاگتی ہے قریب نہیں آتی۔ یہ ہنگامے برسوں قائم رہی اور اب بھی باقی ہے۔

طالبعلمی کے زمانہ میں ایک شخص سے حفیظ کے "شاہنامہ اسلام" پر بحث ہوئی۔ اور یہ شرط ٹھہری کہ میں اس کے مقابلہ میں کتاب لکھ کر دکھاؤں۔ چنانچہ ڈھائی مہینے کے عرصہ میں تقریباً دو سو صفحات کی ایک کتاب لکھ ماری جو بظاہر ایک منظوم سوانحعمری لیکن درحقیقت۔ ایک ڈرامائی مطالعہ ہے۔ فنی اعتبار سے بھی یہ توجہ کی مستحق ہے۔

دوسری تصنیف "خاقانی ہند" میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ حالی کے بعد اردو ادب و تنقید کی نئے سرے سے تشکیل کرنی چاہئے۔ مختلف ابواب میں سوانح نویسی ماحول، ذہنی تجزیہ مطالعہ کلام اور موازنہ کے نئے اصولوں اور طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ادب و تنقید کی تشکیل نو کے سلسلہ میں اس کی اہمیت اب بھی باقی ہے۔

کئی سال بعد اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر خالد کے ساتھ ایک چھوٹی سی کتاب

"اقبال اور اس کا پیغام" لکھی جو بے حد مقبول ہوئی اور ابتک واحد تصنیف ہے جس میں علامہ مرحوم کی شاعری اور فلسفہ پر پہلی بار کی سے تنقید کی گئی ہے۔ بلکہ اس میں راقم الحروف کے اپنے افکار و خیالات بھی کافی جھلکتے ہیں۔ ارادہ ہے کہ اس موضوع پر ایک اور بسیط کتاب لکھوں۔ فی الحال اقبال کی چار کتابوں "بانگ درا" "ضرب کلیم" "بال جبریل" اور "ارمغان حجاز" کی مفصل شرحیں تحریر کی ہیں جو عنقریب منظر عام پر آئیں گی۔

اپنی ہمادرج بیگم تصدق حسین کی شرکت میں ایک ناول "قلوپطرہ" پیش کیا جسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد ایک ڈراما "شاہجہاں" شائع کیا جو اس صنف کے مولوں میں نادر حیثیت رکھتا ہے۔

مشہور روسی مصنف پدوکن کی اداکاری پر لکچر اور خلیل جبران کی تین کتابوں کے تراجم ہمارے ملک کی عجیب و غریب صحافتی فضا کی وجہ سے فرضی یا دوسروں کے ناموں پر شائع ہوئے۔

پاکستان قائم ہونے پر "پاکستان کے گیت" کے نام سے طبع زاد قومی نظموں کا پہلا مجموعہ ترتیب دیا جس میں تصور، تکنیک اور محاکات کی حیثیت سے بعض اہم اضافے دکھائی دیں گے۔

میری دلی خواہش یہ رہی ہے کہ اردو میں ایسی کتابیں لکھی جائیں جو زندگی اور ادب وفن میں ایک نئی روح پھونک دیں اور سرسید، حالی اور آزاد کی نشاۃ اولی کے مقابلہ میں شدید نشاۃ ثانیہ پیدا کریں۔ یہ تمام قدیم وجدید تحریکات، نظریات اور ادب وفن کے بسیط مطالعہ اور انتہا درجہ غور و فکر پر موقوف ہے۔ چنانچہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے میں نے ادبیات ایران اور اردو ادب کی مبسوط تاریخیں تحریر کیں، غالب کے انتخاب فارسی و اردو پاروں کا انگریزی نظم میں آزاد ترجمہ کیا، بلینک ورس میں متعدد ڈرامے تحریر کئے جو اس سے قبل نہ ہوئے تھے، تمام دنیا کی تاریخ لکھی، غالب کا ڈراما تیار کیا اور پینسٹھ انگریزی نظمیں، پانچ سو نظمیں لکھیں جو ضخیم تھیں۔ یہ تمام مسودے دہلی کے فسادات میں ضائع ہو گئے اور اب میں ان کو دوبارہ مرتب کر رہا ہوں۔ ارادہ ہے کہ فن تنقید پر ایک مبسوط کتاب لکھوں جو فکر و فن کی ... اختیار کرے۔ نیز ہماری عمر و معاون ہو بمشکل تمام چند ضائع شدہ نظموں کو یاد کر کے دوبارہ تحریر کیا ہے اور

انھیں "شعلۂ درویش" کے نام سے ایک مجموعہ کی صورت میں عنقریب شائع کر رہا ہوں۔ منظوم تراجم میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی "ویسٹ لینڈ" اور چند دیگر منظومات ہے۔ ایم ہاپکنس کی "Wreck of the Deutschland"
اور شیلے کی "Ode to the West Wind" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ایک مفکر کی حیثیت سے میری انتہائی کوشش یہ ہے کہ کسی نظریہ، شخصیت یا اسلوب میں گم ہونے کی بجائے اپنا زاویۂ نگاہ پیدا کیا جائے اور سلسلۂ فکر کو اس حد سے آگے بڑھایا جائے جس حد تک ہمارے پیشرو بالخصوص اقبالؒ اسے پہنچا چکے ہیں۔

میرے لئے شاعری آزادی ہے۔ احساس میں، تخیل میں، بیان میں، زبان میں جو کچھ ہو ڈگر سے پرے ہٹ کر ہو اور فکر و فن میں ریکبٹ کو کم سے کم دخل ہو۔ یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ ہمارے احساسات صرف دل و دماغ کے احاطے میں داخل کر دی نہیں بلکہ ان کی آگ میں جل کر نکلیں۔ اس کے کئی درجے ہیں۔ کوئی کم سوز اور کوئی نیم سوز اور کوئی سراپا سوز یہاں تک کہ وہ التہاب کے درجے تک پہنچ جائیں۔ جلال جمال، حقیقت مجاز، محاکات، تکنیک اور آہنگ سب آپس میں مدغم ہو جائیں۔ یہ احساس مجھے خود بخود آزاد شاعری کی طرف لے گیا اور یہ اس وقت جب آزاد شاعری کے دوسرے ہمراہی اپنے طور پر نئی فضا کا اثر قبول کر کے اس کے علیحدہ علیحدہ نمونے پیش کر رہے تھے۔ میرے عروضی اور تکنیکی تجربے دوسروں سے بالکل الگ حیثیت رکھتے ہیں اور بعض تمام تر مجھ سے مخصوص ہیں مثلاً انگریزی بلینک ورس کی ہر وضع نظم و آزاد جو طویل نظموں اور ڈراموں وغیرہ میں برتی جا سکے۔ "ترتیل" جو غزل اور نظمِ آزاد کا امتزاج ہے اور بلینک ورس میں ڈرامے۔ "جہیدہ آہنگ" جو سالقہ نرم اہریہ آہنگ سے صریحاً مختلف ہے اور ہماری شاعری کو عروضی حیثیت سے نئے راستے پر ڈال دیتی ہے۔ میری حالیہ کوششوں میں داخل ہے۔ میں لے شاعرانہ موسیقی کا ددتیو ریت قرار دیتا ہوں یعنی سروں کا اتار چڑھاؤ مغربی موسیقی کی طرح عمودی ہے افقی نہیں۔ اس آہنگ کی وضع یونانی نہیں گو تلک سے ہے جس میں ملائمت کی بجائے سختی اور توانائی ہے۔ محاکات اور بیان میں بھی ایسی ہی برائی اور تیزی ہے۔ بول تیکھے ہیں سریلے نہیں اگرچہ اس تیکھے پن میں ایک جری قسم کا سریلا پن ہے۔ تفصیل کی بجائے شوخ نکتے ہیں جن سے ناظر پوری عبارت اور مضمون خود

اخذ کرتا ہے اور ایسی لفظی و معنوی باریکیاں ہیں جنھیں ورائے شاعری قرار دیا جا سکتا ہے مثلاً برقی چراغاں، بلدرم سے ملا ہے، کرنوں گوندے بال سنہرے کل گھوڑوں (توپوں) کی تھرائی ٹاپیں - یہ "تلازماتی پیرایہ" تاثراتی نظم "دریا" میں بخوبی نمایاں ہے - نظم بعنوان "آفتابیا" (مطبوعہ "ماہ نو" بابت مئی ۱۹۵۰ء) میں یہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں - طویل نظموں میں "حیات نو ہو رہا ہے پیدا" (مطبوعہ "ماہ نو" بابت اگست ۱۹۵۰ء) ایک نیا تجربہ ہے جس طرح آج سے سترہ برس پہلے "رود پنجاب کے کنارے بنا ہیں" (مطبوعہ افسانہ نمبر "ادب لطیف" ۱۹۳۹ء) خیال یعنی بیلڈ کی صنف میں نیا تجربہ تھا - اور وہ شاعری کی رفتار کو سمجھنے کے لیے ان کا مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ ان کے اردو شاعری اور ادب کے مستقبل پر اثر انداز ہونے کے وسیع امکانات ہیں۔

انتخاب -

موجوں کا سمندر میں تلاطم دیکھو | شوریدہ عناصر کا تصادم دیکھو
پھر میرے جنوں شوق سے بیٹے ہیں | ہنگامہ بے تابی قلزم دیکھو

اس طرح ابھرتی ہیں امنگیں دل سے | جس طرح تجلیاں مرے گل سے
یا ابر بہار کی گھٹاؤں سے تجلی | یا گل کی اگن چمن کے آب و گل سے

دنیا کی ہر اک چیز کو زیبا پایا | اس باغ کے ہر پھول کو زیبا پایا
دریا، بادل، زمین، تارے، کہسار | ہر ایک کو حیرت تماشا پایا

ہم زیست کو کشتی میں گنوا ڈالیں گے | اس کشتی کو دریا میں بہا ڈالیں گے
پروائے حوادث زمانہ کیا ہے | امواج میں آشیاں بنا ڈالیں گے

کھلی ہیں ابھی تک محبت کی راہیں | ترا راستہ دیکھتی ہیں نگاہیں

ہائے راتیں جو انہوں کی | لب پہ افسانہ دیوانوں کی
الفت لیلی ہمہ مصوّر | دل کی رنگینیاں کہانیوں کی
اے پری خیموا بات کیا ہے | تیری شیوا بیانیوں کی
ہیچ ان تار تار زلفیں | ناچتی ہیں پانیوں کی

چمن سے باد بہاری کچھ ایسی در رہی | وہ اک قدم دیدہ و دل وہ آشیاں ہی
اٹکے ہوئے پلکوں میں آنسو | رات تنا سے جگنو جگنو

کون دہکاں کی آخری حد ہو — اس پہ بیٹھے ہوں میں اور تو

مری آنکھوں کے آگے اس طرح وہ سانولی آئی — میں سمجھا سانجھ شنگرفی دھنک میں رس سی آئی
جھپکتی آنکھ جیسے شام کا ہنستا ہوا تارہ — افق کے آخری پردے سے جو اک جھلکتی آئی
سلونا کندنی چہرہ لباس ارغوانی میں — سنہرے دام میں جیسے کوئی شاما چلی آئی

وہ پیلی پیلی رنگت وہ کھلتی رنگینی — وہ نرمیلے پتے کنوارے کنوارے
کیوں نہ ہوں پھر آہیں آئینا کیوں نہ پھر گھبرا جائے
اور ہی حالت ہو جاتی ہے جب دل کسی پہ آ جائے

سیلاب بند ہو نہ سکا گھیر و دار ضبط کا — جو رک گئیں ادھر تو ادھر ندیاں چڑھیں

صبحیں بے چینی لاتی ہیں، شامیں بے خوابی لاتی ہیں
دل لاتی ہیں سیماب نما آنکھیں سیلابی لاتی ہیں

کبھی نوش سمجھ کے اسے جو چکھا کبھی تو زہر ہی کیا
جو تھا نیش وہ نیش ہی تھا جو ہو تلخ نبات ہی کیا

آشفتہ کرم سیہ چوب نے زیست سے — اس برق کو عناں بہ عناں پا بہ پا کیا

جب چمن میں بہار آئے — پھر گلوں پہ نکھار آئے
جیسی رنگینیاں ابھاریں — ایسا لیل و نہار آئے
ہر طرف نافہ ہائے گل سے — بوئے مشک تتار آئے
اٹھ کے ناچیں ہوا کی موجیں — وجد میں شاخسار آئے
ہر ایک پتی دلہن کی صورت — پہنے شبنم کا ہار آئے
ننھے غنچے تپاک سے آئیں — خود بخود دل کو پیار آئے
نغمے کوئل کے گونج اٹھیں — تان بھرتی ہزار آئے
ہے یہی شوق کی تمنا — یہ سماں بار بار آئے
لیکن اے حسرتِ تماشا — دل کو کیسے قرار آئے
جب کہ روحِ بہار بن کر
سامنے وہ نگار آئے

ایک بازارِ چراغاں ـــــ کہکشاں!

کہکشاں زہرہ کی انگڑائی ہے
حور کا عشوۂ لیلائی ہے۔
تری جدائی میں دل ایسے بھڑ پھڑاتا ہے
اندھیری رات میں جیسے ڈپٹتے جھونکوں سے
ہوائے تند کے اک لق و دق بیابان میں
سفید خیموں کے پر دے نفس نفس پھڑکیں۔

یہ بدلتے ہوئے بہار کے حسین
جیسے بچپن کنول سے ہاتھوں سے
اک عجیب و غریب البم کے
دم بدم نو بنو ورق الٹے

آتش رنگ۔ گورا گورا بدن چاند سا ترا
جیسے تاروں کے جوہروں کی مورتی۔
جوت سے ہو چکا چوندھ کے طور
جگمگاہٹ سے بیقرار چشم حور
چھت کے فوارہ سے بوندیوں کی دھار
ایک چھٹکی ہوئی موتیا پھوار
فرق سے پاؤں تک انگ انگ پر
ایک جھالر کہ سحر طلسم سکار
تار ہی تار ریشم کے تابدار
جلتے سورج کی چھنتی شعاعوں سے
بوندیاں سب گہر ہائے رنگ رنگ
ہو بہو جیسے رنگیں آبشار
لوح مرمر پہ جھرتا ہو بیقرار
یا بچھا ور کرے پھول بے شمار

مست دولھا محبت کے جوش میں
اپنی کامنی دلھنیا پہ بار بار
اک شعبدۂ رنگ نیرنگ نظر ہے؟
اعجاز تخیل کا ہے یا معجزۂ نور؟
یہ بزم شہود ایک حقیقت ہے کہ دھوکا!
موجود کہ نابود؟
تاریکی پیدا ہے کہ پیدائی بے نور؟
عقل اس کی حقیقت کے سمجھنے سے ہے معذور
کیا جانئے کیا ہے!
دو بینا تاروں کی سیمیائی سی
پیچ کھاتا ہوا دھواں اس کا
کہکشاں "جوت بھر" سینائی

کھیل:— اک ندی کی سطح پر ہنستے بلبلے رواں
بچے ان کو کنکروں سے پھوڑتے ہوئے!

دیا:— اچانک دیا بجھ گیا
تیرگی ٹوٹ کر آئی — ریلا
سیاہی کا — اڑتی ہوئی ریت
جرار آندھی!
گرا دفعتاً فرش پر رات کا
شامیانہ!
بھسم ہو کے جیسے
کوئی پر جلا — بھنورے جیسا
پتنگا!

خواب کا افسانہ (بیلڈ)

بس خاموش کھڑا تھا بن میں — بدلی گھر کر چھائی تھی
ہلکی ہلکی مست پون میں — مدھ کی ترنگ سمائی تھی

بھاری بھرکم پیڑ کھڑے تھے   اک سناٹا تھا ہر سو
کرتے تھے کہسار سے قلعے   میری طبیعت پر جادو
ایسا نظر آتا تھا گویا   اونچی اونچی فصیلوں سے
کالے کالے دیوؤں کا پہرہ   پریوں کی خاطر شام سحر
ایک طلسماتی پرچھائیں   جھلمل کرتی آئینہ وار
اوپر نیچے دائیں بائیں   ہر سو بجلی کی تلوار
بن پر اک کھویا سا عالم   ہلکی ہلکی آواز میں
کرتی ہوں سرگوشیاں باہم   جیسے ہواؤں میں رقص
ایسا نظر آتا تھا بن میں   فطرت کھیل دکھائے گی
ہر اک شے بھی اس دھڑکن میں   کس بہروپ میں آئے گی
یکدم مجھ کو جھاڑ کے اوجھل   ایک تصویر نظر آئی
گویا اٹھا پردۂ محمل   اک تصویر نظر آئی
غازے کی اجلی سرخ دھنک تھی   چہرے پر مانند سحر
ایک مسلسل لہر سنہری   گردن جیسی چوٹی سی
ہر پتھر اس تابانی سے   صورت طور چمکتا تھا
ہر ذرے کی پیشانی سے   حسن کا نور جھلکتا تھا
دھوپ سراسر دھوپ کا عالم   سورج اپنے جوبن پر
کرتی تھی سرگوشیاں باہم   جیسے کھنکتے ہوں زیور
آناً فاناً خلد کی نکہت   چاروں جانب پھیل گئی
ہر اک پیڑ میں برق کی صورت   حسن سے اس کی سبیل گئی
رفتہ رفتہ سورج ڈوبا   کھینچ کے اپنا دامن نور
سمٹ سمٹ کر سیل تجلی   ہوئی دھندلکے میں مستور
اب بھی میرے ذہن میں جنگل   سائیں سائیں کرتا ہے
جیسے پتھر میں ہو کر بے کل   کوئی آہیں بھرتا ہے
اب بھی ہیں گیسوئے معنبر   آنکھوں میں لہرائے ہوئے
اب بھی ہیں میرے دیدۂ دلبر   نور کے بادل چھائے ہوئے

خمار

نجم الحسین انصاری

سن پیدائش: ۱۹۳۰ء

وطن: ڈبائی (ضلع بلند شہر، یو۔ پی)

۱۹۴۷ء میں میرٹھ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اس کے بعد تقسیم ہند کے ہنگامے کی وجہ سے دو سال تک تعلیمی سلسلہ منقطع رہا۔ ۱۹۵۱ء میں سندھ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا اور آج کل اردو کالج میں ایم۔ اے فارسی کا طالب علم ہوں۔

باقاعدہ شاعری کا دور ۱۹۴۲ء سے شروع ہوا۔ اصلاح کسی سے نہیں لی اور اپنے ذوق وجدان ہی پر بھروسہ کیا۔ رجحانات۔ ترقی پسندانہ۔

کچھ شعر:

یقیں تو آچلا تھا تیرے گیسوؤں کی رات پر ۔۔۔ مگر میری نگاہ پڑ گئی غمِ حیات پر

ہم نئے دور کے پیمبر ہیں ۔۔۔ ہم نے بدلی ہے وقت کی رفتار

کہیں کہیں پہ مسرت مگر بہت محدود ۔۔۔ خوشی ضرور ہے لیکن کسی کسی کے لیے

تمہارے بعد بہار آئی تو آئی لیکن ۔۔۔ فسردہ ہونٹ ترستے رہے ہنسی کیلئے

تمہارے حسن کی دل پر اٹھی تھی چوٹ پڑتی ہے ۔۔۔ بہارِ زندگی ہے گلستاں در گلستاں اب تک

جاگی ہوئی فضا میں ذرا بانکپن تو ہے ۔۔۔ یہ کل کے آفتاب کی پہلی کرن تو ہے

خیال

نبی حسن مینائی بی۔ اے

نبی حسن نام، تخلص خیال، مینائی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ حضرت امیر مینائی کے جانشین اعتبار الملک حضرت دل شاہجہاں پوری سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ میری پیدائش ۲۹ رجب ۱۹۲۹ء

ہے اور وطن شاہجہاں پور۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

دلِ ناشناس نالۂ شبگیر ہی رہا — ہم فطرتِ سلیم کو رسوا نہ کر سکے
عمرِ دو روزہ کاٹ دی ہنس ہنس کے اے خیال — دنیا میں رہ کے بھی غمِ دنیا نہ کر سکے
ذرّہ ذرّہ مجھکو دے گا میری منزل کا پتہ — جب طبیعت بے نیازِ مدّعا ہو جائے گی
یہ تو رودِ عشق ہے اے چارہ سازِ زندگی — تیر کھینچنے سے خلش دل کی سوا ہو جائے گی

احمد دانش

حالاتِ زندگی کیا، بس یوں سمجھ لیجئے کہ آج سے تقریباً اٹھارہ سال قبل پٹنہ ضلع کے ایک گاؤں بیجی پور میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم مکان پر ہوئی۔ پھر ایک ہائی اسکول میں داخل کر دیا گیا ابھی تعلیم کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ہمارا ملک ایک عظیم انقلاب سے دو چار ہوا ۱۹۴۷ء میں آزادی کا جھونکا آیا اور مجھے اپنے ساتھ لے اڑا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ جیسے تیسے کرکے ڈھاکہ میں قدم جمایا ورنہ معلوم نہیں اب تک کرۂ ارض کے کس حصے میں رہتا۔ یہاں رحمت اللہ ماڈل ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد اندلون کالج میں زیرِ تعلیم ہوں اور ابھی اس سلسلے کو جاری رکھنے کا مصمم ارادہ ہے۔ انشاء اللہ!

اب تک زندگی کی تلخ حقیقتوں سے دو چار ہوں۔ اس پر ایمان رکھتا ہوں کہ موجودہ نظام میں ایک متوسط طبقے میں پیدا ہونا انسان کے لئے سب سے بڑی لعنت ہے۔ اس لئے پرانے نظام کو ختم کرکے جہانِ نو کی تشکیل کا متمنی ہوں۔ کیونکہ اس کے بغیر انسانیت کی فلاح ناممکن ہے۔ اور جہاں تک اپنی زندگی کا تعلق ہے بس یوں سمجھ لیجئے۔

یہ زندگی ہے کہ رہ رہ کے غور کرتا ہوں
ابھی ہوئی بھی ہے جینے کی ابتدا کہ نہیں

اور شاعری کیا، ہاں محترم عابد دانا پوری صاحب کی نظرِ عنایت ہے کہ "تک بندی" کر لیتا ہوں۔ ایک غیر مطبوعہ غزل ارسال ہے۔

ملاحظہ فرمائیے۔

مہرِ عالم تاب ہے بالائے بام
یا چمکتا ہے کفِ ساقی میں جام

ہے یہی اک فکر مجھکو صبح و شام
تیری بے مہری کا ہو چرچا نہ عام

روئے تاباں سے ہٹا زلفِ سیاہ
صبح روشن اور تہِ دامانِ شام؟

اس گھڑی بیتابیٔ دل کچھ نہ پوچھ
جب کسی کا لب پہ آجاتا ہے نام

تم گئے اور باغ سارا تھا اداس
آئے تم اور ہنس پڑیں کلیاں تمام

وہ نگاہیں مست چنچل الاماں
دوش پر زلفوں کا وہ دلکش خرام

بڑھ کے خود ہی آشیانہ پھونک دو
بجلیوں سے کون لے اتنا سا کام

حسن حیرت خیز ہے حیرت میں غرق
دردمند آگیا اب وہ مقام

ساقی لے دانش ہے دریا دل مگر
اہلِ محفل آج بھی ہیں تشنہ کام

دائم اقبال

میرا نام دائم اقبال اور تخلص دائم ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں موضع واسو میں پیدا ہوا
تعلیم میٹرک تک ہے۔

نشیمن عرش پر ہے اور نظر تحت الثریٰ تک ہے
سفر اس کارواں کا ابتدا سے انتہا تک ہے
حقیقت میں اسی نے منزلِ کون و مکاں طے کی
سفر جس کا مدینہ سے زمینِ کربلا تک ہے

دلاور

حکیم دلاور خاں دھولپوری

میں ریاست دھولپور کا باشندہ ہوں اس ریاست کے قصبہ باڑی میں میری پیدائش ۱۹۲۰ء میں ہوئی اسی قصبہ میں میرا دیار تھا۔

میں شکمِ مادر ہی میں پانچ ماہ کا تھا کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ جب میں اس دنیا میں آیا تو سرپرستی کرنے والا کوئی نہ تھا سوائے والدہ کے۔ جب کچھ ہوش آیا تو گھر میں کتابوں کے ڈھیر اور کاغذات کے پلندے دیکھ کر پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ تو خود ہی جا کر مدرسہ محمدیہ میں داخل ہو گیا اور کچھ علم حاصل کیا۔ دل میں شوق اٹھا کہ قرآن شریف حفظ کروں۔ اس کے واسطے گوالیار گیا اور انجمن مدنی میں داخل ہو گیا۔ مگر آرزو بر نہیں آئی۔ گھر میں طبی کتابوں کا مطالعہ کیا تو علمِ طب کا شوق ہوا اور حکیم محمد یعقوب صاحب سے پڑھنا شروع کر دیا تقریباً سات سال ان کے پاس پڑھا ان کے مطب میں دوا سازی کا کام کیا۔ اس عرصہ میں وہ گوالیار چلے گئے تو میں نے پھر حکیم ملک عبد الکریم خاں صاحب مستند طبیہ کالج دہلی کی خدمت میں رہ کر اپنی پریکٹس جاری رکھی اور ان کے مطب کا کام خود سنبھالا۔ مجھکو شکار کا بہت شوق رہا ہے جس کی وجہ کر کافی نقصان بھی اٹھا چکا ہوں۔

اب جبکہ انقلاب آیا اور ہند کی تقسیم ہوئی تو اپنے قدیم وطن کو چھوڑ کر اوکاڑہ آگیا۔ اور اب یہاں ملازمت کر رہا ہوں۔

شعر و شاعری کا شوق عرصہ سے ہے لیکن اوکاڑہ میں آکر چند با ذوق حضرات کی صحبت نے میرے اس جذبہ کو ابھارا ہے اور اب میں بلا تکان شعر کہہ لیتا ہوں چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ترے تیرِ نگاہِ ناز نے بسمل بنایا ہے   وہ ابرو نے کیا ہے کام جو کرتی ہیں شمشیریں
یہی اچھا ہے دلاور چند اسے   زمانے میں آئے ہمارا زمانہ
چھوڑ کر کیا وطن کو یاد کریں   اپنا شیوہ غمِ ہجرت ہی سہی
ڈگمگاتے ہیں قدم تیری منزل آئی   میں وہاں ہوں جسے دنیا کا سرا کہتے ہیں
بہنہ یہ چل رہا ہے ہچکیوں سے   کہیں میں یاد فرمایا گیا ہوں
مرنے کے بعد آیا دلاور انھیں خیال   چکر لگا رہے ہیں ہمارے مزار کے
وہ آئیں اور آکر ہاتھ سینے پر مرے رکھ دیں   جو دل میں درد ہے میرے وہ دل کا درد ہو جائے

ذاکر
محمد اسمٰعیل خاں زکی

میں محمد اسمٰعیل خاں زکی کے نام سے یاد کیا جاتا ہوں۔ آبا و اجداد کی جائے رہائش حیدرآباد (دکن) ہے۔ میں جھانسی میں پیدا ہوا جہاں کہ والد بزرگوار جی۔ آئی۔ پی ورکشاپ میں بحیثیت چارج مین کام انجام دیتے تھے۔ میری تاریخ پیدائش یکم جنوری ۱۹۲۶ء ہے۔

ابتدائی تعلیم جھانسی میں حاصل کی اور ورنا کیولر فائنل کا امتحان پاس کرنے کے بعد والد صاحب کے تبادلہ کی بنا پر مجھے بمبئی آنا پڑا۔ والدہ محترمہ کو بمبئی کی آب و ہوا راس نہ آئی اور میں ان کے ہمراہ اپنے چچا محمود خاں سب انسپکٹر پولیس کے پاس میرٹھ چلا گیا۔ یہاں میں نے سینیئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کی۔ چچا کو ادبی ذوق حد درجہ تھا اور میں مشاعروں میں اکثر ان کے ہمراہ جایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ شاعری سے میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ سب سے پہلی غزل کا ایک شعر پیش ہے

غم کا افسانہ اگر ذاکرؔ سناتا ہوں اُنہیں
ہنس کے کہتے ہیں تمھاری تو یہ عادت ہو گئی

والدہ محترمہ مسلسل علاج ہونے پر بھی جانبر نہ ہو سکیں اور میں شفقتِ مادری سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔ حالات نے مجھے والد صاحب کے پاس بمبئی آنے کے لئے مجبور کیا جہاں شعر و شاعری کا چرچا کافی تھا۔ میں نے بحیثیت کلرک ملازمت اختیار کی۔ ابتداء ً شاعری کا زمانہ جناب رہبر دہلوی کی رہبری میں گزارا۔ پھر ۱۹۴۷ء کا انقلاب شروع ہو گیا اور میں ایک جذبہ کے تحت پاکستان آپہونچا۔ جہاں ورکشاپ اکاؤنٹس آفس مغلپورہ میں کام کر رہا ہوں اور خوش قسمتی سے جناب عبداللہ صاحب مضطر گجرانی ’بی اے‘ کی شاگردی کا شرف حاصل کر چکا ہوں۔ شعر و سخن کا مشغلہ بدستور جاری ہے اور میں اپنی فکر میں اب خاص رنگینی اور بلندی محسوس کرتا ہوں۔ کلام کا نمونہ حاضر ہے۔

ہوا دے رہا ہے زمانے کا دامن — چراغِ محبت بجھا جا رہا ہے
شرابِ جوانی سے بدمستیاں ہیں — وہ پہلو نشین ہیں مزا آ رہا ہے
تصوّر کی رنگینیاں اللہ اللہ — کوئی آ رہا ہے کوئی جا رہا ہے

دھواں اُٹھ رہا ہے چمن کی طرف سے　　نشیمن کسی کا جلے جا رہا ہے
پتہ دل کی دھڑکن سے چلتا ہے ذاکرؔ
کوئی چپکے چپکے ادھر آ رہا ہے

اگر چاہیں کشتی لگا دیں کنارے　　مگر سُست ہیں ناخدا ہی ہمارے
لرزتا ہے دل عصمتیں لٹ رہی ہیں　　لہو رو رہے ہیں فلک پر ستارے
گلوں کو نہ چھوتے جو معلوم ہوتا　　کہ ہاتھوں میں کانٹے چبھیں گے ہمارے
قیامت اٹھا دی نگاہیں بدل کر　　کوئی جی رہا تھا تمہارے سہارے
اٹھائے ہیں صدمے بہت زندگی میں　　کسی نے بھی آنسو نہ پونچھے ہمارے
نہ ہرگز سنو بات ذاکرؔ کسی کی
تمہیں چاہے کتنا ہی کوئی پکارے

نگہِ شوق بھر گئی اپنی　　تا بہ جلوہ نظر گئی اپنی
نہ کیا آپ نے کرم نہ سہی　　عمر یوں بھی گذر گئی اپنی
تھے وہی جلوہ ریز عالم میں　　جس طرف بھی نظر گئی اپنی
اس نے ایسی نگاہ سے دیکھا　　چوٹ دل کی ابھر گئی اپنی
اعتبارِ نگاہ کھو بیٹھے　　احتیاطِ نظر گئی اپنی
ہم انھیں دیکھتے رہے ذاکرؔ
دور جتنی نظر گئی اپنی

راشد

نذر محمد

نام نذر محمد لیکن اب بہت کم احباب ہیں جو مجھے اس نام کی رعایت سے جانتے ہیں جو میرے والد نے رکھا۔ اب تو صرف لوگ مجھے ن۔ م۔ راشد کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ شاعری سے مجھے کب سے لگاؤ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کئی عمریں اسی دھن میں بیت گئی ہیں

اگر زندگی کی ابتدائی منزل قارئین ضرور جاننا ہی چاہتے ہیں تو میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یکم اگست سنہ ۱۹۱۰ء میں اکال گڑھ میں پیدا ہوا اور اس کے بعد زندگی کے بحر ذخار میں کود پڑا اور بس

کیا خبر ان کو کہ کشتی پہ مری کیا گزری — دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل لئے

اکال گڑھ (ضلع گوجرانوالہ) میں ابتدائی تعلیم حاصل کی گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے۔ کا امتحان پاس کیا۔ جب اعلیٰ تعلیم کے مدارج سے گزر رہا تھا تو اس وقت شعر و شاعری کا طوفان سینے میں امڈ امڈ کر چڑھ آیا تھا۔ اگر آپ بچپن کی شعر گوئی کو شاعری کہہ سکتے ہیں تو میں بچپن میں کچھ نہ کچھ کہتا رہا لیکن بعد ازاں مجھے ایسی الجھنوں سے دوچار ہونا پڑا کہ بچپن سے مجھے ایک خواب نظر آنے لگا۔

ایک سال کے قریب ماہنامہ "شاہکار" کا ایڈیٹر رہا۔ لیکن فضا کچھ راس نہ آئی اور ملتان کمشنری میں کلرک کا عہدہ قبول کر لیا۔ احباب حیران تھے کہ راشد کو کیا ہو گیا۔ بھلا شاعر کیسے کلرک ہو سکتا ہے جس دن میں کلرک بنا اس دن بعض دوستوں نے کہا "آج راشد مر گیا" میرے گہرے دوست دنیا کی الجھنوں کو کسی اور رنگ میں دیکھ رہے تھے اور میرے سامنے صعوبات کا ایک اور ہی دفتر کھلا ہوا تھا۔ میں نے خاموشی سے دفتر کا کام شروع کر دیا اور صبح سے لیکر شام تک مسلوں میں "دفن" رہنے لگا۔ خاموش رہنے کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ تھا دوستوں کی نکتہ چینیوں پر صرف مسکرا دیا کرتا۔

شاعر ہونے کے باوجود میں سماج کے بندھنوں سے آزاد نہ ہو سکتا تھا۔ میں نے شادی کی اور اب تو میرے لئے اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ میں خاموشی سے ساتھ مسلوں کے انبار میں دبا رہوں۔

شاعری اور سماج میں اب بھی کشمکش باقی تھی لیکن میں خاموش تھا کبھی کبھی ایک آدھ نظم

کہہ کر اپنے زنگ آلود سینے کو کھرچنے کی کوشش کرتا۔

اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گیا۔ دفتر کی خشک زندگی سے نکل کر آواز کے زیر و بم اور دلچسپیوں میں پہنچ گیا۔

آزاد نظم اور اس کے ہیجانات اور معاصر جدید شاعری کے اثرات پر تو ایک مستقل مقالے کی ضرورت ہے۔ مجھے اس کڑی منزل کو طے کرنے میں مختلف دشوار گزار راستوں پر گزرنا پڑا ہے آخر کار میں نے دیکھا بلینک ورس ہی میری شاعری کا نصب العین بن سکتا ہے۔ شکل تخیل کے قصے تو خیر پرانے ہو ہی چکے تھے لیکن قدامت پسند شعرا شعر کی قدیم شکل کو ترک کرنا گوارا نہیں کر سکتے۔ اور میرا یہ خیال ہے کہ قدیم شکل میں شعر کے نئے تصورات، نئے خیالات اور نئی باتیں پیش نہیں کی جا سکتیں۔ بعض احباب کا خیال ہے کہ میں اکثر اوقات بے معنی شعر کہہ جاتا ہوں۔ لیکن مجھ سے بے انصافی ہے۔ کیونکہ میں نے آج تک ایک بھی بے معنی شعر نہیں کہا۔ اگر کوئی شعر غور طلب ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بے معنی ہے۔

انقلابی

مؤرخ، مزاروں کے بستر کا بارِ گراں،
عروس اس کی نارس تمناؤں کے سوز سے
آہ بر لب
جدائی کے لمحوں میں نزع نہایت درد ناک و نوحہ کناں!
یہ ہنگام تھا جب ترے دل نے اس غمزدہ سے
کہا "لاؤ اب لاؤ دریوزۂ غمزۂ جانستاں!"

مگر خواہشیں اُٹھیں جیسا پاریہ نہیں،
جو بھولے تھی کلیاں
کہ چولا بدل کر وقت میں کس نے پایا ہے
کس کا نشاں

یہ تاریخ کے ساتھ چشمک کا ہنگام تھا؟
یہ مانا تجھے یہ گوارا نہ تھا
کہ تاریخ دانوں کے دامِ محبت میں پھنس کر
اندھیروں کی روحِ رواں کو اجالا کہیں
مگر پھر بھی تاریخ کے ساتھ
چشمک کا یہ کون ہنگام تھا؟
جو آنکھوں میں اس وقت آنسو نہ ہوتے
تو یہ مضطرب چہاں،
ہر تازہ و نوبنو رنگ کی دلربا
ترقی اس پذیرائی چشم و لب سے
وہ ذلت کی سنہری تحریروں کی شہزادیاں،
تجھے ساتھ منزل بمنزل رواں دواں!

اسے اپنی ہی ظلمت و تیرگی کے دامِ ازل سے
رہائی تو ملتی
مگر تو نے دیکھا بھی تھا
دیوتا نار کا حجرۂ تار
جس کی طرف تو لپکے کہ سایہ تھا اتنا برے
جہاں بام و دیوار میں کوئی روزن نہیں
جہاں چار سو باد و طوفاں کے مارے ہوئے راگ پھیریاں
کی بے انتہا التجائیں مری ہیں؟
ابھی تک نہ آنکھوں میں آنسو نہ لب پر فغاں!

خلیق رازی

۱۰ر جون ۱۹۲۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوا۔ وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی ۱۹۴۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ آنرز امتیاز کے ساتھ پاس کیا یونیورسٹی میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کی وجہ سے راجہ ہرنام سنگھ ہرکورٹ بٹلر گولڈ میڈل پایا۔

ایم۔ اے کے امتحانات قریب تھے کہ والدہ علیل ہو گئیں۔ امتحان کے ۲ دن باقی رہ گئے تھے کہ اُن کا انتقال ہو گیا۔ سوئم کے دن پہلا پرچہ تھا۔ امتحان کا نتیجہ آیا میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس ہوا تھا۔

یونیورسٹی کی طرف سے ریسرچ کے لئے وظیفہ مقرر ہو گیا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اور ایل۔ ایل۔ بی۔ ساتھ ساتھ کر رہا تھا کہ تقسیم ہند نے لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور کیا۔

۵ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے دارالخلافہ پہونچا۔

یکم جنوری ۱۹۴۸ء میری زندگی کے اہم ترین واقعہ کی حامل ہے۔ گو شاعری کا بچپن سے شوق تھا۔ والد صاحب خود شاعر تھے اور ہمیشہ میرے ان جذبات کو سراہا کرتے تھے مگر اصل میں یہ حادثہ ہی باقاعدہ طور پر شعر کہنے کا محرک ہوا۔ اس زمانے کی دو غزلوں کے دو شعر نقل کرتا ہوں۔

پینا حرام ہے نہ پلانا حرام ہے
پینے کے بعد ہوش میں آنا حرام ہے

ناز کر اس دولتِ کونین پر
وہ بھی رازی تجھ سے کچھ غافل نہیں

ترقی پسندوں میں فیض۔ راشد۔ سردار جعفری سے متاثر ہوں۔ آزاد نظمیں لکھنے کا شوق تو نہیں ہوا۔ آپ سے آپ کچھ نظمیں غیر شعوری طور پر ہوتی گئیں۔ کاوش کرکے نہ کبھی غزل کہی اور نہ نظم۔ اور یہی وجہ ہے کہ متفرق اشعار بہت سے کہہ لئے ہیں۔

ردیف و قافیے کی الجھنیں اور پابندیاں بالکل نہیں بھاتیں۔ شعر اپنے لئے کہتا ہوں نہ سُنانے کے لئے اور نہ چھپوانے کے لئے۔ دونوں سے حتی الامکان احتراز کرتا ہوں۔ دوسروں کے اشعار سننے۔ پڑھنے اور سمجھنے کا مرض ضرور ہے۔

ایک قطعہ اور کچھ متفرق اشعار نقل کئے دیتا ہوں۔ شاید آپ میرے احساسات پا سکیں

قطعہ

وہ عالم آہ وہ عالم کہ جب برسات ہوتی ہے
مری ہر آرزو اک محشرِ جذبات ہوتی ہے!!
تمھارے قرب کا ایسے میں اندازہ نہیں مجھ کو!!
مگر یہ جانتا ہوں ہجر میں کیا بات ہوتی ہے!!

متفرقات

مائل ہوش میں نہ ہو جاؤں — اور اک تلخ جام دے دینا
غم کا رونا رویئے کب تک جہانِ شوق میں — ہر مسرت پر بطور رخصیر مقدم رویئے
جز نشاطِ یک نفس دنیا کی بے ربطی نہیں — خندۂ گل دیکھ کر چاہا کہ اس دم رویئے
ضبط بیجد سے جی ہوا ہے خون — دیدۂ اشکبار مل جائے
دل مطمئن نہ جنبشِ مژگاں سے ہو سکا — لیکن نگہ رہینِ اشارات ہو گئی!!
جب ملے ان سے چشم نم ملے — گل سے جیسے باغ میں شبنم ملے
بہت رات بھیگی ستارے بھی سو گئے — چلی آؤ ایسے میں پانچے سنبھالے
ہم چلے تھے تسلی دل کو — اور بے چین ہو کے آئے ہیں
تاکہ ہو غم کا فیصلہ ممکن — چشم و دل درمیان بیٹھے ہیں
سینہ ہر آرزو ہے چاک چاک — احتیاطِ غم کے قرباں جائیے!
بھول جاؤ فراق کی راتیں — آؤ کرنا ہیں پیار کی باتیں
ہمت انتخاب بھی مشکل تھی — اس سے مشکل ہے انتظار جواب

اب تو پہلے سے بڑھ گیا ہے درد   ہم نے ناحق کو چارہ جوئی کی
مسرتیں تو میسر ہیں اک زمانے کو   ستم ظریف مرا غم بھی بانٹ لیتے ہیں

آزاد نظمیں بہت سی ہیں۔ کچھ خاصی طویل اور کچھ مختصر۔ نظم سے اقتباسات سے میرے خیال میں نظم کی سالمیت کے مجروح ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ پھر بھی احساس دو نظموں کے ٹکڑے پیش کئے دیتا ہوں۔

تم کو ردائے چرخ اٹھا کر کیا تلاش
جلوے تو صد ہزار تھے واں بھی نظر فریب
حسن ملک بھی جن و بشر بھی نظر پڑا
لیکن وہ بے گناہی انسانیت کہاں
مرجھائے سے دماغ...... نحیف و نزار جسم.......
....
پھر منزل نظر اسی مرکز پہ آ گئی
اک سال اور بیت گیا تم نہ مل سکیں

خارزاروں میں کہیں دور چلا جاؤں گا
اس چمن کی تو ہوا مجھ کو سزاوار نہیں
قہقہوں میں بھی یہاں اشک چھپائے ہیں بہت
اور اشکوں میں بھی جشن نے دکھایا ہے مجھے
تو کہاں ہے ؟ تجھے آواز اگر دوں تو کہاں ؟

راغب

اصغر حسین مراد آبادی

میرا نام اصغر حسین تخلص راغب اور وطن مراد آباد ہے جہاں سنہ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوا۔ ادیب فاضل، منشی فاضل اور انٹرمیڈیٹ کے علاوہ فارغ التحصیل طبیب ہوں۔ شاعری میرا فطری ذوق ہے۔ سنہ ۱۹۳۵ء سے شعر کہتا ہوں۔ ہر صنف سخن اور مروج و غیر مروج بحر میں طبع آزمائی کی ہے لیکن رباعی سے خاص مناسبت ہے۔ متحدہ ہندوستان میں میری سیاسی نظموں کا ایک مختصر مجموعہ "عزم و ایثار" اور غزلوں کے منتخب اشعار "ساغر صد رنگ" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں ایک اور کتاب "بہار کشمیر" شائع ہوئی تھی جو کشمیر جنت نظیر سے متعلق سیاسی منظومات و رباعیات پر مشتمل ہے۔ دو دیوان نظموں کے ایک غزلیات اور ایک رباعیات و قطعات کا تیار ہے جن کی طبع کی نوبت ہنوز نہیں آئی ہیں۔ میں نے فن شعر کے مختلف مشاقوں اور مختلف مکاتیب فکر کا اتباع کیا۔ ابتدا میں ناسخ کے انداز میں بہت سی غزلیں کہیں جب مطالعہ میں وسعت پیدا ہوئی تو اس رنگ کی قباحتیں سمجھ میں آئیں اور داغ کے رنگ میں کہنا شروع کیا لیکن مشق و مزاولت کے ساتھ ساتھ شعور نقد و نظر نے راہ روی سے بچا لیا۔ اب اپنا ایک جداگانہ انداز ہے۔ نظموں کا انتخاب طوالت کا باعث ہوگا۔ لہٰذا نظر انداز کرتا ہوں۔ تصویر آج تک کسی اخبار اور رسالہ میں شائع نہیں کرائی۔ کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

رُباعیات

انسان کی معصوم شباہت پہ نہ جا
الفاظ کی موہوم لطافت پہ نہ جا
خوشبو ہے فقط پھول کا جوہر راغب
رنگ اس کا نہ دیکھ اس کی نزاکت پہ نہ جا

دریائے غم عشق کا ساحل تو ہے
رہرو کو چراغ سر منزل تو ہے
ہوں سرخیٔ افسانہ ہوں بیشک لیکن
افسانۂ زندگی کا حاصل تو ہے

زہرابِ غمِ زیست پیے جاتا ہوں — مرتا ہوں مگر سانس لیے جاتا ہوں
میعادِ حیات کے بڑھانے والے! — جینا ہے بہرحال جیے جاتا ہوں

کونین کی وسعت پہ نظر رکھتا ہوں — اسرارِ دو عالم کی خبر رکھتا ہوں
خواہش نہیں کچھ ملکِ فریدوں کی مجھے — میں سلطنتِ علم و ہنر رکھتا ہوں

قطعات

اندھیری رات ہے، شہرِ خموشاں میں ہے سناٹا — چراغ اک بینوا کی قبر پر یوں ٹمٹماتا ہے
امیروں کو خیالِ بیکسِ رفتہ جس طرح راغبؔ! — تہی دستی میں پہروں خون کے آنسو رلاتا ہے

وہ محبوبِ حسیں جو زینتِ آغوش تھا کل تک — تصوّر میں بھی آتا ہے تو یوں آنکھیں چراتا ہے
کوئی سرمایہ دارِ بے مروّت جس طرح راغبؔ — کسی نادار کی دیرینہ خدمت بھول جاتا ہے

اُفق پر دُور اک رنگین بادل — گجردم رفتہ رفتہ چھا رہا ہے
کوئی محبوب کمسن ہے کہ گویا — خود اپنے آپ سے شرما رہا ہے

اک کھنڈر پر شب کے سناٹے میں، آبادی سے دُور
یوں نظر آتا ہے مجھ کو پرتوِ روئے ہلال
جس طرح اک قلبِ غم خوردہ میں وقتِ انحطاط
چٹکیاں لیتا ہے رہ رہ کر جوانی کا خیال

غزلیات

ترے ستم پہ کرم کا گماں بھی ہوتا ہے — کہ یہ سلسلۂ امتحاں بھی ہوتا ہے
وہ دل کہ جس کی نزاکت پہ تھے گل بھی نثار — امینِ دولتِ دردِ نہاں بھی ہوتا ہے
عتابِ دوست یقیناً عتاب ہے لیکن — کبھی کبھی یہی آرامِ جاں بھی ہوتا ہے
سمجھ گئے وہ نگاہوں سے مدعا دل کا — سکوت ترجمۂ حسنِ بیاں بھی ہوتا ہے
خلوص حد سے گزر کر کبھی کبھی راغبؔ
حریفِ ربطِ دلِ دوستاں بھی ہوتا ہے

دل میں اب شورشِ شباب نہیں ۔۔۔ جام ہی جام ہے شراب نہیں
خام ہے تیری قوتِ احساس ۔۔۔ زندگی مستقل عذاب نہیں
رنگ لائے گی خودسری دل کی ۔۔۔ اس مصیبت کا سدِ باب نہیں

مستِ صہبائے عشق ہوں راغب
ہونٹ شرمندہ شراب نہیں

ہم اُن کی برہمی سے مائل ہیں دل لگی پر ۔۔۔ تنقید ہو رہی ہے آئینِ دل بری پر
محرومیٔ تماشا، ناکامیٔ تمنا ۔۔۔ کیا کیا صلے ملے ہیں اِس عجز بندگی پر
پُرکیف دیکھتا ہوں مستقبلِ محبت ۔۔۔ اللہ رے یہ بھروسہ دو دن کی زندگی پر
اہلِ وفا بھی نکلے اپنی غرض کے بندے ۔۔۔ پورا کوئی نہ اُترا معیارِ عاشقی پر
اپنوں کو بھی جہاں میں بیگانہ خو ہی پایا ۔۔۔ چھینٹے ریا کے دیکھے دامانِ دوستی پر

اخلاص و مہر و الفت دنیا میں گو نہیں ہے
دھوکا ہوا ہے راغبؔ لیکن کسی کسی پر

متفرق اشعار

جانِ راغبؔ تری دزدیدہ نگاہی پہ نثار
اک نظر اور دلِ سوختہ ساماں کی طرف

بجا سہی یہ ترا سوءِ ظن مگر اے دوست
زبانِ غیر مرے دل کی ترجماں تو نہ تھی

مری بیگانگی پر ہنسنے والے یہ بھی سوچا ہے
زمانے کی روش مجبور کر دیتی ہے انساں کو

بارہا سانحہ وہ جس راہ گزر سے گزرے
دل بھر آیا کبھی تنہا جو ادھر سے گزرے

جب سے تم محوِ تغافل ہو وہ ہم بھی تو نہیں
کیا گلہ ہو کہ اب امیدِ ستم بھی تو نہیں

خواجہ راحت حسین اکبرآبادی

خواجہ راحت حسین نام، اکبرآباد (آگرہ) وطن، سنِ پیدائش ۱۸۹۴ء، ۱۹۱۶ء تک علیگڑھ کالج میں تعلیم پائی اور بی اے کی ڈگری لی۔ عرصہ تک یوپی میں ڈپٹی کلکٹر رہا۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلا آیا۔ تین سال روزنامہ "ڈان" اردو کے ادارتی عملہ میں کام کیا۔ علامہ سیماب اکبرآبادی سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ غزل اور نظم دونوں کہتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

حسنِ تغزل

کسی ناشاد کی تمنا ہوں　　نامراد اور ناشکیبا ہوں
مجھ سے اٹھتا نہیں ہے عشق کا غم　　گو غمِ روزگار سہتا ہوں
آج مقتل میں اک سکوت سا ہے　　تہہِ خنجر جو میں تڑپتا ہوں
سارے عالم پہ چھا رہا ہوں مگر　　کہیں پنہاں کہیں ہویدا ہوں
موتیوں کی لڑی ٹپکتی ہے　　آبدیدہ کبھی جو ہوتا ہوں
ہوں کسی بے وفا کا شیدائی　　نظرِ لطف کو ترستا ہوں
کیسا بیدرد یہ زمانہ ہے　　لوگ ہنستے ہیں اور میں روتا ہوں
قطرہ ہوں یوں تو ایک میں ناچیز　　مجھکو سمجھو تو ایک دریا ہوں
آئے پرسش کو وہ تو میں نے کہا　　مہربانی ہے اب تو اچھا ہوں
میرے دل میں ہیں یوں سمائے ہوئے　　موج وہ ہیں تو میں کنارا ہوں

بولے کیسی گذرتی ہے راحت
کہا تم کو دعائیں دیتا ہوں

راحت

راحت نذیر قریشی

میرا نام راحت نذیر قریشی ہے۔ راحت تخلص کرتی ہوں۔ میرے والد مرحوم کا نام جلال الدین ہے۔ وہ ریاست کشمیر میں اسٹیٹ انجینیر تھے۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں بمقام کشمیر پیدا ہوئی اور ابتدائی تعلیم کے مدارج بھی وہیں طے کیے۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں مدرسۃ البنات جالندھر میں منشی فاضل کی کلاس میں داخلہ لیا۔ جالندھر میں میرے بھائی اسلم قریشی اوورسیر کے عہدے پر مامور تھے۔ برصغیر ہند کی تقسیم کی بنا پر ایسے موانعات پیش آئے کہ میں تعلیم کے انتہائی مراحل طے کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

شاعری کا ذوق مجھے ابتدا سے ہے۔ البتہ شعر کسی جذبہ سے متاثر ہو کر کہتی ہوں۔ اور اسی لئے مجھے کثرتِ شعر گوئی کا دعویٰ نہیں۔ نسوانی رسائل میں میری غزلیں جگہ پاتی ہیں شعر کہنے میں صرف وجدانِ سلیم کی رہنمائی پر اعتماد کرتی ہوں۔ اسی لئے اصلاح کے لئے کسی کے سامنے غزل نہیں رکھی۔ ایک غزل اور ایک قطعہ نمونہ کلام کے طور پر پیش کرتی ہوں

رخ پہ یوں زلفِ مشکبار ہے آج — صبح سے شام ہمکنار ہے آج
گاہِ خوشی گاہ سوگوار ہے آج — دل بہر حال بیقرار ہے آج
اس قدر ان کا انتظار ہے آج — دامنِ صبر تار تار ہے آج
کوئی شاید ادھر سے گزرا ہے — ہر طرف گلفشاں بہار ہے آج
پھر کھلے پھول پھر بہار آئی — پھر مجھے تیرا انتظار ہے آج
جانے کیا دل پہ حادثہ گزرے — ملتفت پھر نگاہِ یار ہے آج
جو کبھی تھا نگار خانۂ حسن — ہائے وہ سینہ داغدار ہے آج
آج ہو جائے فیصلہ دل کا — مجھ کو دل پر کچھ اختیار ہے آج
راحتیں جس قدر میسر تھیں — راحت اتنی ہی دل فگار ہے آج

قطعہ

بہار دیکھنا مستی ساتھ لائے — وہ جب آئے تو غنچے مسکرائے
سنائے بلبلوں نے جب ترانے — ہمیں اپنے فسانے یاد آئے

واقف دہلوی

مختصر نام واقف تخلص راغب سن پیدائش ۱۹۲۹ء

متاعِ درد کھونا چاہتا ہوں

ہنسوتا ر دمیں رونا چاہتا ہوں

رشید گوالیاری

سال پیدائش ۱۹۲۸ء وطن گوالیار

نہاں دو غم کے پردے میں ہزار ساز و ساماں تھے ۔۔۔ نفس نفس میں شعلے تھے نظر نظر میں طوفاں تھے

رضا آل رضا لکھنوی

خدا بخشے علامہ سیماب اکبرآبادی کو ایک ممتاز پرمغز اور پُرگو ادیب و شاعر کی حیثیت سے میں اُن کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اور مرحوم بھی متواتر مجلسی کے موقعوں پر میری غزل گوئی کے متعلق ایسے الفاظ ارشاد فرماتے تھے کہ یہاں ان کا اعادہ خود ستائی ہو جائیگا۔ غالباً اسی وجہ سے آل سیماب میاں مظہر صدیقی مصر ہیں کہ ان کے ماہنامہ "پرچم" کا شاعر نمبر جس کو وہ ایک "تاریخی اشاعت" بنا رہے ہیں، آل رضا کے "خود نوشت تذکرہ" اور "منتخب کلام" سے خالی نہ رہے۔ یہاں مشکل یہ ہے کہ اپنی بیس سال کی مدت شاعری میں آج تک کبھی کسی سے بحیثیت شاعر خود اپنا تعارف نہ کرایا کیونکہ اپنے لئے شاعری محض ایک تفریحی مشغلہ رہی۔ خیر انکار و اصرار کی یہ کشاکش اس منزل پر ختم ہوئی کہ مظہر میاں ہی کی ضد پوری ہو رہی ہے لیکن حیف اس دو چار صفحہ کاغذ کی قسمت پر جس کی قسمت میں اس طرح بادلِ ناخواستہ اور پھر قلم برداشتہ تحریر سے سیاہ ہونا ہو۔ مجھے تو اپنے انکار کی سزا مل گئی کہ اب کچھ سوچ سمجھ کر لکھنے کا وقت نہیں رہا، کہا جاتا ہے کہ کاپی پریس جا رہی ہے۔

اپنا تذکرہ کیا عرض کروں سُنتا ہوں کہ جون ۹۵ء میں یعنی تقریباً ۶۵ سال ادھر ایک سیّد کے گھر اپنے ننہال قصبہ نیوتنی ضلع اناؤ (اودھ) میں پیدا ہوا تھا۔ دادا وکیل تھے باپ منصف، گھر میں کچھ زمینداری بھی تھی۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے شرفا میں شمار ہوتا تھا۔ پرانی تہذیب اور سادی زندگی طرۂ امتیاز تھی۔ چونکہ شاعروں کا خاندان نہ تھا لہٰذا اس نومولود کے مستقبل کے بارے میں اور جو کچھ سوچا گیا ہو لیکن اس کا تو گمان بھی نہ ہوا ہوگا کہ شاعر بھی ہوگا۔ اور بزرگوں کا یہ خیال تقریباً ۳۲ سال بالکل صحیح نکلا۔ اتنے زمانہ میں گھر پر مکتب کی معمولی تعلیم کے بعد ۱۲ء میں سیتاپور اسکول سے انٹرنس، ۱۶ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔اے اور ۲۰ء میں لا کالج الہ آباد سے ایل۔ایل۔بی۔ کے مدارج طے کر کے لکھنؤ میں وکالت کے ایام رضاعت گذارے اور ۲۱ء میں پرتاب گڑھ (اودھ) جا کر باقاعدہ وکالت شروع کی۔ یہاں سے زندگی کے ذمہ دارانہ رُخ کا سامنا ہوا۔ اپنا ہی شعر ہے ؎

سرنگوں صید تہہ دام رضاؔ کیا جانے
سینہ تانے ہوئے آزاد غزالوں کی بہار

چنانچہ وہ آزادی کا زمانہ اب رخصت ہو رہا تھا۔ اب تک تو طالب علمی رہی جس میں پاس ہونا

تو فرض سمجھ رکھا تھا لیکن اس سے زیادہ جو کچھ تھا اس پر ہاکی اور ٹینس میں مہارت کو ترجیح تھی وکیل بن کر یہ سب کلیلیں ختم ہوگئیں لیکن چونکہ کتابی کیڑا بننے کی عادت نہ تھی لہذا ورزش سے میدانوں والی تفریح چھوٹ جانے پر بھی ادبی محفلوں کی تفریح سکونِ خاطر بنی۔ اور اسی فضا میں احباب کے اصرار نے غزل کہلوانا شروع کر دیا جس سے طبیعت کو پہلے سے مناسبت تھی۔ بہت جلد محسوس ہوا کہ ایک قدرتی قیام ہو رہا ہے، سرسری شاعری میں کچھ غور و فکر کا رنگ پیدا ہوا۔ اور کہنے میں مزا آنے لگا۔ مگر یہ لاابالی پن نہ گیا کہ نہ تو لکھ کے کہا اور نہ کہہ کر لکھا کچھ دنوں بعد جب حضرت آرزو لکھنوی (اعلی اللہ مقامہٗ) سے بذریعہ خط و کتابت شرفِ تلمذ حاصل ہوا تو اتنا فرق ضرور ہو گیا کہ اصلاح کے لئے روانہ کرتے وقت غزل لکھی گئی لیکن جب بعد اصلاح واپس آئی تو پرچہ چاک کر دیا گیا اور اشعار مع اصلاح حافظہ کے سپرد کر دیئے گئے۔ اب تو بہت کم کہنے کا موقعہ آتا ہے مگر کہنے کا حال وہی ہے کہ عالمِ خیال میں اشعار وضع ہوتے ہیں۔ البتہ ۲۹ء یعنی میرے مختصر مجموعہ کلام "نوائے رضا" کی اشاعت کے بعد سے اکثر و بیشتر غزلیں ضبطِ تحریر میں آگئیں۔ یہ بھی غنیمت ہوا، ورنہ اب جو رنگ حافظہ کا ہو گیا ہے اس کے دیکھتے ہوئے سارا کلام ضائع ہو گیا ہوتا۔ اب تو غزل پڑھتے وقت کبھی کبھی پرچہ ہاتھ میں لینا پڑتا ہے، ۴۶ء کے آخر میں لکھنؤ کی کشش پرتاب گڈھ سے پھر لکھنؤ لے آئی لیکن اکتوبر ۱۹۴۷ء کے

خون خرابہ میں

یوں تو بیتابی میں اس محفل سے اٹھ آنا پڑا — کیا کہیں پھر کیا ہوا، جب دل کو سمجھانا پڑا
وقتِ نازک رشتۂ الفت کے پھندے جا بجا — گتھیوں کو کانپتے ہاتھوں سے سلجھانا پڑا
بس وہی جس کو چھوڑ سکتی تھی وہ دلکش دیار — یوں چھٹا ہم سے کہ ہم کو خود ہی چھوڑنا پڑا

اب کراچی ہے۔ اور ایک حد تک گوشہ نشینی۔ مخصوص احباب کی صحبت میں کبھی کبھی یہ شغل ہو جاتا ہے ورنہ میری غزل گوئی اور غزل خوانی کا ہنگامی دور ختم ہو چکا اور حقیقت یہ ہے کہ سارے ولولے اور شوق پورے ہو چکے۔ مجھے زمانہ سے یہ ذاتی شکایت نہیں ہے کہ شاعر کی قدر اس کی زندگی میں نہیں ہوتی۔ ماحول اور رنگِ طبیعت بدل جانے کے علاوہ یہاں اگر میری کنارہ کشی کی وجہ ایک اور بھی ہے۔ پاکستان کی صبح، اودھ کی شام والی شاعری سے مختلف کوئی چیز چاہتی ہے جس کے لئے اسی قسم کے دل اور دماغ کی ضرورت ہے۔ عوامی مشاعروں کا تقاضہ کچھ اور ہے اور مخصوص صحبتوں کی بات دوسری ہے جن میں کہ عادت کے موافق اب بھی پرانا رنگ مزا دے جاتا ہے۔

غزلوں کے علاوہ میں نے کچھ نظمیں، رباعیاں، سلام اور مرثیے بھی کہے ہیں۔ مرثیوں میں تقاضائے وقت کے لحاظ سے نئی راہ نکالی۔ اور قوم کے جذبۂ ایثار و شجاعت کے ابھارنے کی کوشش کی ہے جو کافی مقبول ہو چکی ہے۔ اس مضمون میں صرف میری غزل گوئی کا ذکر ہے جو ۱۹۲۲ء میں پرتاب گڑھ سے شروع ہو کر بہت جلد مختلف مقامات کے بڑی بڑی محفلوں میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اب اس سے زیادہ میری زبان یا قلم سے متعلق کچھ نہ نکلے گا۔ ۱۹۲۹ء میں جب نوائے رضا منظرِ عام پر آئی تو متعدد موقر اخباروں اور رسالوں میں تبصروں کے علاوہ مایہ ناز اساتذۂ وقت مثلاً مولانا صفی لکھنوی مرحوم، علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم، جناب نیاز فتحپوری، جناب اثر لکھنوی وغیرہ وغیرہ نے اپنے رشحاتِ قلم سے میرے ناچیز کلام کو نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ میرے لئے وہ گرانبہا الفاظ اس قدر قابلِ فخر ہیں کہ انھیں اپنے قلم سے لکھ کر ان کی وقعت کم کرنا گوارا نہیں کر سکتا۔ افسوس ہے کہ آخرکار تھوڑی بہت خود ستائی سے بچ نہ سکا۔ خود نوشت تذکرہ میں یہی مصیبت تھی۔ دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں۔

اب یہاں سے موضوعِ کلام بدلتا ہے۔

ہماری غزل، فارسی کی طرح نظم کی ایک لطیف اور دلکش صنف ہے۔ ہر کلامِ منظوم شعر، نہ ہر شعر غزل کے لئے موزوں۔ شعر میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ موضوع اور اندازِ بیان یعنی کیا کہا گیا اور کس طرح کہا گیا۔ غزل کے لحاظ سے غزل کے شعر کو بھی ان دونوں حیثیتوں سے چند خصوصیتوں کا حامل ہونا چاہئے۔ آخر نظم کی دوسری صنفوں کا بھی تو کوئی کام ہے۔ غزل، شروع تو ہوئی صنفِ نازک یا محبوب سے بات چیت کے مفہوم سے، لیکن ہوتے ہوتے اس کا میدان بہت وسیع ہو گیا۔ بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ نظامِ غزل میں اس قدر وسعت کی گنجائش تھی۔ ورنہ عام طور پر ترقی پسند اس کو تسلیم نہ کرتا۔ اس کے باوجود بھی کہیں پر تو امتیازی حد قائم ہی کرنا پڑے گی۔ اور افراط و تفریط سے احتراز لازمی ہے۔ میرے نزدیک غزل کا اصل موضوع کیفیتِ قلبی ہے بالخصوص محبت، جو ہماری اصطلاح کے مطابق مجازی ہو یا حقیقی۔ مجازی محبت کا ایک نہایت اہم جزو جنسی محبت ہے۔ اگر انسان کے سامنے حقیقی طور پر جنسی محبت کے شدید محسوسات نہ ہوتے تو بقیہ مجازی محبت کی بعض کیفیتوں کی حدیں سمجھ میں ہی نہ آتیں، اور اگر مجازی محبت سمجھ میں نہ آتی تو حقیقی محبت محض چیستاں بن کر رہ جاتی۔ لوگ دوسروں کی کہی سنی باتوں یا تجربوں سے ضرور فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اگر شاعر نے کسی بات

گویا کم سے کم اس سے ملتی جلتی بات کو خود محسوس نہیں کیا ہے تو اس موضوع پر شاعری کا فرض کس طرح بخوبی ادا کر سکتا ہے۔ "دو اور دو چار ہوتے" کہہ دینا تو شاعری نہیں ہے۔ جس نے خود کبھی باغ کی جھلک تک نہیں دیکھی وہ شخص دوسروں سے سن کر یا کتابوں میں پڑھ کر جنت کے بارے میں شاعری کا دیدہ زیب گلدستہ کیونکر تیار کر سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنسی محبت کی اس حقیقت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ بڑا ظلم ہوگا اگر غزل میں اس کی خاص جگہ نہ سمجھی جائے یا اس کے بیان کو خواہ مخواہ دوسرے معنی پہنائے جائیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ بیان معقول حدوں میں ہو جن کا تعین تمدن، اخلاق، اور تہذیب کی مروجہ قدروں پر ہے۔ یہ تو ہوا موضوع غزل کے متعلق میرا نظریہ۔ اب رہا انداز بیان۔ اسے میں نے اپنے لئے یوں سمجھ رکھا ہے کہ لطیف بات، لطیف لفظوں میں اور لطیف طریقے سے بیان ہونا چاہیئے یعنی مخرج اور صوت کے اعتبار سے الفاظ کی ہم آہنگی کا خیال بھی ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ میرے نزدیک غزل کے مزاج اور غزل کی زبان کے مخصوص تقاضے ہیں۔ یہاں کوئی علمی مباحثہ یا ادبی اجتہاد مقصود نہیں ہے صرف اپنا مسلک بیان کر رہا ہوں۔ آج کل خربوزہ کی فصل ہے۔ اس کی مثال سے میں اپنا مطلب ذرا اور واضح کر دوں۔ چھلکے سے قریب تر حصہ کا ذائقہ اور اس کی لطافت اور چیز ہے۔ جو اصل خربوزہ ہے ورنہ گودے کے اور اجزا بھی کھانے کے قابل اور پیٹ بھرنے کے لئے مفید ہوتے ہیں اور کہنے کے لئے تو چھلکا بھی خربوزہ ہی کا جز کہا جاتا ہے۔ صنف نازک میں عام طور سے دلکشی سمجھی جاتی ہے لیکن کسی معصوم دوشیزہ کا نئی نویلی دلہن کی شکل میں نمودار ہونا اور ہی چیز ہوا کرتا ہے۔ یہی صورت غزل کے شعر اور اس کے مدارج کی ہے۔ اور اگر کوئی ایسا شعر ہو جائے جو مختلف مذاق اور استعداد کے لوگوں کو اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے طریقہ پر یکساں لطف دے تو اس شعر کو غزل کا معیاری شعر کہنا چاہیئے۔ مگر بڑے سے بڑے شاعر نے بھی ایسے شعر کتنے کہے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ غزل کے اشعار کہہ ڈالنا جتنا آسان ہے اتنا ہی مشکل ہے صحیح معنی میں غزل کا اچھا شعر کہہ لینا خصوصاً اس زمانے میں جبکہ سبزہ زار کافی پامال ہو چکا ہے

اب میں صاحب پرچہ کی فرمائش کے مطابق اپنے کچھ اشعار بھی لکھے دیتا ہوں لیکن اس گزارش کے ساتھ کہ نثر یا نظم میں جو کچھ عرض کیا گیا اس کے متعلق مجھے یہ نہ کہنا پڑے کہ شعر میرا بمدرسہ کہ برد؟ یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نے اس وقت عمداً اپنے سامنے اپنے کلام کا کوئی مجموعہ بھی رکھا ہے جس سے انتخاب پیش کر رہا ہوں بلکہ جو اشعار یاد آتے جاتے ہیں لکھے دیتا ہوں تاکہ میری دلی کیفیت کا کچھ پتہ چل جائے۔

خیالِ حسن میں یوں زندگی تمام ہوئی
حسین صبح ہوئی اور حسین شام ہوئی

بس اب تو تم نے محبت کا لے لیا بدلہ
معاف کرنا، جو تکلیفِ انتقام ہوئی

رضاؔ کتنی حسین اور مختصر شرحِ محبت ہے
نہ راس آئے تو دوزخ ہے جو راس آ جائے تو جنت ہے

کوئی جا تجھ میں کیا ایسی نہیں، او بیوفا دنیا
جہاں یہ رسم ہو، بدلہ محبت کا محبت ہے

دل میں میرے ابتک ہے مستی، اس بچھڑے متوالے کی
باسی پھول میں جیسے خوشبو، پھول پہننے والے کی

دل کی لگی یوں پھونک دے مجھکو، گھر سے باہر آنچ نہ جائے
اُن کے دشمن کیوں غم کھائیں، پھول سا چہرہ کیوں کملائے

نقشِ قدم پر اُن کے جس جا، پہلے پہل سر رکھا تھا
پھر جب ہوگا ادھر کا پھیرا سجدہ میں جھک جائیں گے

در تیرا سلامت، مرا سجدہ بھی سلامت
اب اُتنی زمیں میری ہے جو زیرِ جبیں ہے

دل آنے کی، دل جانے کی، دل مٹنے کی حالت
ہاں یاد ہے، کچھ یاد ہے، کچھ یاد نہیں ہے

اک آن صبح کے ساتھ، ایک شان شام کے ساتھ
بنا بھی حسن تو کس حسنِ انتظام کے ساتھ

جواب خیر نہ دیتے، مگر یہ کیوں سمجھے
کہ عرضِ حال بھی مطلوب ہے سلام کے ساتھ

دل میں بے ساختہ تصویر بنی تھی اک وقت
اب اُسی وقت کی باتیں اُسی تصویر سے ہیں

رضاؔ خاک اڑائی بگولوں سے کھیلے
محبت کے شعلوں میں پھولوں سے کھیلے

کہاں آ گئے یاد، ٹوٹے ہوئے پر
ارے مر گیا قصدِ پرواز کر کے

کہدوں تو مرنے پر یہ فسانہ نہیں آتا
ٹھہروں تو پلٹ کر یہ زمانہ نہیں آتا

جانا تو ہے دنیا سے مگر یا رہے دنیا
آنیکو چلے آئے ہیں، جانا نہیں آتا

جھگڑے ہی چلے جاتے ہو ہنسنے کی خوشی میں
جاؤ تمھیں دیوانہ بنانا نہیں آتا

آتی ہے بہار اور لٹا دیتی ہے دولت
ایک پھول کی مٹھی میں خزانہ نہیں آتا

مقدور تھا بس ایک ہی سجدہ ترے در پر
سر میں نے جھکایا ہے اٹھانا نہیں آتا

آتی ہے رضاؔ مجھکو محبت کی غلامی
احسان محبت کا جتانا نہیں آتا

بہار آئی مگر ہم جہاں ہیں گلشن میں
وہی مقام شریکِ بہار ہو نہ سکا

بڑے حسین ستارے نکل کے ڈوب گئے
میں چاہتا تھا مگر اعتبار ہو نہ سکا

ہے شغلِ عشق رضاؔ اور فیضِ عشق ہے اور
بنا کے تاج کوئی تاجدار ہو نہ سکا

اچھا صاحب یہ سب تو ہو چکا یہ مضمون بھی کافی طویل ہو گیا۔ آخر میں منقطع۔ کے طور پر اب میں اپنے قارئین کرام کو اپنے مذاقِ غزل گوئی سے قریب تر لانے کیلئے دو چیزیں اور کہے دیتا ہوں جنھیں قطعات کہئے یا غزلِ مسلسل سمجھ لیجئے۔

عجب عنوان تھا، جب ہوش اپنے کیف پر آیا — ذرا سا حسن دیکھا، حسن کا دفتر نظر آیا
نگاہیں نازِ فرما، تو یہ تو حسن آفرینی پر — جہاں بھی جتنا دلکش نقش جب چاہا ابھر آیا
تمنا بھی، جلوے میں اپنے جشنِ تہنیت لائیں — خیال آیا ادھر، گویا ادھر ارمان بر آیا
امنگوں کے لئے ہر رُت فضا کے نو عروسانہ — بکھر سکتا تھا جتنا، دل کا ہر جذبہ بکھر آیا
خود اپنے دل کے پردوں ہی سے اک نغمہ ہوا پیدا — مگر سمجھے دیارِ حسن سے پیچھا میرا آیا
ہنسا آ، پھول برسانا ہوا اک جوشِ مستانہ — یہ بادل دل سے جس کو ملنے آیا جھوم کر آیا
خود اپنی لاؤ بالی شان سے محبوب تک پہنچے — خود اپنی وضع کے سجدے کئے جیسے کہ آ در آیا
رضا بس زندگی اتنی ہی تھی اور سب تماشا ہے — نہ آنا تھا نہ جینے کا مزہ کچھ پھر بھی آیا

مجھے اپنے لڑکپن کا زمانہ یاد ہے۔ ان اشعار کا تعلق اپنی ہر محبوب دلچسپی سے ہے چاہے وہ کوئی کھیل ہو یا سفر کی رنگا رنگیاں یا کوئی اور مخصوص دلکش مشغلہ اسی طرح میرے مذکورہ بالا ابیات سے اشعار کا موضوع وہ محبت ہے جس کا کوئی تعلق جنسی محبت سے نہیں ہے البتہ ذیل کے اشعار میں دوسرا چٹخارہ ہے جس طرح اور بہتیرے اشعار میں بظاہر ملے گا۔

ان کو دیکھا تو محبت بھی سمجھ میں آئی — ورنہ اس لفظ کی تعریف سنا کرتے تھے
ہر اک جسم سے آتی تھی انکھیں کی آواز — ہم اپنی حسن کے عالم میں جیا کرتے تھے
چھیڑ کر نغمۂ محبت کو کیا جو ساز ملا تھا — دل ملے جاتے تھے شکوے بھی ہوا کرتے تھے
آگ میں پھول تھے پھولوں میں بلا کی شوخی — گدگداتے تھے وہ چھالے جو پڑا کرتے تھے
اب رضا شعر میں بھی تو کہاں سے لائیں — وہ تڑپ جس کے اشارے پہ کہا کرتے تھے

مجھے میری غزل گوئی جس کا دور اب میں نے اپنی جانب سے ختم کر دیا ہے۔ کبھی کبھی بعض تقاضوں سے مجبور ہو کر مجھے شعر کہنے بیٹھ لیا کرتا ہوں مگر کہاں وہ لکھنؤ کے ساون بھادوں اور کہاں کراچی کی پابندی۔ یہ تو خوش ہی کر سکتا ہوں کہ میری غزل گوئی زیادہ تر دلی جذبات اور تاثرات کی مشغلہ تک محدود رہی۔ اب میں نے گویا اس شغل سے پنشن لے لی تھی اس لئے کہ زمانے کے ہاتھوں جب پنشن پر رخصت کر دیا جاتا۔ غزل گوئی کے علاوہ جو دوسری اصناف شاعری کا سلسلہ تو وہ چلتا رہے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ اب مجھے اپنی غزل گوئی کی حقیقی داد بھی نہیں ملتی۔ حقیقی داد سامعین کی واہ واہ نہیں ہے بلکہ وہ لطیف منزل ہے جو اس قسم کے شعر کہنے وقت محسوس ہوتی تھی۔ ایک بات اور بھی ہے جب دل و دماغ پر یہ خیال مسلط ہو گیا کہ ہماری مملکت اور قومی زندگی کی اصلاح کے لحاظ سے اب ہماری ہر صنف شاعری کا مقابل بنانا چاہئے جو اب تک کہا وہ اپنی جگہ پر ہے اور رہے گا لیکن اگر اب اپنے جذبات و وقت کے تقاضے کو سمجھ کر نظر انداز کریں۔ چلئے اپنے قلم سے اپنا تذکرہ ختم ہوا۔ مضمون نگاری مقصود نہ تھی واقعات کے علاوہ اپنے اور صرف اپنے دل کی کچھ باتیں تھیں جو صاف صاف بیان کر دی گئیں انشاء اللہ۔

دل کی قیمت نہیں کوئی کہ یہ ایک ہے دل — میں نے خود بیچ دیا مول خرید ار دل پر

روحی
محمد رضاء الانبیاء قادری قائلی لکھنوی

نام۔ محمد رضاء الانبیاء عمر تقریباً پچیس سال۔ قومیت سادات فاطمی۔ آباؤ اجداد کا وطن لکھنؤ ہونے کی وجہ سے لکھنؤ سے ایک گونہ نسبت ہے۔ میرے والد ماجد حضرت جنت مکان خلد آشیاں فخر الشعراء میر قائل قادری لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ لکھنوی تھے۔ لہٰذا یہ ضمانت زبان دانی کے لئے کافی ہے جن کی ہستی دنیائے ادب میں غیر فانی شہرت رکھتی ہے۔ میں اجمیر شریف میں پیدا ہوا۔ اور ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی بعد ازاں قبلہ استاذی محمد ایوب صاحب ناغ اکبر آبادی سے تعلیم حاصل کی پھر مدرستہ العلوم معینیہ عثمانیہ میں اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی ذوق ادب اور شوق سخن قدرت نے ودیعت فرمایا تھا حضرت والد ماجد قبلہ نے میرا تخلص روحی رکھدیا تھا۔ چنانچہ میں روحی لکھنوی کے نام سے دنیائے ادب میں متعارف ہوں۔ اب میرا وطن پاکستان ہے اور کراچی اقامت گاہ۔
حضرت قبلہ عالم والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ ایک کامل استاذ سخن ہونے کے علاوہ بلند مرتبہ شیخ طریقت و رہنمائے معرفت و حقیقت بھی تھے۔ چنانچہ حضرت قبلہ عالم کے ہزاروں مریدین و متوسلین پاکستان اور ہندوستان میں موجود ہیں قبلہ عالمؒ نے اپنی حیات ہی میں خادم کو سجادہ نشین بنا دیا تھا چنانچہ یہ خادم بھی اب خدمت و طریقت پر مامور ہے تفصیل حالات میں پڑنا نہیں چاہتا کہ خود ستائشی کی زد میں نہ آجاؤں۔ ہاں اتنا ضرور عرض کروں کہ حضرت قبلہ عالم والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ۔ علامہ سیماب اکبر آبادی رحمتہ اللہ علیہ سے شرف تلمذ رکھتے تھے اس لئے پاکستان آنے کے بعد میں نے بھی حضرت سیمابؒ سے اپنی اکثر غزلوں پر اصلاح لی اور علامہؒ نے کمال خلوص سے میری رہنمائی فرمائی۔ چند غزلوں کا انتخاب پیش کرتا ہوں۔

شہرہ ترے جمال ہی کا چار سو رہا
یکتا جہانِ حسن میں بس تو ہی تو رہا

تہمت نہ اختیار کی مجبوریوں کو دے
دل کا تو مشغلہ ہی تری آرزو رہا

گذری ہے یادِ رخ سے عبادت میں زندگی
خونِ جگر سے اپنا ہمیشہ وضو رہا

نکہت پہ اس کی صدقے ہوئی نکہتِ چمن
وہ ہار جو شبابِ کے زیبِ گلو رہا

ہم پی کے مست ہو گئے اس چشمِ مست سے
عالم رہین منت جام و سبو رہا

گلزار آب و گل میں مرا طائر نظر
قیدِ طلسمِ جلوۂ رنگ و بو رہا

رومی حضورِ داورِ محشر ہی کامیاب
ظالم کو یاد وعدۂ لاتقنطوا رہا

کام آئیگا نہ جذبۂ کامل جگہ جگہ
آتی ہے راہِ عشق میں منزل جگہ جگہ

ہر دل میں جلوہ ریز ہے مسکن جمالِ دوست
آئینہ ہو رہا ہے مقابل جگہ جگہ

جوشِ جنونِ عشق جو مشکل کشا بنے
آسان کیوں نہ ہو مری مشکل جگہ جگہ

بحرِ رواں میں خود ہی سنبھلتی نہیں کشتیاں
امواج جا بجا ہیں تو ساحل جگہ جگہ

ثابت قدم ہو سالکِ راہِ طلب اگر
رومی ملیں گے رہبرِ کامل جگہ جگہ

ان کا ہر جلوہ ثبوتِ حسنِ کامل ہو گیا
دل نہ جانے کون سے جلوے پہ مائل ہو گیا

جستجو کے یہ کرشمے یہ طلب کے معجزے
کوچۂ جاناں کا ہر ذرّہ مرا دل ہو گیا

یوں حجابِ آتشیں رخسار بن سکتا ہے کون
یہ مری نظروں کا پردہ تھا جو حائل ہو گیا

نازکی ہے یہ جبینِ ناز پہ کتنی شکن
یہ مرا دل ہے جو بارِ غم کا حامل ہو گیا

جز دلِ صد چاک اپنا میں نذر ان کو کیا کر دیا
سر تو میرا آج رومی نذرِ قاتل ہو گیا

سر خود جھکا ہے سجدۂ بے اختیار میں
اتنی کشش ہے نقشِ کفِ پائے یار میں

ہستی کی کائنات پہ چھائے ہوئے ہیں وہ
میں کیا بتاؤں کیا ہے مرے اختیار میں

رومی رسائی ہو گی کبھی بامِ یار تک
باقی ہے وہ تڑپ ابھی اپنے غبار میں

زندگی زندگی تھی رسمِ جفا سے پہلے
موت کا ذکر نہ تھا ذوقِ وفا سے پہلے

بات تو یہ ہے کہ آیا ہی نہ تھا اے ساقی
حکمِ سجدہ ترے نقشِ کفِ پا سے پہلے

ہو لب پہ نام ان کا اور جان پر الم نکلے
مرے منہ سے نہ نکلے کچھ مگر یہ کم سے کم نکلے

ہزاروں مشکلیں دیکھیں ہزاروں آفتیں جھیلیں
مگر یہ حضرتِ رومی بڑے ثابت قدم نکلے

ہے عجزِ حسنِ جلوہ آرا کہ کون اس پر فدا ہوا ہے
میں اپنے عالم میں محوِ حیرت کہ دل کی دنیا کو کیا ہوا ہے

تمہارے در پر کیا ہی سجدہ تو عرش پر ہے مزاج اپنا
جبیں کی قسمت سی کھل گئی ہے ملا ہے جب سے یہ آستانہ

مانا کہ بزمِ ناز کے قابل نہیں ہوں میں
کیا کشتگانِ غم میں بھی شامل نہیں ہوں میں

وہ خوش ہونے نہیں دیتے ہیں رومی مرگِ دشمن پر
کیا کاندھے پر اٹھا رکھی ہے میت میرے دشمن کی

ایسی دعا کے بارے میں کیا ہے خیالِ شیخ
اُس بت کو اور مانگتے ہیں خدا سے ہم

رئیس — سید محمد مہدی امروہوی

میرا نام سید محمد مہدی اور تخلص "رئیس" ہے۔ اگر حسب و نسب پر فخر کرنا مستحسن ہوتا تو میں کہتا کہ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں امروہہ (ضلع مرادآباد) کے مشہور خاندانِ سادات کا ایک رکن ہوں جس کے ایک بزرگ سید سعادت علی مرحوم کے سامنے میر محمد تقی نے دہلی مرحوم میں زانوئے ادب طے کیا تھا۔ میری ولادت اکتوبر ۱۹۱۴ء کی کسی تاریخ کو امروہہ میں ہوئی اب میری عمر ساڑھے سینتیس سال کی ہے۔ میرے والد ماجد (علامہ) سید شفیق حسن صاحب ایلیا کئی کتابوں کے مصنف اور امروہہ کے مشہور و معروف اساتذہ فن میں سے ہیں۔ میں نے جولائی ۱۹۱۸ء میں اپنے بھائی (سید امیر حیدر) کمال امروہوی کے ساتھ مکتبی تعلیم شروع کی شعر و ادب کا ذوق ابتدا ہی سے میرے اندر موجود تھا۔ اس اعتبار سے میں یقیناً اپنے کو بدنصیب سمجھتا ہوں کہ فنِ شعر میں مجھے کسی سے مشورہ کرنے اور اصلاح لینے کا موقع نہیں ملا میں اپنے کو باضابطہ طور پر تعلیم یافتہ نہیں کہہ سکتا۔ میری تعلیمی عمر کا بیشتر حصہ مطالعہ میں گزرا۔ بچپن ہی سے میری تمنا تھی کہ میں آئندہ عمر میں ایک صحافی ہوں۔ چنانچہ آج سے اکیس سال قبل جب میرے ایک ہم وطن بزرگ سید مجاہد حسین جوہر مرحوم (ایڈیٹر اتحاد) نے میرے عزیز دوست حیات اظہر وہوی (مرحوم) کے اشتراک سے "حیات" نامی ایک ماہنامہ جاری کیا تو میں نے اس کی ترتیب و تدوین میں پرشوق حصہ لیا۔ درحقیقت شروع ہی سے لکھنے پڑھنے کا ذوق ایک پڑھے لکھے جن کی طرح مجھ پر مسلط تھا۔ اگست ۳۹ء میں میں نے عادل ادیب مرحوم کے ساتھ مرادآباد سے رسالہ "مسافر" کی اشاعت شروع کی۔ ۱۹۴۲ء میں سہ روزہ "جدت" کی ادارت میں نے سنبھالی جو کچھ عرصے بعد روزنامہ ہو گیا۔ ۱۹۴۶ء میں مرادآباد کے بجائے دلی کو میں نے اپنی صحافتی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا۔ جہاں سے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں کراچی منتقل ہو گیا۔

اگرچہ اساتذہ کے معاملے میں میں بے حد بدنصیب ہوں لیکن "تلامذہ" کے بارے میں یقیناً خوش نصیب ہوں۔ کسی زمانے میں تو مجھے "شاگرد" بنانے کا خبط تھا اور اس خبط کی

بدولت تقریباً تین سو ساڑھے تین سو موزوں طبع حضرات مجھ سے اصلاح لینے لگے تھے۔ مگر یہاں آ کر یہ شوق مردہ ہو گیا۔ اب سب سے زیادہ مجھے جس چیز سے تکلیف ہوتی ہے وہ یہی جہلائے شعر کی عادت یا حماقت ہے۔

مجھے نثر اور نظم دونوں شعبوں سے یکساں دلچسپی ہے۔ افسانہ نویسی سے لیکر ڈرامہ نگاری تک نثر کے جتنے شعبے ممکن ہیں میں نے سب میں قلم فرسائی کی ہے۔ نظم کے میدان میں بھی طبیعت کے جوہر [illegible] کا عالم یہی ہے۔ درحقیقت میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ میری طبیعت نثر کے لئے موزوں ہے یا نظم کے لئے۔ اگر نثر کے لئے موزوں ہے تو کس موضوع پر قلم اٹھانے کی اہلیت مجھ میں موجود ہے۔ اگر نظم کے لئے موزوں ہے تو میں کس میدان کا مرد ثابت ہو سکتا ہوں۔ ڈرامے (نثر اور نظم دونوں) فلمی ڈرامے۔ ڈرامائی تبصرے، تاریخی، سیاسی اور علمی مقالے۔ ناول۔ مختصر افسانے۔ ادبی تقریریں۔ ادب لطیف۔ ادبی [illegible]۔ طنزیہ و مزاحیہ مضامین۔ گیت۔ (ہندی اور اردو زبانوں میں) قطعات۔ غزلیں (اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں) قصائد۔ مثنویاں۔ پیروڈی۔ رومانی نظمیں۔ قومی نظمیں۔ تشبیہی اور تمثیلی نظمیں۔ مرثیے۔ سلام۔ نوحے۔ چار بیتیں۔ غرض ہر موضوع سے طبیعت کو یکساں لگاؤ رہا ہے۔ ذیل میں نظم کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

غزلیات

خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم — گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم
صدیوں تک اہتمامِ شبِ ہجر ہیں رہے — صدیوں سے انتظارِ سحر کر رہے ہیں ہم
ذرے کے زخمِ دل پہ توجہ کئے بغیر — درمانِ دردِ شمس و قمر کر رہے ہیں ہم

ہم اپنی زندگی تو بسر کر چکے رئیسؔ
یہ کس کی زیست ہے جو بسر کر رہے ہیں ہم

رئیس ناخنِ غم کی سینہ خراشی — کہ قلب و جگر ہو گئے پارا پارا
ہوئے اپنے ناوک سے ہم آپ زخمی — تمہاری نگاہوں نے کیا تیر مارا؟
اگرچہ جنوں نے اب تک کمی کی — نہ دنیا بنائی نہ دیں کو سنوارا

خدا کی قسم پھر بھی ترکِ طبیعت　　نہ ان کو گوارا نہ ہم کو گوارا
ہر اک منزلِ نشو و بالیدگی میں　　یہ کیوں خارِ گل کی نگہباں ہے فطرت ؟
اگر پردۂ رنگ و بو میں نہیں ہے　　کوئی حیلہ گستر کوئی جلوہ آرا

فارسی غزل

ما از چاکِ جیب و گریباں تواں شناخت　　شورے کہ در سر است ز ساماں تواں شناخت
اے راہِ ناشناس! بپئے راہ بر مگرد　　منزل ز تست ریگِ بیاباں تواں شناخت
مرغِ پریدہ ہوش چہ داند کہ در قفس　　رفتارِ نبضِ گل ز رگِ جاں تواں شناخت

نظم

عرصۂ دید کا حاصل تھی ملاقات کی رات　　جب وہ کچھ ٹھہرا یہاں رہا رات کی رات
شمع و پروانہ ہیں وہ رابطۂ مہر و خلوص　　حسن اور عشق میں وہ رمز و کنایات کی رات
پھر وہ خاموش فسوں کار سہانی رنگیں　　ہائے وہ پیار کی رُت ہائے وہ برسات کی رات
چاند سے چہرے پہ وہ زلفِ سیہ کے حلقے　　اُف وہ جلووں کی سحر آہ وہ ظلمات کی رات
دونوں جانب تپشِ دل سے قیامت کا سکوت　　نہ سوالات کی مہلت نہ جوابات کی رات

قطعات

جنوں اپنا ہی دلدادہ ہے اب تک　　یہ مستی تشنۂ بادہ ہے اب تک
اجازت ہے تمہارا نام لکھ لوں　　مرے دل کا ورق سادہ ہے اب تک

جہانِ کہنہ کے رہنے والے! نئی کراچی کا تذکرہ کر
نئی کراچی سے زندگی کا نیا فسانہ شروع ہوگا
یہی وہ کوچے ہیں جن میں ڈھل کر بنیں گے تہذیبِ نو کے سانچے
یہی وہ گلیاں ہیں جن میں پل کر نیا تمدن طلوع ہوگا

آج انسانیت پرستوں سے　　پوچھتے ہیں جناب ایٹم بم!
امن یا جنگ زندگی یا موت؟　　کیا ارادہ ہے اے بنی آدم!

زاہدہ خلیق الزماں

۱۲ر جولائی ۱۹۱۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئی ہوش سنبھالتے ہی گھر میں علم و ادب کا چرچا دیکھا میرے والد حاجی محمد ارتضےٰ خانصاحب اور چچا حاجی محمد اصطفا خانصاحب (مالک کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ) قدیم لکھنوی رنگ کے اچھے کہنے والوں میں ہیں۔ ابتدائی تعلیم گرلس اسکول میں اور اس کے بعد گھر پر ہوئی پہلی غزل شاید گیارہ یا بارہ سال کی عمر میں کہی اپنے ماموں اسد اللہ خاں اسد لکھنوی سے ایک عرصہ تک اصلاح لیتی رہی دو تین سال کے اندر ہی یو۔پی۔ کے ادبی حلقوں میں میرے کلام کو مقبولیت حاصل ہوگئی۔ اور میری غزلیں اس وقت کے مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہیں ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۳ء کو چودھری خلیق الزماں سے شادی ہوئی۔ ازدواجی زندگی نے ایک زمانے تک شعر و شاعری سے بے نیاز رکھا۔ اب قدیم طرز سے ہٹ کر مسلسل غزلیں اور نظمیں کہتی ہوں میں بندۂ محبت ہوں شاعری کو محبت کا عکس اور پرتو سمجھتی ہوں واعظانہ رنگ، خشک فلسفہ اور مابعد الطبیعاتی رنگ مجھے مطلق پسند نہیں۔

انتخاب کلام حسب ذیل ہے۔

کیونکر کہوں الفت میں بر آتی ہیں امیدیں — جو دل سے نکل جائے وہ ارماں نہیں دیکھا
اے زاہدہ کیا خاک چھپے رازِ محبت — کس کس نے مجھے چاک گریباں نہیں دیکھا

وفا کی خو تجھے ناقدری وفا سے ہوئی — تیری جفا نے بڑھایا ہے حوصلہ میرا

ہوئی جو ابتدا ایسی خبر انتہا کی کچھ — کہنا نہ مانتی دلِ خانہ خراب کا

ٹھنڈی سانسوں سے بڑھی جارہ گرِ آتشِ غم — کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ ہوا کونسی ہے
عشق میں وجہ گرفتاریٔ دل ہیں آنکھیں — زاہدہ اس میں بھلا میری خطا کونسی ہے

ہاں وہ رسوا نہ ہوا اس واسطے خاموش ہیں ہم — یہ نہ سمجھو ہمیں عادتِ فریاد نہیں
زاہدہ گھوئے ہوئے دل کا پتہ دیتا ہے — اُن کا ہنس ہنس کے یہ کہنا کہ ہمیں یاد نہیں

اک ادا سے میری کافی ہے اُن کی زاہدہ — ہستیٔ فانی کا شیرازہ بکھرنے کے لئے

لپٹ لپٹ کے ہر اک شے سے اب میں روتی ہوں — کہیں سے رکھا نہ تم نے گلے لگا کے مجھے

شمع بدنام ہوئی خود سے جلا پروانہ — بھی خطا عشق کی اور حسن پہ الزام آیا
ذرے دینے لگے وادیٔ ایمن کی طرح — بے نقاب اُلٹے ہوئے کون سرِ بام آیا
خدا کے واسطے لے ہوش رفتہ بتا دے — یہ بات سچ ہے کہ دیوانہ ہوگیا ہوں میں

سالک عبدالمجید

تاریخ ولادت: ۱۳ دسمبر ۱۸۹۴ء بمقام بٹالہ ضلع گورداسپور پنجاب۔

خاندان: دادا مولانا میر محمد صاحب علوم شرقیہ کے عالم و معلم تھے۔ والد غلام قادر میونسپل سکریٹری پٹھان کوٹ۔

ابتدائی تعلیم: پٹھان کوٹ اور بٹالہ میں ہوئی۔ بی۔ اے لاہور میں کیا۔

۱۹۱۲ء میں پٹھان کوٹ سے رسالہ فانوس خیال نکالا۔ جو ایک سال جاری رہا۔ پھر ۱۹۱۵ء سے اواخر میں "تہذیب نسواں" اور "پھول" کا ایڈیٹر اور شمس العلما مولوی ممتاز علی کا ادبی مددگار مقرر ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں زمیندار کا اڈیٹر ہوا۔ ۱۹۲۱ء کے اواخر میں عدم تعاون میں ایک سال کی قید ہوئی۔ واپس آکر پھر زمیندار کا اڈیٹر ہوا۔ ۱۹۲۷ء میں قطع تعلق کرکے مولانا مہر کی معیت میں انقلاب جاری کیا۔ جو تیس سال تک جاری رہا۔

شعر گوئی: ادب، تنقید، صحافت مشاغل رہے۔ شاعری، اخبار نویسی سے پہلے تو جاری رہی۔ اس کے بعد بہت کم۔ کبھی کبھی کوئی غزل لکھ لیتا ہوں۔ اب خانہ نشین ہوں کچھ تصنیف و تالیف کا کام کرتا رہتا ہوں۔

نمونۂ کلام:

شوق کی ناکامیاں خارِ رگِ جاں ہو گئیں — آرزوئیں دل میں یوں بیٹھیں کہ پیکاں ہو گئیں
مرے دل کی ہر تمنا ان نگاہوں پر نثار — جو نگاہیں میرے شکووں پہ پشیماں ہو گئیں
غیر کے لب پر تبسم اور وفا نا آشنا — بزم میں تیری نگاہیں کتنی ارزاں ہو گئیں
لگ گئی فریادِ بلبل سے گلستاں بھر میں آگ — گل بداماں آشیاں آتش بداماں ہو گئیں

شوقِ زنجیر کے فصلِ بہاراں ہی نہیں — اہلِ دل یوں کہ دنیا وحشی ہے جو زنداں میں نہیں
عزلت و غربت و بربادی و بے سامانی — کون سی شے مرے کاشانۂ ویراں میں نہیں
تیر سے پیکاں ہو سکے شاید کہ نصیب اپنا — اب وہ اگلی سی خلش برق رگِ جاں میں نہیں

پابندِ وحشتی ہیں قفس میں پشیماں نہ یار — یا وہ اگلا سا اثر خونِ شہیداں میں نہیں
دوست ہیں فکرِ رفو میں کوئی ان سے کہہ دے — جیب سینے میں ہے یہ چاک گریباں میں نہیں
آہ لے جا سا [illegible] ہیں ہجر کی آہیں بھی تمام — اب تو اک شمع فسردہ بھی شبستاں میں نہیں
دورِ صیاد دیکھا [illegible] ہے فقط کنجِ قفس — ان دنوں وہ بھی پابندِ زنداں میں نہیں

ہم نفسو اجڑ گئیں مہر و وفا کی بستیاں — پوچھ رہے ہیں اہلِ دل مہر و وفا کو کیا ہوا
عشق سے بے گداز کیوں حسن ہے بے نیاز کیوں — ان کی جفا کہاں گئی میری وفا کو کیا ہوا
یہ تو ہوا کہ اب وہ کیف جام و شراب میں نہیں — ساقیِ مے کدہ کے غمزۂ ہوش ربا کو کیا ہوا
اب نہیں جنتِ مشام کوچۂ یار کی شمیم — نکہتِ زلف کیا ہوئی بادِ صبا کو کیا ہوا
تھم گیا دورۂ حیات رک گئی نبضِ کائنات — عشق و جنوں کی گرمی [illegible] کو کیا ہوا
دشتِ جنوں میں ہو گئی منزلِ یار بے سراغ — قافلہ کس طرف گیا بانگِ درا کو کیا ہوا
نالۂ شب ہے نارسا آہِ سحر ہے بے اثر — میرا خدا کہاں گیا میری دعا کو کیا ہوا

غم کے ہجوم سے مرے دل پہ جو طوفاں گزرا ہے — حادثہ ایسا زمانے میں کہاں گزرا ہے
زندگی کا ہے خلاصہ وہی اک لمحۂ شوق — جو تری یاد میں اے جانِ جہاں گزرا ہے
حالتِ دل غم سے یہ ہے جیسے کسی صحرا سے — ابھی اک قافلۂ نوحہ گراں گزرا ہے
بزمِ دوشیں کو کر دیا دکھ اس کا بے رنگ — رونقِ بارگہِ پیرِ مغاں گزرا ہے
حالِ دل سن کے وہ آزردہ ہیں شاید ان کو — اس حکایت پہ شکایت کا گماں گزرا ہے
نگرانی دل و دیدہ ہوتی ہے بیکار — کوئی جب [illegible] نگراں گزرا ہے
وہ گل افشانیِ گفتار کا پیکر سا لگا — آج کوچے سے ترے اشک فشاں گزرا ہے

شفق نے پھول بکھیرے خزاں کی وادی میں — سحر نے دامنِ مشرق کو لالہ زار کیا
وداعِ عشق ہے اب رخصت لے غمِ جاناں — کرشمہ [illegible] غمِ دوراں نے بیقرار کیا
خرد نے سائے میں جس کے پناہ کی صدیوں — جنوں نے آج اسی دامن کو تار تار کیا
نمود سے [illegible] شرح جیسے [illegible] — جنوں نے پھر [illegible] بہار کیا

ساحل

علی حسین بلگرامی

میں غالباً مئی ۱۹۰۲ء میں بمقام بلگرام ضلع ہردوئی (یو۔پی) اودھ پیدا ہوا۔ میرا اصلی نام علی حسین ہے اور میرے والد مرحوم منشی سید اقبال حسین صاحب ابن سید کاظم حسین صاحب کے جد اعلیٰ سید معز الدین صاحب دعوۃ الصغریٰ عراق کے مشہور مقام واسط سے سلطان التمش کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور ۶۱۲ھ میں بلگرام فتح کر کے وہیں آباد ہو گئے۔

میری اردو تعلیم والدین کے زیرِ سایہ وطن کے ٹاؤن اسکول میں مڈل تک ہوئی اس کے بعد مجھے غالباً ۱۹۱۲ء میں برادرِ معظم حضرت ہوش بلگرامی کے پاس حیدرآباد بھیج دیا گیا۔ وہاں کے علمی ماحول نے مجھ میں ادبی ذوق پیدا کر دیا اور میں نے سب سے پہلا مضمون ۱۹۱۶ء میں "تصور اور وہم" لکھا جو مہاراجہ سر کشن پرشاد وزیرِ اعظم دولتِ آصفیہ کے رسالہ "ترکِ عثمانیہ" میں شائع ہوا۔ اس کے بعد بھی میں نے اکثر و بیشتر مضامین لکھے۔ ادبی ذوق کے ساتھ ہی میرے دل میں مزید حصولِ تعلیم کی خواہش پیدا ہوئی اور برادرِ معظم کی ہدایت پر حضرت لمعہ نبیرۂ حضرت شعلہ دہلوی کے سامنے میں نے تحصیلِ فارسی کے لئے زانوئے تلمذ طے کیا اور انگریزی تعلیم کی ابتدا ایک دکنی ہندو استاد سے کی۔ ۱۹۱۸ء کے آخر میں بعض وجوہ سے برادرِ معظم کو حیدرآباد دکن چھوڑنا پڑا اور میں بھی بلگرام کی واپسی پر مجبور ہوا۔ اس کے بعد میں ۱۹۱۸ء میں ریاست بھوپال گیا۔ اس وقت وہاں کی فضا حضرت نیاز فتحپوری، حضرت مانی جائسی اور قمر بھوپالی وغیرہ کی ادبی و شعری سرگرمیوں سے معمور تھی۔ ان صحبتوں نے میرا دامن کچھ ایسا پکڑا کہ میں وہیں محکمۂ برقی کا کلرک ہو کر رہ گیا۔ ان اساتذۂ شعر و ادب کی صحبت نے میرے ذوقِ علمی پر خاصہ اثر کیا اور میں چپکے چپکے شعر کہنے لگا۔ اس زمانہ کے تمام کلام میں میرا تخلص یاس تھا۔ یہاں رہ کر میں اپنی ادبی و شعری زندگی کو فروغ نہ دے سکا۔ یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۲۱ء میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ریاست رامپور میں مستقل قیام کے لئے بھوپال سے منتقل ہو گیا۔

رام پور میں میری زندگی کے کئی اہم باب شروع ہوئے سنہ ۱۹۲۲ء میں ایک حادثہ سے دوچار ہو کر میری شاعری کی باقاعدہ ابتدا ہوئی۔ اگرچہ میں نے شاعری میں اپنے چچا حضرت شاداں بلگرامی سے اصلاح لینی چاہی لیکن خود انہوں نے مجھے حضرت شوق قدوائی کے دائرۂ تلمذ میں داخل کرا دیا جنھوں نے میری زیادہ سے زیادہ ۲۰-۲۵ غزلوں پر اصلاح دی اور انھیں نے یاسمیں کے بجائے میرا تخلص ساحل رکھا۔ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں میں نے بمبئی بسایا اور سنہ ۱۹۴۲ء تک میں اس عجیب و غریب شہر کی بے پناہ دلچسپیوں اور دلکشیوں میں گھرا رہا۔

سنہ ۱۹۴۲ء سے سنہ ۱۹۴۵ء تک کا زمانہ عجیب حالات میں گذرتا رہا۔ پھر سنہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہو گیا اور پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔

اگرچہ ابتداءً میرا خیال تھا کہ میں نومولود پاکستان پر اپنا بار نہ ڈالوں اور ہندوستان ہی میں رہ کر مسلمانوں کی خدمت کروں لیکن بعض احباب کے اصرار سے ۸ ستمبر کو بحری راستہ سے کراچی پہنچ گیا۔

میرے مضامین نظم و نثر۔ بہارستان، قوس قزح۔ نیرنگ رام پور۔ نیرنگ خیال لاہور مرقع لکھنؤ، ساقی (دہلی) کراچی۔ ریاست دہلی۔ کانگریس دہلی۔ تازیانہ لاہور۔ وغیرہ میں شائع ہو کر مجھے شہرت کی منزل تک اس وقت لا چکے تھے جب کہ میں سنہ ۱۹۳۲ء یا اس سے کم و بیش زمانے میں لاہور میں مقیم تھا۔ اسی زمانہ میں میری تالیفات شمع اردو۔ (دو حصے) چمن اردو۔ (دو حصے) دارالاشاعت پنجاب نے، شرح قصائد عرفی۔ خلاصہ میخانہ عبدالنبی شیخ مبارک علی لاہور نے، فرہنگ قصائد ذوق۔ جواہر الاخلاق اور خلاصہ سیفی جان محمد اللہ بخش نے شائع کیں۔

ایک کتاب کرشن اوتار ادارہ اردو کتب خانہ لاہور نے اور بچوں کے لیے ایک کہانی کی کتاب خود میں نے شائع کی۔ اس وقت کشمکش حیات میں مبتلا، لا مکانیت کے عالم میں جھونپڑیوں کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔

رباعیات

ملتا ہے روزگار رحمانی معلوم
جبراً جینے کی سرگرانی معلوم
ناکام حیات اور سانسیں بھی لوں
کیا خوب کمالِ زندگانی معلوم

ہلچل میں ہے یوں سکونِ دل کی بستی — خمیازہ بھگت رہی ہو جیسے مستی
نظروں میں تڑپ رہی ہیں عشرت گاہیں — طوفانِ جنوں میں ہے مآلِ ہستی

قطعات

یارِ خدا یہ جہل و سفاہت کا طمطراق — شعر و ادب بھی ردِ ہر چمن کے ذلیل و خوار
بنجر زمیں کے پاؤں پہ عرشِ بریں ہے خم — فرد و کے قدم پہ ہے مقبولِ روزگار

مدھ بھری آنکھوں سے رنگین تتلیوں کو دیکھتی
سبزۂ شاداب پہ شوخی سے اتراتی ہوئی
آ رہی ہے آج وہ قطرات شبنم کی طرح
رس جوانی کا گھنی پلکوں سے ٹپکاتی ہوئی

غزل

ہے نظر سوز حسنِ جلوہ طراز — ہائے تیرے حجاب کا انداز
گوش زد دل سے ہے ترا پیغام — سن رہا ہوں صدائے بے آواز
ہے وہ مستِ شباب گرمِ خرام — نگہِ مست و شرابِ شیشہ گداز
پاسِ گردوں نورد رکھتے ہیں — ہم نہیں واقفِ نشیب و فراز
حرفِ مطلب کھٹک سا گیا ان کو — جیسے گلے میں اٹک گئی آواز
دیر کیا رہ گئی قیامت میں — اللہ اللہ یہ شباب کا آغاز
بچ گئی بال بال بل کھا کر — دستِ کوتاہ سے وہ زلفِ دراز
دیکھو میرا سکوتِ حشر انگیز — ہر دو عالم ہیں گوش بر آواز
بچ گیا ہے بلائے طوفاں سے — لبِ ساحل نہ ڈوب جائے جہاز

بسملِ سینہ چاک ہوں ساحل
نہیں جز موجِ خوں مری آواز

ساقی

سید شوکت علی

سید شوکت علی نام ساقی تخلص۔ ساقی کے ساتھ جاوید کا افسانہ ایک رنگین مگر بڑی غمناک داستان ہے۔

میں ۵ / فروری ۱۹۲۱ء کو بمقام ناگپور سی۔ پی میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم چھپارہ اور سیونی (سی۔ پی) میں حاصل کی پھر ناگپور سی۔ پی سے ۱۹۳۹ء میں میٹرک پاس کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد کچھ زمانہ چھپارہ میں گذارا۔ چھپارہ سی۔ پی کے ضلع چھندواڑہ میں وین گنگا دریا کے کنارے ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ وین گنگا کے شاداب کناروں اور چھپارہ کے سرسبز اور رنگین خطے سے میں نے شعر کہنا سیکھا ہے۔ آج بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ ان دیہات کی دائیوں "مکو" اور "رمبتا" کی جوانیوں کا میری شاعری پہ کتنا احسان ہے"۔

یوں تو ابتدائی عمر سے ہی میں شعر و شاعری سے لگاؤ سا محسوس کرتا تھا لیکن شعر کہنے کا خیال مجھے اس وقت آیا جب میں میٹرک میں تعلیم پاتا تھا۔ عام طور پہ اردو شعراء غزل گوئی سے اپنی شاعری کی ابتدا کرتے ہیں لیکن میں نے اپنی شاعری نظم گوئی سے شروع کی اور آج بھی نظمیں ہی کہتا ہوں۔ اب تک مجھے اپنی وہ سب سے پہلی نظم یاد ہے۔ جو میں نے "چند لمحے ان کے ساتھ" کے عنوان سے کہی تھی۔ اس نظم کے کچھ شعر پیش کرتا ہوں

ستاروں کی دنیا لٹی جا رہی تھی　　فلک سے یہ دولت چھٹی جا رہی تھی
قمر سے تھی شب میں بشاشت نمایاں　　شعاعیں چلی تھیں خراماں خراماں
ندی کے کنارے جو گلشن لگا تھا　　تو پھولوں نے چلمن کھڑا کر دیا تھا
وہ آئی ندی کے کنارے کنارے　　محبت کے دامن کو دل میں لپیٹے

میٹرک پاس کرنے کے بعد میں نے ۳ سال حیدرآباد دکن میں گذارے اور وہاں رہ کر دکنی جاگیردارانہ ذہنیت کا قریب سے جائزہ لینے کا موقع ملا۔ حیدرآباد دکن سے ۳ سال کے بعد میں پھر ناگپور واپس آگیا اور انجمن ہائی اسکول میں مستقل طور پہ مدرس کی

اختیار کر لی ہیں اسی مدت ہی کے دوران میں ایف ۔ اے اور بی ۔ اے کے امتحانات کامیاب کئے

اس وقت تک میری شاعری تین دوروں سے گذر رہی ہے ۔ ابتدا میں مجھے قدرتی مناظر کی تصویر کشی میں خاص لطف آتا تھا۔ اس کے بعد وہ دور آیا جب میں خوب محبت کرتا رہا اور محبت کے نغمے گاتا رہا۔ اس کے بعد کچھ احساسات میں انقلاب سا آیا۔ دل نے کچھ انسانیت کا درد محسوس کیا۔ سرمایہ داری کے سانپ' افلاس کی آگ' غریبوں کا خون' زاہدوں کے ماتھے کے سیاہ داغ' ناقوس سے کھیلنے والوں کے خون آلود ہاتھ اور خدا جانے کیسے کیسے آسیب نظر آنے لگے میں نے دیکھا کہ وہ دنیا جسے میں جنت سمجھتا تھا ۔ وہ ایک دھکتا ہوا دوزخ ہے ——— لیکن اس دھکتے ہوئے دوزخ کا بھی میری شاعری پر کم احسان نہیں ۔

دورِ حاضر کے شعراء میں سے بالخصوص علامہ سیماب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت جوش کے کلام سے میں نے استفادہ کیا ہے ۔ حضرت دل شاہجہاں پوری مدظلہ سے مجھے شرفِ تلمذ حاصل ہے ۔ اور میری ادبی زندگی میں حضرت ماہر القادری اور حضرت شورش علیگ کی کرم فرمائیاں ہمیشہ شاملِ حال رہیں ۔

اشاعتِ کلام کے سلسلے میں میں اپنے برادرِ محترم حضرت اعجاز صدیقی (مدیر شاعر) کا بے حد ممنون کرم ہوں ۔ اپنی طویل اور مختصر نظموں کے بند اور کچھ اشعار پیش کرتا ہوں "

اذان

یہ نجم و ماہ کی سیرت یہ کہکشاں کا ضمیر — یہ صبح و شام کے ماتھے پہ زندگی کی لکیر
طلوعِ صبح کا عنواں شکستِ خواب کا ساز — فضائے دہر میں یہ انقلاب کی آواز
شفق کی روح مہ و کہکشاں کی نبضِ حیات — فضائے عرشِ علیٰ میں یہ زمزموں کی برات
یہ اک نبی کی رسالت کا شاہکار عظیم — جبینِ زیست پہ رقصاں یہ موجۂ تسنیم

انارکلی

قصرِ شاہی میں وہ نغموں کی سلگتی ہوئی آگ — تیری انگڑائی کا سنگیت تری سانسوں کا راگ
تیری آنکھوں میں محبت کے وہ نمناک کنول — تیری مخصوص اداؤں کا وہ اک تاج محل
رقص بیتاب کے شعلوں میں نہاتا ہوا قصر — کلہِ تاج کی عظمت کو لٹاتا ہوا قصر

دوست

ماہتاب و کہکشاں بھی ابر کے پارے بھی ساتھ ظلمتوں کے سلسلے بھی نور کے دھارے بھی ساتھ
عرصۂ ہستی میں کچھ صیاد بھی آہو بھی دوست رہگزارِ زندگی پر آہ کچھ ڈاکو بھی دوست
حلقۂ احباب میں کچھ بھیڑیے بھی ناگ بھی نجم و مہ بھی، لالہ و گل بھی دہکتی آگ بھی
تاجدار و کج کلہ بھی ہم نشیں و ہم نفس بادۂ الفت میں کچھ پھولوں کا کچھ کانٹوں کا رس
دوستی کے دائرے میں متقی بھی رند بھی بستانِ مصر و ایراں بھی بتانِ ہسند بھی

اپنا پاکستان

اپنے دریا اپنے پربت اپنے کوہستان اپنے یہ سرسبز گلستان اپنے یہ میدان
جیسے زمیں پر قدرت کے زرتار نگارستان اپنا پاکستان ہے پیارا اپنا پاکستان

آندھی

وہ دیکھو گرد آلودہ ہوئے ماتھے ستاروں کے چمن زاروں میں وہ خیمے بھڑک اٹھے بہاروں کے
وہ جاگے زلزلے فطرت کے ماتھے پر شکن آئی جبیں تاریخ کی جلتے ہوئے لوہے سے ٹکرائی
اندھیروں کے کفن پھیلے وہ دم توڑا چراغوں نے جہالت کی ردائیں اوڑھ لیں بڑھ کر دماغوں نے
وہ خبث و جرم و ذلت نے طلسمِ عہد ناکہ جادو پر لگا دی معصیت نے مہر فطرت کے ارادوں پر

آگ

چمن کی دھنستی ہوئی دیوار سے اٹھتی ہے آگ نیل کی وادی میں ہر مینار سے اٹھتی ہے آگ
آج ہر فنکار کے شہکار سے اٹھتی ہے آگ !
مصر بھی ہے آگ کی زد میں سوادِ شام بھی وہ بھڑک اٹھے جدید ایوان، قدیم اہرام بھی
مسرت برستی ہے ہر بام و در سے وہ گزرے ہیں شاید اسی رہگزر سے
یہ ہیری جبیں یہ ترا آستانہ ازل کے مصور کا تصویر خانہ
زحمت نہ کریں اور تغافل کی گوارا یوں بھی ہے نظر آپ کی آہو کا طرارہ
تا چند آپ کل میں یہ انفاس کا چراغ اک بار بجھ گیا تو جلایا نہ جائے گا

ساغرؔ فیاضی شاہجہانپوری

۱۹۲۶ء میں شاہجہانپور میں پیدا ہوا۔ میری والدہ نے مجھکو اپنی آغوشِ محبت میں لینے سے پہلے ہی جانؔ جان آفریں کے سپرد کر دی۔ میرے والد انتہا درجے کے جذباتی اور سخت مزاج ہیں اور ان کی سخت مزاجی کے باعث میں جوان ہوتے ہوتے غم پرست اور آوارہ گرد ہو گیا اور شعر کہنے لگا۔

دلِ ناشاد کو اکثر میں یوں بھی شاد کرتا ہوں ۔۔۔ جو مجھکو بھول بیٹھے ہیں انھیں کو یاد کرتا ہوں
خدا جانے کہاں پہونچا دیا جوشِ محبت نے ۔۔۔ فرشتے جس جگہ چپ ہیں وہاں فریاد کرتا ہوں

وہ کیا دن تھے کہ فردوس نظر تھی ہر نظر اپنی
نگاہِ اوّلیں ساغرؔ میں اکثر یاد کرتا ہوں

سائلؔ عبداللطیف امین آبادی

پیدائشی پاکستانی ہوں۔ میرا وطن پنجاب کے ضلع گوجرانوالہ کا ایک قصبہ امین آباد ہے (امین آباد) جس کی محبت سفر و حضر میں ثابت رہی اور رہے گی۔ میری تعلیم بھی وہیں ہوئی میرا نام عبداللطیف اور تخلص سائل ہے چشتیہ قوم سے تعلق رکھتا ہوں۔

زمانہ تعلیم ہی کو زمانہ ابتدا سمجھئے شاعری کیلئے شاعری کو واردات قلب کی زبان اور شاعر کو مناظرِ قدرت کا روحانی حامل سمجھتا ہوں۔ زندگی کے اس عزیز شعبہ میں تنہا ہوں کسی سے تلمذ نہیں۔ میں دنیائے شاعری میں اجتہاد کا قائل ہوں۔ مگر موجودہ ترقی پسندی میری نظر میں ایک سستا سا اور بے قدر و قیمت انقلاب ہے۔

شکارِ کشمکشِ روزگار ہوں۔ مختصراً داستانِ حیات ایک شعر میں عرض کر چکا ہوں۔

اس مختصر حیات کی روداد ہے طویل
ہر اک قدم پہ حشر بلا کے بپا ہوئے۔

نمونۂ کلام

ظلمتِ دیر ابھی ٹھہر ذرا دم کے لئے
میں بلندی پہ مقدر کا ستارا کر لوں

ستانے آئے ہیں آلامِ روزگار مجھے
کبھی کبھی جو ترے غم سے بچ گیا ہوں میں

لوریاں دیتی ہے تیری یاد جب
میٹھی میٹھی نیند سو جاتا ہوں میں

میں فسانۂ زیست کہتا ہوں
تم سنو مہربان ہو جاؤ

منوں مٹی کے نیچے دب چکا ہوں
مجھے اب کیوں پکارا جا رہا ہے

ساقیا تیری نگاہوں کے سوا دنیا میں
میں نے دیکھا ہے کہیں بادۂ بے جام نہیں

ساتھی

عبدالرحمٰن

پورا نام عبدالرحمٰن اور تخلص ساتھیؔ ہے ایک راجپوت گھرانے میں ۷ر جنوری ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوا۔

آج کل صوبہ سرحد میں "پاکستان ٹائمز" کی نمائندگی کر کے گذر اوقات کر رہا ہوں۔

شریک اب کے بہار خود بھی کشاکشِ انقلاب میں ہے
نظامِ دنیا بدل رہا ہے کہ ذرّہ ذرّہ عتاب میں ہے

تجلیوں کا حسین خزانہ مسرتوں سے بھرا فسانہ
کسی کے حسن و شباب میں ہے نگر کی رنگیں شراب میں ہے

بجھے ہوئے ہیں چراغِ محفل اداس ماحول ہے سراسر
عیاں ہے اک انقلاب گویا جہان سارا عذاب میں ہے

کتنی رنگین نظر آتی ہیں لحد کی شامیں
صبحِ محشر کو فرشتے ابھی پیدا نہ کریں

زیست کو دیکھتے ہیں موت سے دورا ہے پر
زحمتِ مرگ گوارا کریں اب یا نہ کریں

سالک

سالک الہاشمی

پیدائش ۱۹۲۲ء مقام بستی (یو۔ پی)

نہ احترامِ صنم ہے نہ اعتبارِ حرم — ہم آج کون سی منزل میں ہیں خدا جانے

کبھی جو زلف پریشاں ہوئی ہے اے سالک — الجھ پڑے ہیں ہواؤں سے ان کے دیوانے

سجّاد

سجّاد باقر رضوی

نام:۔ سجّاد باقر رضوی
سن پیدائش:۔ ۴۔ اکتوبر ۱۹۲۸ء
وطن:۔ ضلع اعظم گڈھ۔ یو۔ پی۔

تعلیم میں تسلسل نہ سہی شوقِ علم میں سلسلہ ضرور قائم رہا۔ ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۶ء میں میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پرائیویٹ پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۱ء میں سندھ یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ بی۔ کی ڈگری لی۔ شاعری کا ذوق فطری تھا۔ ۱۹۴۷ء سے سوچ سمجھ کر شعر کہنا شروع کیا۔

چند شعر

ہم بھی سنتے رہے نہ جانے کیوں — بات نکلی تھی غم کے ماروں کی

میرے منہ تک ترے تغافل کی — بات آئی مگر کہی تو نہیں

زلف سب رنگ و چشم سحر انداز — یہ بہت کچھ ہیں پر یہی تو نہیں

وہ جو آشنا تھے جو طوفاں سے جا ملے — پروردہ سکوں کنارے ٹھہر گئے

اک لمحۂ سکوں کی بیجا تلاش میں — تیری گلی میں درد کے مارے ٹھہر گئے

شرار صدیقی

تاریخ پیدائش ۲۰ نومبر ۱۹۲۶ء ہے اور وطن کانپور (یو۔پی) باقاعدہ آغاز فکر غالباً ۱۹۴۰ء میں ہوئی جب پہلی غزل شائع ہوئی۔ رجحانات۔ انقلابی سیاسی معاشی ہیں (اصلاحی!) نہیں۔ مجاز، فیض اور جعفری سے متاثر ہوں لیکن اپنے لئے ایک نئی "طرز" تراشنے کا قائل ہوں بسرطیکہ کامیاب ہو گیا۔

عام شاعروں کی طرح غزل گوئی سے شعر گوئی ہوئی اگرچہ بہت جلد غزل کی پگڈنڈیوں کو چھوڑ کر نظم کی شاہراہ پر آ گیا لیکن "تنگنائے غزل" کی وسعت بے کراں کا اب بھی "محرم خاص" ہوں میں اب بھی غزلیں کہتا ہوں نظمیں پہلے رومانی اور جمالیاتی کیفیات کی ترجمانی کرتی رہیں پھر نفسیاتی محور پر گردش شروع کر دی لیکن "زندگی" کے تلخ حقائق کے سامنے آتے ہی عشق اور ہوس دونوں رخصت ہو گئے۔ میرے شعور نے خود کو ایک نئے موڑ پر پایا اور وہ انقلابی رجحانات کا مرکز تھا میں اپنے کو نہ کبھی ترقی پسند کہتا ہوں اور نہ اپنے متعلق یہ سننا پسند کرتا ہوں میری شاعری کی خصوصیت میری نظر میں صرف یہ ہے کہ ان میں "خلوص فکر" کا فقدان نہیں اور کردار میں مجھے خود یہ چیز پسند ہے کہ زہر ہلاہل کو کبھی قند نہیں کہہ سکتا۔

نمونہ کلام

زندگی سے گھبرا کر موت مانگنے والے — اور یہاں اگر تجھکو موت بھی نہ راس آئی؟

کیا ہوا اگر تیرے آنچل کا کنارہ نیلا — میرا آنسو ہی تو تھا عرش کا تارا تو نہ تھا

مزاج سرو و سمن تک پہونچ کے دم لیں گے — ہم آج راز چمن تک پہونچ کے دم لیں گے

خوشا وہ جرعۂ تلخابۂ حسیات کہ ہم — شراب معرفت و جام جم سے دور رہے

اگر پہاڑ ہو زد میں تو خاک ہو جائے — گذر رہے ہیں وہ ذروں پہ سانحات حضور

اف وہ ادھوری انگڑائی — جیسے نیم کشیدہ سے

ہمارے خون نے کتنے آفتاب ڈھالے ہیں — لہو کچھ اور بہاؤ کہ تیرگی ہے ابھی

ہزار لب پہ ہیں پہرے زباں پہ تالے ہیں — مگر وہ چپ نہ رہیں گے جو کہنے والے ہیں

خرد کے کہنے پہ سوچتا ہوں کہ اس کو سرشار چھوڑ جاؤں — جنوں اگر میرے اس ارادے پہ مسکرایا تو کیا کرونگا

سلیم

رضاء الاسلام صدیقی

پیدائش ۱۹۳۰ء بمقام دہلی

بہا خزاں میں کلوں کی نزاکتوں کا لہو — چمن میں ہو گیا ارزاں لطافتوں کا لہو
سمجھ کا فرق ہے ورنہ بہار میں اے دوست — بہا یا جاتا ہے پھولوں کی نکہتوں کا لہو
غرقِ امید کی کشتی ہوئی ساحل کے قریب — یعنی تقدیر بھی روٹھی ہے تو منزل کے قریب
آنسوؤں کے چند قطرے ہیں سو قربان آپ پر — زندگی کی آخری دولت لئے جاتے ہیں ہم

سلیم

منصور علی سہروردی

نام منصور علی تخلص سلیم اور میری خاندانی نسبت سہروردی ہے تلمیذ علامہ سیماب اکبر آبادی

فصلِ گُل دیکھ چکے دورِ خزاں دیکھا ہے — ہم نے ہر رنگِ جہانِ گذراں دیکھا ہے
گر رہی ہیں آشیاں پر بجلیاں کچھ اس قرینے سے — کہ ہر بجلی بنائے آشیاں معلوم ہوتی ہے

سوز

شاہد حسن ناروی

نارہ ضلع الٰہ آباد یوپی کی وطنی مناسبت سے خود کو ناروی لکھتا ہوں حضرت نوح ناروی سے شرفِ تلمذ حاصل ہے

آؤ لکھ ڈالیں زبانِ عشق کے کل واقعات — کچھ تمھیں بھی یاد ہوں گے کچھ ہمیں بھی یاد ہیں
مرا ہاتھ ہے دستِ نازک میں اُن کے — لئے جا رہے ہیں چلا جا رہا ہوں
وہ مرے سلسلۂ شوق پہ بولے ہنس کر — انتہا بھی ہے کوئی آپ کے ارمانوں کی
آپ تو پان، پھول سے ہلکے — بات سو لاکھ من سے بھاری ہے

سوز ظہیر احمد صدیقی

سوز کو ظہیر احمد صدیقی کہتے ہیں تخلص اور خاندان ظاہر ہے ۔ والد صاحب قبلہ کا اسم گرامی شفیق احمد ہے اور ادیب تخلص، والد صاحب بہت اچھے شاعر ہیں انکے بہت سے شاگرد ہیں ۔ دادا صاحب مرحوم بھی شاعر تھے ۔ اگر اس پر فخر کروں کہ شاعری ورثہ میں ملی ہے ۔ تو بجا ہے ۔ تاریخ پیدائش ۲۰؍ اگست ۱۹۳۷ء ہے آبائی وطن دیوبند ہے سب سے پہلے کلام پاک حفظ کیا پھر دارالعلوم میں اردو فارسی عربی کی تعلیم حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک منشی فاضل پاس کیا ۔ فی الحال بہ متضاد صفتوں کا مالک ہوں ایک کالج میں ایف ۔ اے کا طالب علم ہوں اور دوسرے کالج میں ادیب عالم منشی فاضل کا پروفیسر

والد صاحب قبلہ کرنال میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھے ۱۹۴۷ء کے ہولناک فسادات میں پاکستان تشریف لائے ۔

مناظر فطرت دیکھ کر محفوظ ہوتا ہی ہوں لیکن مسکراہٹ کے ساتھ آنسوؤں میں جو بات پاتا ہوں وہ کسی منظر میں نہیں ملتی ۔ سنجیدہ ادبی اور دلچسپ مذاق کا دلدادہ ہوں ۔

شاعری کا بچپن سے ہی شوق تھا ۔ جب منشی فاضل کا امتحان پاس کیا بھائی صاحب نے ایک قلم بطور انعام دیا ۔ اور فرمایا کہ اس پر کچھ کہو تو جانیں چنانچہ اسی وقت یہ دو شعر کہے

اے قلم اے میرے استقبال کے آئینہ دار　　کاش تجھ سے ہوں عیاں فطرت کے یہ رنگیں شرار
سوزِ رومی سازِ خسرو فکرِ اقبال و کلیم　　جس سے میں کہلاؤں اقلیم سخن کا تاجدار

شاعری میں پہلے اپنے محترم استاد محبوب الٰہی صاحب کامل سے اصلاح لیا کرتا تھا اب مضطر صاحب گجراتی سے اصلاح لیتا ہوں ۔ کلام میں سوز و گداز اور بلند خیالی کو پسند کرتا ہوں ۔ زیادہ تر نظمیں لکھتا ہوں ۔

حریم ناز کے سب راز دیدے   بہ جبریل بی پرواز دیدے
دمِ عیسےٰ ہو جس کی ہر سسک لے
خدایا سوز کو وہ ساز دیدے

اک سوز ہے اک ساز ہو یہ شعلہ و شبنم   خاموش فضائیں نہیں ہے یاد کا عالم
بھٹکی ہوئی آہیں ہیں گھنگھور گھٹائیں
دل کی کوئی دھڑکن ہے بارش کی چھما چھم

اف درد سے بھرتا رہوں آہیں کب تک   اک شوق میں اٹھتی رہیں باہیں کب تک
آجا مرے بچھڑے ہوئے ساتھی آجا
تکتی رہیں نظریں یونہی راہیں کب تک

چہ شد یا ساقیٔ مہوش خطائے   نہ آں بادہ نہ جام دلکشائے
بہ بیں حالِ خرابم در بہاراں
بستاں کے روا باشد جفائے

صبائے می وزد چوں صبحگاہے   بیاد تو چکد خوں از نگاہے
بفرما اے تغافل پیشۂ من
نرا آید خیالِ سوز گاہے

منور کن برنگ صبح شامے   بدستِ خود مرا دہ یک دو جامے
بیا از جلوہ نورے کن بہ ظلمات   یکے در خانۂ دل کن خرامے

(ایک نظم کے چند شعر)   ساتھی سے

پرسکوں پر لطف تھا وہ عہدِ رفتہ کس قدر   جب تو بید راحت آرام تھے شام و سحر
پر بہار و پر فضا وہ دورِ ماضی یاد ہے   عہدِ حاضر کس قدر ناشاد ہے برباد ہے
جب شفق کی سرخیوں میں ڈوبتا ہے آفتاب   ڈالتی ہے رخ پہ دنیا جب سیاہی کا نقاب
رات کو عالم میں چھا جاتی ہیں جب تاریکیاں   اور کرتی ہے ہوا پتوں سے جب سرگوشیاں
آہ کوئی یاد کرتا ہے گذشتہ دور کو   جس طرح پروانہ شمع انجمن سے دور ہو
دامنِ شب میں نکھر جاتا ہے جب دم آسماں   سرمئی جاموں پہ بنجاتی ہے آنچل کہکشاں
جب ستاروں سے مزین شب کا ہوتا ہے شباب   کاکلوں سے رات کی جب کھیلتا ہے ماہتاب

شاعر

حسن پاشا لکھنوی

میرا نام حسن پاشا اور تخلص شاعر ہے ۱۶ ر اکتوبر ۱۹۱۶ء کو بمقام لکھنؤ پیدا ہوا۔ آباؤ اجداد کا وطن قصبہ امیٹھی بندگی میاں ضلع لکھنؤ ہے۔

حضرت بندگی میاںؒ کے (جو اپنے زمانے کے ولیٔ کامل گذرے ہیں) خاندانی نسبت کا فخر حاصل ہے۔

تعلیم کی تکمیل لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ طبیعت کا فطری رجحان۔ لکھنؤ کی آب و ہوا کے اثرات اور ادبی محافل کی گرما گرمی۔ ان سب باتوں نے مل جل کر شعری صلاحیتیں بیدار کردیں ۱۹۳۲ء سے باقاعدہ شعرگوئی کا آغاز کیا اور اپنے ذوقِ سلیم ہی کو اپنا رہبر بنایا۔ شہرت کا آغاز اِس غزل سے ہوا جس کا مطلع یہ تھا۔

گر نہ جائیں کہیں آنکھوں سے یہ پیارے آنسو
میری ہستی سے بھی مہنگے ہیں تمہارے آنسو

اس کے بعد لکھنؤ کی نکھری ستھری اور مخصوص ادبی محفلوں میں شریک ہوتا رہا۔ اور لکھنؤ کی زلف و رُخ والی روایتی شاعری سے بغاوت کرکے فکر و تخیّل کی گہرائیوں کے سہارے ایک زندہ اور متحرک رنگ تغزل پیدا کیا اور وہ زندگی کے رشتہ کو سمجھکر شعر کہنا شروع کئے۔ اور شدید مخالفتوں کے باوجود غزل گو شعرا کی ممتاز صف میں جگہ حاصل کی۔ مشاعروں کی شرکت کا زیادہ قائل نہیں۔ اکتوبر ۴۸ء میں ہندوستان کو خیرباد کہکر پاکستان آیا اور لاہور کے ریڈیو اسٹیشن میں فیچر لکھتا رہا۔ آب و ہوا کی ناسازگاری کے باعث کراچی آیا فی الحال ہمدرد دواخانہ کراچی کے شعبۂ نشر و اشاعت سے متعلق ہوں۔ تلامذہ کے حلقے میں عارف عباسی۔ اقبال صفی پوری۔ اور طرب ندوی نمایاں حیثیت کے مالک ہیں

نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔

غمِ حبیب مبارک ہے زندگی کے لئے — چراغ ڈھونڈ لیا ہم نے روشنی کے لئے
وہ اک نگاہ جو اٹھی ہے برہمی کے لئے — اسی نگاہ میں سب کچھ ہے زندگی کے لئے

نظر نظر کے تصادم کا لطف کیا کہنا
ہے کائنات میں روشن اسی سے شمعِ حیات
وہیں پہ مصلحتوں نے چھڑا دیا تجھ سے

ایک اجنبی کا سہارا اک اجنبی کے لئے
جو غم نہیں تو اندھیرا ہے آدمی کے لئے
جہاں پہ تیری ضرورت تھی زندگی کے لئے

نہ خزاں میں ہے کوئی تیرگی نہ بہار میں کوئی روشنی
یہ شکستِ دید کی کروٹیں بھی بڑی لطیف و جمیل تھیں
یہ فروغِ بادہ و جام کیا۔ یہ حدیثِ نغمہ و ساز کیا

یہ نظر نظر کے چراغ ہیں کہیں بجھ گئے کہیں جل گئے
میں نظر جھکا کے تڑپ گیا وہ نظر بچا کے نکل گئے
جو ترے شباب سے بچ رہے وہ شراب و شعر میں ڈھل گئے

یہ گل و لالہ یہ مہ و انجم
ڈوب گئی شاید کوئی کشتی
صدیوں کی تخلیق سے بہتر

ان پردوں میں چھپ نہ سکے تم
سونی سی ہے بزمِ تلاطم
وہ اک لمحہ جس میں ملے تم

ترا جمال بقیدِ حجاب کیا کم ہے
نفس نفس متلاطم نظر نظر بے تاب
اسی میں نیند ہے شاعر اسی میں بیداری

ہزار ابر سہی آفتاب کیا کم ہے
قیامت آئے نہ آئے شباب کیا کم ہے
یہ زندگی کا ادھورا سا خواب کیا کم ہے

روشنی کی سحر کی باتیں ہیں
بڑھتے جاتے ہیں زخمِ دل پھر بھی
اتنی ہی تیرگی ہے دنیا میں

سب فریبِ نظر کی باتیں ہیں
عظمتِ چارہ گر کی باتیں ہیں
جتنی شمس و قمر کی باتیں ہیں

محسوس ہر نفس پہ ہوئی اک کمی مجھے
گھبرا کے اپنے آپ سے میں دور ہو گیا
اللہ رے اک نگاہِ محبت کا انقلاب

دنیا ترے بغیر نہ بہلا سکی مجھے
کیوں اس قدر قریب سے آواز دی مجھے
تاریخ زندگی کی بدلنا پڑی مجھے

شان محی الدین

میرے اسلافِ عظام مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں ڈسکہ ضلع سیالکوٹ سے نواب بہادل خاں رابع مرحوم و مغفور کی قدر افزائی پر ہجرت کرکے سنہ ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۵ء احمد پور شرقیہ میں مستقلاً قیام پذیر ہوئے۔ وہ اپنے زمانہ کے ایک متبحر عالم اور پیرِ طریقت تھے۔

چنانچہ ان کے ظاہری علوم و فنونِ رشد و ہدایت اور باطنی تصرفات۔ بلند نظری شہادتِ نفس پر آج تک ایک عالم فخر کرتا ہے۔

سرکارِ فرنگ کی عملداری سے بیشتر میرے بزرگان ریاست کے قاضی القضاۃ اور مفتی اعظم کے عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز رہ کر ایک دنیا کو مستفیض فرماتے رہے ہیں۔ اب بھی حضرت قبلہ والد صاحب کی بدولت خاندانی روایات تازہ ہیں۔

عربی۔ فارسی اردو کی ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ اس کے بعد وہیں کے سرکاری ہائی اسکول میں داخل ہو گیا۔ میں ابھی مڈل کلاس ہی میں پڑھتا تھا کہ شعر گوئی کا چسکا پڑ گیا۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں ایک عوامی تحریک چلی جس کا مقصد ریاست میں کامل ذمہ دار نظامِ حکومت کا نفاذ کرانا تھا۔ میں نے اس تحریک میں حصہ لیا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی نظموں اور بے ربط تقریروں سے احمد پور شرقیہ کی فضا میں اچھی خاصی ہلچل پیدا کر دی۔ اس کی پاداش میں مجھے ریاست کے محکمۂ احتساب نے کئی بار ڈانٹا۔ مگر میرے لڑکپن اور والد محترم کے اثر و رسوخ کی وجہ سے نوبت قید و بند نہ آنے پائی۔ اس تحریک کے بعد میرا شعر گوئی کا جذبہ اور جلا پانے لگا اور لوگوں کی جا و بیجا داد نے مجھے شاعر بننے کی دھن میں بُری طرح مبتلا کر دیا۔ لیکن میں نے سلسلۂ تعلیم ضرور جاری رکھا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۴۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اور اس کے بعد بہاولپور آکر کالج کی ایف اے کلاس میں داخل ہو گیا۔ یہاں میں نے ادبی ہنگاموں اور سیاسی سرگرمیوں میں زیادہ حصہ لینا شروع کر دیا جس کی بنا پر والد بزرگوار نے کالج چھڑوا کر مجھے اپنی نگرانی میں تعلیم دلانا شروع کی

میں نے مئی ۱۹۴۴ء میں ادیب فاضل ستمبر ۱۹۴۴ء میں ایف اے۔ اور ۱۹۴۵ء میں منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے اور بی اے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے پھر بہاولپور میں اقامت اختیار کرلی یہاں آتے ہی میں نے ایک پرائیویٹ نائٹ اورنٹیل کالج کی بنیاد ڈالی اور ایک ادبی ماہنامہ "کارواں" جاری کیا۔ ان دنوں حصول پاکستان کی جدوجہد زوروں پر تھی اور مسلم لیگ کی حمایت ایک فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ میں نے "کارواں" کو ایک عشرہ وار اخبار کی صورت میں شائع کرنے کی اجازت لی اور اس کے ذریعے ریاستی عوام کو مسلم لیگ کی حمایت اور حصول پاکستان کی جدوجہد میں شرکت کرنے پر زور دیا۔ یہ اس قسم کی پالیسی کا ریاست بہاولپور میں پہلا اخبار تھا۔ مخالفین کی انتھک کوششوں نے اس وقت کے عیسائی وزیر اعظم کو مجھ سے بدظن کر دیا۔ چنانچہ اس کے عشرہ وار "کارواں" کو بند کر کے مجھے صرف ادبی ماہنامہ "کارواں" جاری کرنے کی ہدایت کی۔ یہ رسالہ اب بھی شائع ہو رہا ہے۔

میں نے اپنے شوق کی تکمیل کے لئے ایک اور راہ نکالی اور ایک دوست کی ہفتہ وار اخبار "العزیز" کو اپنا لیا۔ چنانچہ اس کے ذریعے میں نے اپنے مشن کو جاری رکھا۔ اس اثنا میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پاکستان منصۂ شہود پر آگیا۔ مخالفین کا زور کم ہو گیا۔ ریاست کا انگریز وزیر اعظم بوریا بستر گول کر کے چلا گیا۔ اور اس کی بجائے نواب مشتاق احمد صاحب گورمانی وزارت اعلیٰ پر فائز الکرام ہو کر آئے جسٹس دین محمد ان کے دوست تھے میں نے ان کی وساطت سے نواب صاحب سے ملاقات کی اور صورت حال بتائی۔ انھوں نے بکمال مہربانی مجھے ایک روزنامہ اخبار "پرواز" جاری کرنے کی اجازت مرحمت فرما دی۔

میں نے اس اخبار کے ذریعہ ریاستی باشندوں میں اتحاد کو فروغ دینے اور انھیں آئینی طریق پر اپنے جمہوری حقوق حاصل کرنے میں حتی المقدور مدد دی۔ مسلم لیگ کے قیام اور اس کے وقار کے تحفظ کے لئے ہر ممکن سعی آرائی کی چنانچہ میری ان سیاسی و صحافتی سرگرمیوں کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ یہ تو میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ شعر گوئی کا شوق مجھے بچپن سے تھا۔ چنانچہ اس شوق کی تکمیل کیلئے میں نے ۱۹۴۳ء میں کافی غور و خوض کے بعد علامہ سیماب اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے شرف تلمذ حاصل کیا لیکن مولانا نے جلد ہی ایک اعلان کے ذریعہ یہ سلسلۂ تلمذ ختم کر دیا اور تمام ہندی شاگردوں کو اپنے منتہی شاگردوں سے رجوع ہونے کی تلقین فرمائی۔ اس اعلان کی روشنی میں مجھے ان کے کسی منتہی شاگرد سے باقاعدہ اصلاح لینی چاہیئے تھی لیکن حق یہ ہے کہ

میری طبیعت نے اس طرف رغبت نہ کی اور میں نے شعر کہنا چھوڑ دیا لیکن محترم دوست مولانا مضطر گجراتی نے مجھے زبردستی اس میدان میں پھر گھسیٹ لیا اور میرا یہ شوق زندہ ہو گیا۔ اب مجھے کوئی فنی مشکل در پیش آتی ہے تو میں عموماً ان سے ہی رجوع ہوتا ہوں۔

۱۹۵۰ء میں بابائے اُردو مولانا عبدالحق صاحب کے مشورے سے میں نے بہاولپور میں ایک صوبائی معیاری انجمن ترقی اُردو کی شاخ قائم کی۔ جسے حکومت بہاولپور سے سوسائیٹز ایکٹ کے ماتحت رجسٹرڈ بھی کرا لیا ہے اس انجمن کی طول و عرض ریاست میں شاخیں موجود ہیں۔ بہاولپور میں ایک دارالمطالعہ بھی اس کی نگرانی میں قائم ہے اور ایک لائبریری کے قیام کی تجویز زیر غور ہے۔ اب چند غزلوں سے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے

انتخاب کلام

مجھ پر بھی تیرے پیار کا الزام آگیا — لے ایک اور صید تہِ دام آگیا
کس کی شبِ وصال کی ہوتی ہے ابتدا — کیوں آج آفتاب سرِ شام آگیا

ان کو دیکھا اور محبت ہو گئی — زندگانی اک مصیبت ہو گئی
ایک دنیا درپئے آزار ہے — اب تو ملنے میں سہولت ہو گئی
شاؔن اب مرنا بھی دوبھر ہے مرا — شکر ہے جینے کی صورت ہو گئی

اگر دل کر خود آرائی نہ ہوتی — نمایاں تیری یکتائی نہ ہوتی
مجھے ذوقِ طلب نے مار ڈالا — وگرنہ میری رسوائی نہ ہوتی
خزاں کو مل گیا ہنسنے کا موقع — چمن میں یوں بہار آئی نہ ہوتی
اگر شبنم نہ رو دیتی چمن میں — تو پھولوں کو ہنسی آئی نہ ہوتی
ہمیں اے شاؔن دل دینا نہ پڑتا — نظر اُن کی جو شرمائی نہ ہوتی

فصلِ گل آئی تو وہ یاد آ گئے — باغِ دل پر پھول سے برسا گئے
تیرگی سے روشنی میں آ گئے — ہم بھٹک کر اپنی منزل پا گئے
کیا گئی گلشن سے وہ جانِ بہار — آرزوؤں کے کنول مرجھا گئے
وائے ناکامی کہ بزمِ ناز میں — جیسے تنہا آئے تھے، تنہا گئے

سہارا ناخدا دے بھی تلاطم میں تو کیا حاصل — جنھیں ہے ڈوبنا وہ غم کے مارے ڈوب جاتے ہیں
کوئی اس وقت اندازہ کرے کیفیتِ دل کا — سرِ مژگاں جب آ آ کر ستارے ڈوب جاتے ہیں

خودی میں ڈوب کے اتنا تو کر لیا ہوتا — نہ بن سکا تھا خدا تو خدا نما ہوتا
میں خود ہجومِ حوادث میں کھو گیا ورنہ — یہاں تمھیں نہ سہی خود کو پا لیا ہوتا
مذاقِ زیست کو اے شانؔ میں سمجھ نہ سکا — خود اپنی آگ میں جلتا تو کیمیا ہوتا

دل میں کوئی بات بھی جو بار بار — لب پر آ کر آہ بن جاتی رہی
زندگی کی مشکلوں کے سامنے — موت بھی آنے سے گھبراتی رہی

اب تو یہ عالم ہے مایوسی کے بعد — سازِ دل اک سازِ بے آواز ہے
گتھیاں سلجھائیے کیا موت کی — زندگی خود اک طلسمِ راز ہے
اب قفس میں کوششِ پرواز کیا — اب قفس خود مائلِ پرواز ہے
شانؔ میرے ساغرِ الفاظ میں — بادۂ دوشینۂ شیراز ہے

لبِ لعلیں پہ ہلکی سی ہنسی معلوم ہوتی ہے — شفق میں کوئی بجلی کوندتی معلوم ہوتی ہے
ستم ہے اے مرے جذباتِ دل سے کھیلنے والو — تمھیں ہر بات میری دل لگی معلوم ہوتی ہے
تمھارے چاند سے ماتھے پہ ہلکی سی شکن کیوں ہے — خدا نا خواستہ کچھ برہمی معلوم ہوتی ہے
ہنسو اے ننھی کلیو شانؔ کی افسردہ حالی پر — تمھاری یہ ہنسی کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے

چند نظموں کے منتخب اشعار

ارضِ کعبہ[1] کی حفاظت بھی نہ جس سے ہو سکی — کیسے توڑے گا وہ مشرق میں کلیسا کا فسوں
ختم ہو سکتی ہے بندہ اور آقا کی تمیز — ہو نہ منعم کو اگر سرمایہ داری کا جنوں
کروٹیں بدلیں زمانے کی طرح اغیار نے — رہ گیا مردِ مسلماں سر بہ زانو جوں کا توں
راہ سے بھٹکا ہوا ہوں اور منزل دور ہے — قافلے والو ذرا ٹھہرو کہ میں بھی آ ملوں

کاش ہو جائیں مسلمانانِ عالم خود شناس — اب بھی ہے ان کے تصرف میں جہانِ رنگ و بو
آزمایا ہے فرنگی کو بہت میں نے مگر — سچ تو یہ ہے آج بھی بدلی نہیں ظالم کی خو
رہبروں کو پھر بھی منزل کا پتہ ملتا نہیں — رہبری گو کر رہے ہیں تیرے جلوے چار سو
رات بھر نو خواہشیں دل میں جنم لیتی ہیں شانؔ — صبح دم کرتا ہوں ان کے خون سے اپنا وضو

---

[1] ارضِ فلسطین کی طرف اشارہ ہے۔

ایم۔ اے راعی جالندھری

مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۲۶ء کو ضلع جالندھر موضع ڈھیریاں میں مراد بخش جاگیردار کے یہاں تولد ہوا۔ بچپن میں شفقتِ پدری سے محروم ہو گیا۔ جو کچھ کہتا ہوں اسے ملاحظہ فرمایئے

ہے جنگ کے آلات پہ کافر کو بھروسہ ۔۔۔ کافی ہے مسلماں کے لئے نعرۂ تکبیر

ناکامیٔ الفت سے جس کا دل ٹوٹ چکا ہو اسے شاہد
گلشن بھی نگاہوں میں اس کی پُر ہول بیاباں ہوتا ہے

ایسے بھی وقت آئے اس زندگی میں اکثر ۔۔۔ میں اپنی بے بسی پر خود زار زار رویا

شاہد نقوی

میرے آباؤ اجداد قصبہ شکارپور ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے لہٰذا اسی مقام بدنام کو میرا وطن سمجھنا چاہیئے اواخر ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوا۔ ذوق شعری فطری تقاضہ پہلی غزل گیارہ برس کی عمر میں کہی اور اس کے بعد سے یہ سلسلہ جاری ہے خدا معلوم کب تک شعر کہتا رہوں اس لئے کہ فطرت سے مجبور رہوں۔

نمونہ کلام

بلانے والے اسی ادا سے پھر ایک آواز جرأت افزا
حد تعین تک آ چکا میں مگر یہاں ڈگمگا رہا ہوں

خطا اور کس قدر رنگیں کہ جو زینت عالم ۔۔۔ فرشتوں سے جواب لغزشِ آدم نہیں ہوتا

بے ساختہ گریز نہ سادہ لگاوٹیں ۔۔۔ کچھ اور ہو گئے وہ شعور حیا کے بعد

دھجیاں اب تو گوارا ہیں گریبانوں کی ۔۔۔ اور اگر تھم گئی وحشت کبھی دیوانوں کی

شارب — شارب صدیقی

سال پیدائش ۱۹۲۴ء - وطن کانپور

مری نظر میں بھی اک بات ہے کسی کے لئے
یہی فریب بہت کچھ ہے زندگی کے لئے

ستم میں شائبۂ التفات ہے ساقی
یہ احتیاط محبت کی بات ہے ساقی

شاکر — محمد حسین عروجی

۱۹۱۷ء میں پیدا ہوا۔ آج کل لائلپور سے ایک رسالہ "پرچم" کے نام سے شائع کرتا ہوں۔ صرف ایک شعر سن لیجئے۔

یا اب کہ زندگی سے امید وفا نہیں
یا جبکہ دشمنی تھی دعا کو اثر کے ساتھ

مبارک الدین ادیب کے افسانوں کا نیا مجموعہ

سُرخ ستارے

افسانوی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے

سنہرے ستاروں کی دنیا میں بیٹھ کر اس کے قلم نے سرخ ستارے تخلیق کئے ہیں

ایسے سرخ ستارے جو فلسفۂ حیات پر پوری روشنی ڈالتے ہیں -

بہترین کتابت و طباعت - ولایتی کاغذ خوشنما جلد رنگین

اور دلکش گردپوش - ضخامت دو سو صفحات

اور قیمت صرف [illegible] روپے -

محصول ڈاک ۱ر

مکتبۂ رحیم کراچی

شاد محمد طفیل حسن

میرا نام ایم طفیل حسن اور شاد تخلص ہے۔ والد کا نام حسن محمد ہے۔ میرے آباد اجداد خاص لاہور کے رہنے والے تھے آج بھی ہم یہیں سکونت پذیر ہیں میری پیدائش ۱۹۳۶ء میں ہوئی اس وقت دسویں جماعت میں تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔

شعر و شاعری سے بچپن ہی سے لگاؤ ہے۔ یوں تو ایک عرصے سے ایک آدھ شعر کہہ رہا تھا۔ مگر پہلی نظم بعنوان "میرا اور شیطان کا مقابلہ" ۱۹۴۸ء میں لکھی نظم کیا تھی جو بھی پڑھتا ہنسے بغیر نہ رہتا۔ یہ نظم میں نے اپنے بڑے بھائی کو دکھائی۔ وہ بہت متاثر ہوئے اور میری بہت حوصلہ افزائی کی اس روز سے مجھے شعر کہنے کا اور بھی شوق بڑھ گیا۔ شاعری اس قدر دلچسپ معلوم ہوئی کہ جب بھائی جان کے نام رسالہ آتا تو میں سب سے پہلے تمام نظمیں اور غزلیں پڑھ لیتا۔ یہ ذوق و شوق روز بروز بڑھتا گیا اور اشعار خود بخود زبان پر آنے لگے۔ اب میں نے وہ اشعار نظموں کی صورت میں ایک کاپی پہ لکھنے شروع کر دیئے آہستہ آہستہ محلے میں اس بات کا چرچا ہو گیا کہ میں شعر کہتا ہوں۔

جب میرے پاس آٹھ دس نظمیں جمع ہو گئیں تو انھیں کسی رسالے میں شائع کرانے کا خیال پیدا ہوا۔ مگر انھیں دنوں مجھے کسی نے بتا دیا تھا کہ تمہیں اپنی نظموں پر اصلاح لینی چاہیئے۔ چنانچہ میں نے اپنی پہلی غزل جناب اصغر نثار قریشی۔ بی۔ اے کے سامنے رکھی ان کی حوصلہ افزا اصلاح نے میری طبیعت کو اور جلا بخش دی۔ نثار صاحب کو دکھانے کے بعد یہ غزل میں نے ایک رسالے میں شائع ہونے کو دی اور اگلے ماہ ہی شائع ہو گئی۔ جب میں نے پہلی بار رسالہ میں اپنا نام دیکھا تو خوشی سے پھولا نہ سمایا یہ میرے لیئے انتہائی مسرت کا مقام تھا۔ اب مجھے شاعری کی دھن سما گئی۔ اور چند ماہ کے قلیل عرصہ میں بیس پچیس نظمیں اور غزلیں کہہ ڈالیں۔

خدا کے فضل و کرم سے میں شاعری کے ساتھ ساتھ جماعت میں بھی بہت اچھا چلتا رہا۔ جب میں دسویں جماعت میں داخل ہوا۔ تو چند اساتذہ کرام نے اسکول میں ایک بزم ادب قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی میں نے اس میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چنانچہ جب بزم ادب کا پہلا اجلاس منعقد ہوا تو سب نے اتفاق رائے سے مجھے صدر منتخب کیا۔ اور اب تک اسکول کی بزم ادب کا صدر رہ ہوں۔ تعلیمی مستقبل کے بارے میں میرے عزائم بڑے بلند ہیں۔ لیکن ان کی تکمیل توفیق ایزدی پر موقوف ہے۔

نمونہ کلام کے طور پہ ایک دو غزلیں اور نظمیں حاضر ہیں۔

تمہیں پا رہے ہیں جہاں جا رہے ہیں ... اب اس سے غرض کیا کہاں جا رہے ہیں
مبارک ہو تجھ کو تری بزم رنگیں ... بسانے ہم اپنا جہاں جا رہے ہیں
نہیں ہم کو معلوم آخر کریں کیا ... ارادے سبھی رائیگاں جا رہے ہیں
کسی کی شکایت، نہ شکوہ کسی سے ... کہ خود ہم لٹا کر جہاں جا رہے ہیں

نہ پوچھا کسی نے ہمیں شاد اب تک
کہاں سے ہم آئے کہاں جا رہے ہیں

نظر شادماں ہے نہ دل شادماں ہے ... ہمیں جذبہ عشق لایا کہاں ہے
ستاروں سے پوچھو ان اشکوں کی قیمت ... تری یاد میں جو بہے جا رہے ہیں
میں دیتا ہوں دل کو تسلی یہ کہہ کر ... وہ اب آ رہے ہیں ابھی آ رہے ہیں
خدا جانے کب اپنی منزل پہ پہونچیں ... مسافر ابھی ٹھوکریں کھا رہے ہیں

کوئی راز تو شاد مضمر ہے اس میں
وہ کیوں اب جفاؤں پہ شرما رہے ہیں

آ رہے ہیں سر جھکائے میری بزم شوق میں ... بازی ہرج انکی جفاؤں پر وفائیں لے گئیں
جو اڑا لائی تھیں زلف مشکبو کی نکہتیں ... میری نیندوں کو وہی ٹھنڈی ہوائیں لے گئیں
ایک حیرت کا سماں طاری ہے نگہہ و قلب پر ... کیا بتاؤں کس جگہ انکی ادائیں لے گئیں

شاد تو قابل نہ تھا تو اس کے لائق ہی نہ تھا
تجھ کو اس درجہ پہ لوگوں کی دعائیں لے گئیں

علامہ سیماب کے انتقال پر

تھا اجالا جس سے ہر سو وہ دیا جاتا رہا — شمع محفل بجھ گئی سیماب کیا جاتا رہا
بچھ گئی ہے ارض ہند و پاک میں ماتم کی صف — شاعری کو جس پہ فخر و ناز تھا جاتا رہا
رو رہی ہے ایک اک موج اور ساحل ہے اداس — چھوڑ کر کشتی بھنور میں ناخدا جاتا رہا
ہو گئی بزم ادب تاریک یکسر ہو گئی — ادبی دنیا میں اجالا جس سے تھا جاتا رہا
سونا سونا ہے چمن خاموش ہیں سارے طیور — باعث رونق جو تھا نغمہ سرا جاتا رہا
اشک کیوں تھمتے نہیں تھمتے نہیں تھمتے نہیں — کھو دیا کیا آج ہم نے ہم سے کیا جاتا رہا

ہر نظر اندوہگیں ہے شاد کبھی ناشاد ہے
عالم ہستی کا اک راز آشنا جاتا رہا

پیارا چاند!

سب چیزوں سے پیارا چاند — میری آنکھ کا تارا چاند
کیسی اس کی چمک دمک ہے
کیسی دلکش اس کی جھلک ہے
سب چیزوں سے نیارا چاند — میری آنکھ کا تارا چاند
اس کا ہے آکاش پہ ڈیرا
دور یہ کرتا ہے اندھیرا
ہر اک کو ہے پیارا چاند — میری آنکھ کا تارا چاند
چاند سے روشن ساری دنیا
میری پیاری پیاری دنیا
کرنوں کا گہوارا چاند — میری آنکھ کا تارا چاند
بے شک ہم سے ہے یہ دور
پھر بھی کتنا ہے پر نور !!
میرے دل کا سہارا چاند — میری آنکھ کا تارا چاند

شاہین

عزیزہ شاہین گوالیاری

حضرت شفا گوالیاری محتاج تعارف نہیں مجھے فخر ہے کہ میں موصوف کی نواسی ہوں اور شرفِ تلمذ بھی موصوف ہی سے حاصل ہے ویسے اپنے والد صاحب قبلہ سے بھی اصلاح لی ہے مجھے صنفِ غزل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں لیکن اخلاقی نظمیں کہنے کا زیادہ شوق ہے۔ میرا کلام "نئی روشنی" "ایمان" اور دوسرے پرچوں میں وقتاً فوقتاً چھپتا رہتا ہے۔

میرا نام سیدہ عزیزہ فاطمہ اور تخلص شاہین ہے خاندان میں تو لوگ میرے معروف نام ہی کو جانتے ہیں لیکن رسائل وغیرہ میں عزیزہ شاہین کے نام سے چھپتی ہوں۔ میری جائے پیدائش دلشکن گوالیار ہے۔ اردو، فارسی اور انگریزی اپنے والد بزرگوار حضرت مولانا صابر اکبرآبادی سے پڑھی۔ خاندان میں بیشتر اصحاب شاعر اور ادیب گذرے ہیں اور بعض اب بھی ہیں۔ اسی بنا پر شعر و سخن کا ذوق مجھے ابتدا ہی سے ملا۔

کیا لکھوں وصفِ قدِ دلجوئے ختم المرسلین
مدح سے باہر ہے اک اک موئے ختم المرسلین

بھول کر دشمن کے حق میں بھی دعائے بد نہ کی
واہ کیا تھی نیک طینت خوئے ختم المرسلین

سجدہ گاہِ اہلِ دیں ہے معبدِ اہلِ صفا
طاقِ محرابِ صنم ابروئے ختم المرسلین

بال بیکا کر سکا کوئی نہ پھر ضرار کا
مل گیا تھا بھید سے ان کو موئے ختم المرسلین

نعتِ کونین بھی ہے ہیچ اس کے سامنے
ہاتھ گر آجائے خاکِ کوئے ختم المرسلین

ہے یہ ارماں چل کے شاہیں اب مدینہ میں رہیں
بن کے دربانِ درِ دلجوئے ختم المرسلین

شاہین

قطب الدین کٹھاروی

۳ اپریل ۱۹۳۳ء کو میں نے پہلی بار بمقام کٹھا ر سانس لی۔ آبائی وطن آرہ (بہار) ہے ابتدائی تعلیم ایک چھوٹے سے مدرسے میں پائی سنہ ۱۹۴۲ء میں ایم۔ اکیڈمی میں داخل کردیا گیا ۱۹۴۶ء میں درجہ دہم میں ریاضی میں فیل ہوگیا اور ایک سال برباد ہوگیا سنہ ۱۹۴۷ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے میٹرک کیا اسی سال بھارت سے پاکستان چلا آیا۔ اور سرسید رتانھ کالج دیتا چیوڑ نیا آئی۔ کامرس میں داخلہ لیا مگر راستے میں میری تقدیر۔

سنہ ۱۹۵۱ء میں COM.ARITHMETTC میں فیل ہوگیا اور اب دوبارہ ڈھاکہ یونیورسٹی کی نوازشوں کا گن گاتے ہوئے APPEAR ہونے کی تیاریاں کررہا ہوں" اسکول کے دور میں رسالہ پڑھنا میرا خاص مشغلہ تھا اور اسی مشغلہ نے میدان ادب میں لا ڈالا اور ادب سے دلچسپی ہوگئی۔ میں افسانے زیادہ لکھتا ہوں۔ اور نظمیں گاہے گاہے کہتا ہوں مگر نہ جانے کیوں میں خود کو ادیب تصور نہیں کرتا میرا سب سے پہلا افسانہ ماہنامہ "ہمدرد" الہ آباد میں ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا اور اب بھی گاہے گاہے چھپتا رہتا ہوں اب تک مجھ پر "غم جاناں" کی نگاہ کرم نہیں پڑی ہے ہاں! غم دوراں اپنی خشمگیں آنکھوں سے مجھے گھورتا رہتا ہے نہ جانے "غم دوراں" کی آنکھیں کب پھوٹیں گی۔ میں امن عالم کو ہر مذہب کا سرمایہ سمجھتا ہوں اور یہی بیش بہا سرمایہ میری نظموں اور غزلوں میں متحرک ہے۔

انتخاب :-

جشنِ فصلِ گُل ہے مگر — گلستاں سرتاسر تاراج
کون بتائے اہلِ دل کو — کب بدلیں گے رسم و رواج
مسلی کلیاں دل جسٹل کر — چھین نہ لیں گلچیں کا تاج

غزل

درد و غم نے گھیرا ہے — ہر طرف اندھیرا ہے

ہر خوشی ہوئی رخصت — دل میں غم کا ڈیرا ہے
فصل گل ہے افسردہ — اب خزاں کا پھیرا ہے
شاخ ماہ و انجم پر — ابر کا بسیرا ہے
کالی رات میں پنہاں — اک حسین سویرا ہے
دور عیش کا شاہین
اُڑنے کو پھریرا ہے

نظم

ہے سیل اشک و خوں رواں
فضائیں ہیں دھواں دھواں
ہوا بھی ہے شرر فشاں
رباب حسن و عشق کا
ابھی نہ چھیڑ مطربہ

کدورتیں ہیں شادماں
عداوتیں ہیں حکمراں
محبتیں ہیں بے نشاں
رباب حسن و عشق کا
ابھی نہ چھیڑ مطربہ

ہر آنکھ آج خوں چکاں
ہر ایک لب پہ ہے فغاں
ہر ایک دل ہے نوحہ خواں
رباب حسن و عشق کا
ابھی نہ چھیڑ مطربہ

نہ پھول کی کہانیاں
نہ بلبلوں کی داستاں
نہ شاخ گل نہ آشیاں
رباب حسن و عشق کا
ابھی نہ چھیڑ مطربہ

نظر نظر ہے بدگماں
نفس نفس ہے بیکراں
ہے سعی امن رائیگاں
رباب حسن و عشق کا
ابھی نہ چھیڑ مطربہ

شبنم
مرزا عظیم احمد بیگ چغتائی

۱۳ر دسمبر ۱۹۲۳ء کو شاہجہانپور (یو۔پی) کا ایک مغل خاندان جس حادثہ سے دوچار ہوا وہ میری تشریف آوری تھی۔ میرا نام مرزا عظیم احمد بیگ چغتائی رکھا گیا۔ میرے جدِ امجد آغا مرزا غلام محمد بیگ دورِ شاہجہانی میں نواب بہادر خان کے ہمراہ غزنی سے تشریف لائے تھے اور مستقل طور پر شاہجہانپور میں آباد ہو گئے تھے۔ میرے والد مرزا اظہر احمد بیگ چغتائی تاجر ہونے کے باوجود اردو ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ وفات کے بعد ان کی لائبریری سے ان کے شاعر ہونے کا ثبوت بھی برآمد ہوا۔ مرحوم نے منظر عام سے دور اپنی شاعرانہ شخصیت کو اپنے میں دفن رکھا۔ وہ خرد تخلص کرتے تھے اور اساتذہ کے قدیم رنگ میں شعر کہتے تھے۔

میرے آباؤاجداد صاحبِ سیف تھے مگر میں صاحبِ قلم ہوں۔ وہ نوکِ شمشیر سے عقدے حل کیا کرتے تھے اور میں نوکِ قلم سے دلوں کو چیر کر رازہائے سربستہ کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں بچپن ہی سے شعر و ادب کا دلدادہ رہا ہوں۔ غالباً ۱۹۳۸ء میں میں نے اسرار احمد تبسم کی معیت میں شاہجہانپور سے ایک ماہنامہ "ترقی" کا اجرا کیا تھا مگر کچھ ہی ماہ بعد وہ دوستوں کی ناواقت مزاجی کا شکار ہو گیا۔

۱۹۴۳ء میں جب میں (بریلی کالج میں) بی کام کا طالب علم تھا حضرت رسا بریلوی کی رہنمائی اور اعتبار الملک حضرت قبلہ دل شاہجہانپوری کی سرپرستی میں ماہنامہ "شبنم" کا اجرا کیا۔ بی کام کرنے کے بعد جب میں واپس شاہجہانپور آیا تو مجبوراً پرچہ بند کرنا پڑا۔

اس سلسلہ میں اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ میں نے اعتبار الملک حضرت قبلہ دل شاہجہانپوری مدظلہ کے حضور میں زانوئے تلمذ طے کیا۔ اور میری تمام تر شاعرانہ صلاحیتیں ان کی مشفقانہ رہنمائی کے زیر سایہ پروان چڑھی ہیں۔ دل شاہجہانپوری جو اپنے وقت کے مجتہد مانے گئے ہیں۔ جنہوں نے لکھنؤ اور دہلی کی تفریق کے خلاف اعلان بغاوت کیا۔ اور امیرِ سخن حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ رشید ہونے ہوئے بھی دہلی اسکول

کے رنگوں سے شعر و ادب کے خاکوں میں رنگ بھرا۔ وہ پہلے شاعر ہیں جن کا کلام میری نظر میں "تقدیس فن" کا لازوال شاہکار ہے۔

میں غزل کو اردو شاعری کی لازوال صنف سمجھتا ہوں جتنی ہمہ گیری اور آفاقیت غزل میں ہے دنیا کی کسی صنف شاعری میں نہیں۔ دنیا کے کسی ادب میں نہیں۔ جغرافیہ، تاریخ، معاشیات اور سیاسیات رفتار وقت کی رو میں بہنے پر مجبور رہیں اور ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں مگر انسانی احساسات اور جذبات تہذیب و تمدن کی تبدیلی سے قطع نظر اقریب قریب ہمیشہ یکساں رہتے ہیں۔ میرے ایک دوست کے بقول "اقبال مر سکتے ہیں مگر غالب نہیں مر سکتا" گو کہ میں ان کے الفاظ سے متفق نہیں ہوں مگر ان الفاظ میں جو روح کار فرما ہے اس سے مجھے قطعی اتفاق ہے،

لیکن اس اتفاق کے باوجود میں صرف غزل کا شاعر نہیں اور پاکستان آنے کے بعد تو میں نے غزلوں سے زیادہ نظمیں کہی ہیں۔ ماحول سے فرار کو میں جائز نہیں سمجھتا۔ میں شاعری "شان پیغمبری" کا بھی قائل ہوں لیکن میری رائے ہے کہ شاعر مدبر نہیں ہو سکتا۔ اور مدبر افسانہ نگار نہیں ہو سکتا۔ ایک فرد ایک وقت میں صرف شاعر، صرف مدبر، صرف ماہر معاشیات، صرف صحافی یا صرف ادیب ہو سکتا ہے۔

میں سیاسی شاعر نہیں ہوں مگر میں نے حالات حاضرہ سے متاثر ہو کر بیشتر نظمیں کہی ہیں میں معاشرے کی خامیوں کو تمام تر قومی ملکی اور سیاسی خامیوں کی وجہ تسمیہ سمجھتا ہوں۔ "بنت عصر" "ابلیس کا پیام اپنے فرزندوں کے نام" "حالات" "اسکیچ" "درویش" "ایک خط" اور "وہ بلندی کہ جہاں" وغیرہ میری اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔

میری خیالی محبوبہ میری تمام غزلوں اور رومانی نظموں میں نمایاں ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میری محبوبہ کبھی انسانی شکل میں میرے سامنے نہیں آئی۔ مجھے یقین ہے کہ ۱۹۵۰ء کا آخر حصہ میری زندگی کا ایک ایسا موڑ ہے جہاں مجھے اور میری شاعری کو ایک عظیم حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ اول آخر ۱۹۵۰ء سے اب تک میری تمام عشقیہ شاعری میں ایک بے دلی، ایک شکستہ پائی اور ایک شدید احساس ناکامی نمایاں ہے۔

شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری، طنز نگاری اور مقالہ نویسی بھی میرے محبوب ادبی مشاغل ہیں مگر بقول اسرار احمد "شبنم پہلے شاعر ہے پھر افسانہ نگار" اور پھر نا قد"۔ میرے ہندوستانی کلام کا انتخاب "ستاروں کے کنول" اور پاکستانی کلام کا مجموعہ

"اشکوں کے چراغ" قریب قریب مرتب ہو چکے ہیں۔ "ناہید" میرا پہلا ناول ہے جو مستقبل قریب میں شائع ہونے والا ہے اور افسانوں کا ایک مجموعہ "جھوٹ نہ سچ" زیرِ ترتیب ہے۔ اگر عمر نے وفا کی تو غالباً میرے طنزیہ مضامین کا ایک مجموعہ "گستاخی معاف" بھی اس سال کے آخر تک منظرِ عام پر آجائے گا۔

غزل میں اجتہاد اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس میں کچھ "نئی باتیں" کہی جائیں۔ "نئی باتوں" سے میری مراد جذباتِ انسانی کے نئے تجربے ہیں۔ اُردو ادب میں روایتی مواد زیادہ ہے۔ مگر میں شعر کہتے وقت اپنے اس اصول کو پیشِ نظر رکھتا ہوں۔

اس سلسلے میں اپنی غزلوں کے چند "طبع زاد" اشعار پیش کر رہا ہوں۔

ستارہ ٹوٹ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا شبنم — مجھے کرنا پڑا اظہارِ الفت پھر نئے سر سے

جتنا بھی دور کر دیا رفتارِ وقت نے — وہ آگئے کچھ اور مری زندگی کے پاس

پھر انگڑائی لیتا ہے احساسِ ماضی پھر آباد ہوتی ہے بزمِ تصور

وہ مخمورِ مطرب نے بربط اٹھایا وہ کمسن حسینہ نے پائل سنبھالی

مگر اس دل سی کبھی آگ کا طوفان اٹھا — ہاتھ میں آگیا اک شوخ کا دامن اکثر

"کیا خاص امتیاز ہے میرے شباب میں" — گھبرا کے لکھ دیا یہ کسی نے جواب میں

یوں پس خواب اٹھا ہی کوئی آنکھیں ملتا — جس طرح جھیل کی آغوش میں کھلتا ہو کنول

جیسے مرمر کی سلوں پہ ہے رنگیں کا بہاؤ — تم کو اظہارِ محبت کی قسم پھر سے شرماؤ

میں نے واپس تو لیا لفظِ "محبت" لیکن — سوچتا ہوں کہ مری بھول کو تم بھول نہ جاؤ

جشنِ الفت ہے ترے ہاتھ کے آئینے میں

دیکھ تقدیر کی دو شوخ لکیروں کا ملاؤ

میری نفرت "سچا پیار" — تیری محبت "پاک جلال"

ہستی کی تفسیر یہ ہیں — پھولوں کے بھیگے آنچل

پھول سے عارضِ رنگیں کا تقابل نہ کرو

مجھ سے بدظن تمھیں کر دے نہ کہیں میری ادا سے

ان کی پلکوں پہ لرزتا ہوا آنسو شبنم — میری قسمت کا ستارا ہی کہیں ٹوٹ نہ جائے

اگر "حقوقِ وفا" عمر بھر رہیں محفوظ — ترا فراقِ مسلسل مجھے گوارا ہے

جو ستاروں کو سمجھتا ہے زمانہ "تقدیر"
وہ ستارے ترے قدموں کے نشاں ہوتے ہیں

مانا کہ "اشک و آہ" مرے واسطے نہیں
لیکن تمہیں کسی سے محبت ضرور ہے

کسی کی شمع شبستاں ضرور گل ہوگی
ترے جمال کی آرائش نہیں بے سود

اس انقلاب پہ ہنسنا گناہ ہے لیکن
مرے خیال میں رونا بھی بدمذاقی ہے

ہے مشتاق تک آ کے بھی باقی ہے
تجھے کہنے کوئی تو عمر حسینہ تو نہیں

حسن کی جدتِ جلوہ فگنی بے پیکار
کہ ابھی عشق کا انداز روایاتی ہے

جشنِ فطرت مرا ہستی پہ ہے نازاں شبنم
محلِ نور میں مرے اشکوں سے جلاتے ہیں

اردو غزل میں ترقی یافتہ عناصر کو جس پیمانے پر
علامہ سیماب اکبرآبادی نے شامل فرمایا تھا

سدرۃ المنتہیٰ

کا ہر شعر اس کا ثبوت پیش کرتا ہے

علامہ کی غزلوں کا دوسرا دیوان جسے مکتبۂ قصر الادب آگرہ کی تمام
مطبوعات پر امتیاز حاصل ہے قیمت مجلد للعہ

مکتبۂ چہارم کراچی

شرافت علی خاں رامپوری

میرا نام شرافت علی خاں ہے اور تخلص شرافت۔ ۲۰ فروری ۱۹۳۲ء کو بمقام ریاست رامپور۔ یو۔پی۔ میں پیدا ہوا۔ میں صفدر علی خاں صفدر رامپوری مدظلہٗ کا خلفِ اکبر ہوں مجھے فخر ہے کہ میں نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی اور پروان چڑھا جہاں شعر و شاعری کا ہر وقت چرچا رہتا تھا۔ والد صاحب کے گھر روزانہ شاگردوں کا مجمع۔ رہتا علمی و ادبی مباحثے ہوتے رہتے تھے۔ غرض کہ اگر میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ شاعری میرا اوڑھنا بچھونا رہی اور ہے۔ اب بھی کراچی آنے کے بعد فاؤلر لائن میں انجمن معمارانِ ادب کے زیرِ اہتمام ہر ہفتے طرحی و غیر طرحی مشاعرے ہوتے رہتے ہیں۔ والد صاحب کی مصاحبت سے میں نے بطورِ خاص اکتسابِ فیض کیا ہے۔ خیر میرا تو اصلی اولاد ہونے کی حیثیت سے یہ حق بھی تھا میرے علاوہ اکثر حضرات معنوی اولاد کی حیثیت سے ان سے اصلاحِ سخن لیتے ہیں۔ اور ہر قسم کا استفادہ کرتے ہیں اردو فارسی کتابیں میں نے کماحقہٗ مطالعہ کیا ہے اور اب انگریزی بھی پڑھ رہا ہوں۔ پندرہ سال کی عمر سے شعر کہتا ہوں نمونتاً چند شعر ملاحظہ فرمایئے۔

غمِ دو جہاں سے بڑھ کر ترا غم ہے مجھ کو پیارا — مرا حاصلِ محبت مری زیست کا سہارا
تری یاد ایک طوفاں ترا قرب ایک ساحل — یہی زندگی تلاطم یہی زندگی کنارا
یہ ادائے دل ستانی یہ نگاہِ قدر دانی — یہ صدا کہاں سے آئی مجھے کس نے یہ پکارا

رہے کیوں تشنۂ توحید مستانہ محمد کا — مئے وحدت سے ہے لبریز پیمانہ محمد کا
دمِ آخر مری آنکھیں لگی ہوں جانبِ طیبہ — الٰہی خاتمہ بالخیر ہو صدقہ محمد کا

نہ سمجھنے کے ہیں عنوان نہ سمجھانے کے — کتنے بے معنی ہیں جملے مرے افسانے کے

اب تمنائے مرگ باقی ہے — کر چکیں تیرا انتظار آنکھیں

ہے تیری برقِ نظر کا مشتاق — کیا کلیجہ ہے تماشائی کا
تجھی کو دیکھا ہے جلوہ نما وہاں میں نے — نظر سے کام لیا ہے جہاں جہاں میں نے

شفیق اللہ خاں کوٹی

میں ۲۴ راگست سنہ ۱۹۰۲ء کو بمقام کوٹ ضلع فتحپور (یوپی) میں پیدا ہوا۔ سنہ ۱۹۱۲ء کے بعد مختلف اسکولوں اور شہروں میں تعلیم حاصل کی۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ ٹکنیکل سکول لکھنؤ میں داخل ہو گیا۔ تین سال بعد ڈپلوما لیکر محکمۂ زراعت کے انجینیرنگ لائن میں ملازمت کر لی۔ اسی لائن میں ترقی کر کے اب محکمۂ سپلائی اینڈ ڈولپمینٹ لاہور میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر آف انسپکشن ہوں۔ شاعری کا ذوق مجھے لکھنؤ سے پیدا ہوا لیکن اس ذوق کو بالوں کبھی اس بیماری کو میں نے شدت اختیار نہیں کرنے دی۔ اور صرف تفریحی مشغلہ تک محدود رکھا۔ مجھے علامہ سیماب اکبرآبادی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

میری اپنی غزلیں اور نظمیں "آجکل دہلی" "شاعر آگرہ" "زمانہ کانپور" "عالمگیر لاہور" اور دوسرے معیاری رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ گو اب چھپنے چھپانے کا بھی اشتیاق نہیں رہا۔ عزیزی میاں مظہر کے اصرار سے مجبور ہو کر اپنا مختصر تذکرہ اور نمونۂ کلام پیش کر رہا ہوں

دنیا کا کبھی غم ہے مجھے عقبیٰ کا کبھی غم ہے
سب کچھ ہے مگر پھر بھی تری یاد سے کم ہے

پروانۂ کعبہ تک جائے جو اب بھی تو ستم ہے
جو شیخ کلیسا ہے وہی شیخ حرم ہے

ہے ختم کہانی مگر آنکھوں میں تو دم ہے
صورت وہ اگر اب بھی دکھا جائیں کرم ہو

یہ ہوش و وفا اور یہ احساس محبت
اے تنگیٔ شوق محبت ابھی کم ہے!

مل جائے جہاں تو وہی گھر گھر ہے ہمارا
ہستی ہے تو ہستی ہے عدم ہے تو عدم ہے

شاید ہے پرستش کی یہی آخری منزل
اب دیر مرے پیش نظر ہے نہ حرم ہے

مجھ کو ہو کس امید پہ احساس محبت
قربان تغافل ستم ہے نہ کرم ہے

ساقی ترے الطاف کا ممنون ہوں لیکن
پیمانے میں جو کچھ ہے مرے ظرف سے کم ہے

سرمایۂ حیات رہے وہ تمام عمر
گزرے تھے چند لمحے جو اس کے خیال میں

مجھکو نہیں مجاز و حقیقت میں امتیاز
ہیں دونو عالم ایک تمہارے خیال میں

لوگ کہتے ہیں کہ گلشن میں بہار آئی ہے
میں یہ کہتا ہوں کہ یہ بھی تری انگڑائی ہے

میرے پہلو سے مرے دل کو اٹھا لائی ہے
تیری انگڑائی بھی ظالم تری انگڑائی ہے

شکوۂ جور مجھے باقی بیداد نہیں
ہے تو مجبور اک آواز ہے فریاد نہیں

ایک میں ہوں کہ وظیفہ ہے مجھے نام ان کا
ایک وہ ہیں کہ انھیں نام مرا یاد نہیں

غیر معلوم بڑھا تھا مری جانب اک ہاتھ
کیا ہوئے جیب و گریباں یہ مجھے یاد نہیں

یہ نقش جو رہ الفت میں پائے جاتے ہیں
قدم ہی سے نہیں سر سے بنائے جاتے ہیں

جو کر گئے ہیں محبت کا اک جہاں ویراں
کہیں وہ سانحے دل سے بھلائے جاتے ہیں

جگر کبھی خون ہوا دل کبھی ہو چکا پانی
مگر ابھی وہ ہمیں آزمائے جاتے ہیں

تمنا ہی سے بچ جائے گی زندگانی
اگر ہو گئی آپ کی مہربانی

دیا ساتھ پیری نے میری لحد تک
مرے کام آئی نہ میری جوانی

تری مست آنکھیں وہ آنکھیں ہیں جن پر
تصدق ہے جام مئے ارغوانی !

سنا ہے یہ جب سے کہ وہ آرہے ہیں
ہر اک شے میں پاتا ہوں اک زندگانی

مٹائے سے مٹتا نہیں نقش قسمت
بنائے سے بنتی نہیں زندگانی

یہ جذب و کشش اے جوش طلب ناکام ہے اور ناکام نہیں
لب پہ ہے تبسم ان کے مگر آنکھوں میں کوئی پیغام نہیں
یہ بحر محبت ہے اس میں جو ڈوب گیا وہ پار ہوا
برباد جو ہے برباد نہیں ناکام جو ہے ناکام نہیں
اک یاد کسی کی ہے جس کو سینے سے لگائے بیٹھا ہوں
دنیا کا مجھے کچھ ہوش نہیں عقبیٰ سے مجھے کچھ کام نہیں

شرابی شرابی گلابی گلابی
ان آنکھوں سے پی کر نہ کیوں جھوم جائیں

دھڑکتے دلوں نے کیا خیر مقدم
نگاہوں نے لیں بڑھ کے ان کی بلائیں

ان آنکھوں سے پینے کو جی چاہتا ہے
ابھی اور جینے کو جی چاہتا ہے

سراپا جہنم ہے یہ زندگانی
مگر پھر بھی جینے کو جی چاہتا ہے

بہاروں سے کہہ دو ذرا مسکرائیں
گریباں سینے کو جی چاہتا ہے

یہ کشتیٔ عمرِ رواں اور یہ طوفاں
ڈبو دوں سفینے کو جی چاہتا ہے

شفیق ان کے کوچے میں کیا جانے کیا ہو
وہیں مر کے جینے کو جی چاہتا ہے

ہم غم سے قلب و روح کو ویراں کئے ہوئے
صحرا نشیں ہیں خونِ گلستاں کئے ہوئے

کس سے کہوں کہ میرا نشیمن اجڑ گیا
کس کو نہیں یہ رنج پریشاں کئے ہوئے

جلوہ طلب نگاہ کو دید و بشارتیں
وہ آرہے ہیں طور کا ساماں کئے ہوئے

سرِ مژگاں جو دو ستارے ہیں
زندگی کے یہی سہارے ہیں

مجھے اوج دے کے جلیل کر مجھے یوں نہ خوار و ذلیل کر
تری آبرو مری آبرو مری آبرو تری آبرو

ہم نے ایسے دوست لگا ہوں ہی سے کھائے ہیں فریب
اپنا کہیئے کسے اور کس کو پرایا کہیئے !!

تھا تری راہ میں کعبہ کبھی صنم خانہ بھی
ہم ادھر سے کبھی گذرے نہ ادھر سے گذرے

معجزہ کوئی تو وحشت میں نمایاں ہو جائے !
جیب میں ہاتھ رہیں چاک گریباں ہو جائے

میں کسی پھول کو چھو لوں تو بنے سوکھ کے خار
تم جو کانٹے بھی اٹھا لو تو گلستاں ہو جائے

پہلے جاں دینے کی رسوائی سے گھبراتے تھے
اب جیئے جانے کے الزام سے ڈر لگتا ہے

تم مسکرا دیئے تو چمن مسکرا دیا۔
دیکھا ہے میں نے عالمِ دنیائے رنگ و بو

یہ عشقِ نامراد سلامت رہا اگر
آؤ گا بیخودی پہ پشیماں ہزار بار

یہ کبھی فریب ہو نہ کہیں شوقِ دیار کا
ان انکھڑیوں میں کیف بھی ہے اور پیام بھی

پڑ جاتی ہے جان جس سے افسانہ الفت میں
وہ ذکر ہمارا ہے وہ نام تمہارا ہے

میرے ہی مانگنے کا ہے یہ نقص غالباً
تیری نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

عشق میں کھائی تھی ٹھوکر کھا گئے !
ہم سزا اپنے کئے کی پا گئے !!

مبارک شمیم شاہجہانپوری

۱۳ مارچ ۱۹۲۳ء کو بمقام شاہ جہاں پور پیدا ہوا۔ جب کچھ ہوش آیا تو خود کو متضاد ماحول میں گھرا ہوا دیکھ کر عجیب الجھن محسوس کی۔ ددھیال میں ۹۵ فیصدی اعزہ جاہل اَن پڑھ اور عسکری جذبہ سے مغلوب تھے۔ برخلاف اس کے ننھیال میں ۹۵ فیصدی تعلیم یافتہ، مہذب اور مرنجان مرنج دکھائی دئے۔ میرے والد محترم (جناب عبدالعلی خاں صاحب) اپنے گھر والوں کی مخالفتوں، خفگیوں اور دھمکیوں کے باوجود جائز بغاوت پر قائم رہے۔ راہ میں آئی ہوئی مشکلات ان کے آہنی ارادوں کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ خاندانی رواج کے خلاف تعلیم حاصل کی۔ قانونی پیشہ کو ذریعہ معاش بنایا اور آج پچھلے اکیاون سال سے وہ اب تک کامیاب قانون داں کی حیثیت سے پریکٹس کر رہے ہیں۔
چھہتر سال کی عمر کے باوجود اُن میں وہی عزم اور وہی پختہ ارادے پائے جاتے ہیں، جو اُن کی کامیاب و کامران زندگی کے ذمہ دار ہیں۔

قصبہ کانٹ کے قاضی نیاز رسول صاحب سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مجھے اسکول میں داخل کر دیا گیا مگر چند بدذوق طالب علموں سے متاثر ہوتے ہوئے دیکھ کر والد صاحب قبلہ نے (اٹاوہ) بھیج دیا۔ یہ میرے لئے ایک نئی زندگی تھی اور عجیب بھی۔ پہلے میرے لئے میرا گھر ہی سب کچھ تھا مگر اب ہر تبدیلی کو ذہن نے یکے بعد دیگرے قبول کرنا شروع کر دیا اور نتیجتاً میری عصبیت اور تنگ نظری دور ہوگئی۔ "اٹاوہ" میں ایک طالب علم کے لئے ہوسٹل کے باہر کی ہوائیں کس قدر مسموم اور فضائیں کتنی تاریک اور بھیانک ہوتی تھیں۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس ماحول سے واقف ہیں۔ مگر میں نے ان ہواؤں میں مہک اور مہک میں انجانی سی کشش محسوس کی۔ بھیانک تاریکیوں سے روشنی کی ایک باریک کرن پھوٹی اور بلا واسطہ میرے معصوم دل میں اتر گئی۔ میں گھبرا گیا اور سب سے پہلی بار میں نے کہا۔

مدد مدد اے جنونِ فطرت بھڑک اٹھا ہے جگر میں شعلہ
یہ اشک رسوا کریں نہ مجھکو جو میری آنکھوں میں آ گئے ہیں

وہ اشک رسوا کئے بغیر نہ رہے اور رسوائی نے ان رہ گزاروں کو مجھ سے ہمیشہ

کے لئے چھوڑ دیا۔ شاہجہانپور واپس آگیا اور یہاں آ کر پھر اسی ماحول سے واسطہ پڑا مگر میری بےچین طبیعت کو قرار نہ تھا کچھ عرصہ کے بعد علی گڑھ چلا گیا مگر علی گڑھ کی زندگی راس نہ آئی۔ ملیریائی فضا سے دم گھٹنے لگا۔ دوسرے ہی سال لکھنؤ جا کر داخلہ لے لیا اور وہیں سے بی اے کیا۔ ایک سال ایم اے۔ ایل ایل بی میں گزارنے کے بعد بڑے بھائی کی اچانک موت کی بنا پر لکھنؤ سے مستقل طور پر گھر واپس آگیا۔ لکھنؤ کے دوران قیام میں ذوق شعری بڑھتا رہا اور شاہجہانپور نے اس میں مزید اضافہ کیا۔ فسادات میری حیات تازہ کا پیغام لیکر آئے اور میں ۵ / مئی سنہ ۱۹۵۰ء کو پاکستان کے لئے روانہ ہو گیا۔ یہ موڑ ایک انوکھا موڑ ہے جہاں قدم قدم پر مایوسیوں اور نامرادیوں سے مقابلہ کر رہا ہوں۔ ذیل میں چند اشعار پیش کرتا ہوں جو میری موجودہ حالت کے ترجمان ہیں۔

تمناؤں کو میری یاس پیہم نے مٹا ڈالا — شمیم اب تو اس میں جینے کی پھر کیونکر تمنا ہو
ہائے مجبوریاں محبت کی — اشک آنکھ سے مگر بہا نہ سکے
زندگی بھر میں حوادث سے رہا ہوں دوچار — میں نے دیکھے ہیں بہت ایسے تلاطم پہلے

یہ تیرہ فضائیں، تند ہوا، طوفان ہے کہ بڑھتا آتا ہے
آغاز سے وحشت ہوتی ہے انجام سے جی گھبراتا ہے
جب دل کو تسلی دینے سے غم اور سوا ہو جاتا ہے
گزرا تھا کبھی اس عالم سے ہاں یاد مجھے کچھ آتا ہے
کیا صبح بہاراں سے کھیلے کیا محفل انجم میں بہلے
وہ دل کہ اذیت سہہ سہہ کر مانوس الم ہو جاتا ہے

سوز و تپش غم و الم جزو حیات ہو گئے — جیسے مرے نصیب میں شام تو ہے سحر نہیں
یاد وہ دن ہیں دل کبھی شعلوں میں تھا گھرا ہوا — گرم نفس ہے آج بھی سینہ میں گو شرر نہیں
عشق تکلفات کی حد سے گزر گیا شمیم — اب وہ کسی کے واسطے شورش چشم تر نہیں

کہاں نصیب ابھی مجھ کو گریہ آزاد — ابھی تو نالہ بہ پابندی شبانہ ہے
اسی کے نام سے منسوب مرا فسانہ ہے — وہ کافرہ کہ جو معبودۂ زمانہ ہے
غم حیات مجھے دلنشیں بنانا ہے — یہ شغل بادہ و مینا تو اک بہانہ ہے
سمجھ رہا ہوں میں انجام عاشقی لیکن — تری تلاش بھی جینے کا اک بہانہ ہے

شمیم
مظفر حسین

پیدائش سنہ ۱۹۱۳ء کلکتہ ۔ آغازِ شاعری سنہ ۱۹۲۷ء

اب کہاں وہ ولولے وہ شوق وہ جوشِ جنوں
طاقتِ پرواز خود پرواز ہو کر رہ گئی

گو بھلایا لاکھ میں نے پھر بھی یاد آ ہی گیا
کس قدر آسان تجھکو بھولنا سمجھا تھا میں

سراپا عقل بن کر جو تجھے برباد کرتے ہیں
میں دل بن کر بھری محفل میں جاؤں تو کیا ہوگا

شمیم
محمد ابراہیم اکبر آبادی

مجھے محمد ابراہیم کہتے ہیں والد کا اسم گرامی چودھری شیخ نبی اللہ ہے جو شہر اکبرآباد کے ایک قصبہ اعتماد پور کے رہنے والے تھے اور اپنا وطن و مسکن بھی وہیں تھا لیکن چونکہ طبیعت میں آزادی اور فکر میں جولانی تھی لہٰذا سیلانی رہا۔ اور سیر و تفریح کا عادی ۔

"ایک جا رہتے نہیں عاشقِ بدنام کہیں
دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں"

گھر کی آسودگی نے کسی کام میں مصروف نہ ہونے دیا البتہ شاعری جزوِ فطرت بنی ہوئی تھی جہاں جاتا مشاعروں میں شرکت کرتا حتّٰی کہ بمبئی اور حیدرآباد (دکن) کی خاص صحبتوں میں شرکت اور غزل خوانی کا موقع ملا اور دادِ سخن حاصل کی ۔

شرفِ شاگردی حضرت مولانا فتاح بریلوی صاحب قبلہ مدظلہٗ سے حاصل رہا جو بجائے خود ایک قادر الکلام اور پُرگو شاعر ہونے کے سبب کامل اساتذہ میں شمار کئے جاتے ہیں ان کی اصلاح اور مشورہ کا یہ اثر ہوا کہ اکثر غزلیں برجستہ اور غیر اصلاحی مشاعروں میں پڑھیں اور قابلِ قدر نیز حوصلہ افزا داد پائی اس دوران میں فی البدیہہ غزلیات کا

امتحان بھی دینا پڑا اور اس میں کامیاب بھی رہا۔

شدہ شدہ اپنے اصلی وطن سے بغرض تفریح انبالہ (حدود پنجاب) میں آیا یہاں علاوہ ذوقِ شعری کے کاروبارِ دنیاوی میں منہمک ہونا پڑا لیکن مشغلہ فطری جو رفیقِ ازلی تھا یہاں بھی کارفرما رہا۔ ادبی محفلوں میں طرحی و غیر طرحی غزلیات اہلِ ذوق کے پیش نظر ہوتی رہیں۔ اور ہمت افزا داد پائی۔ اسی دوران میں شہر انبالہ سے اکثر بیشتر لاہور بھی جانے کا اتفاق ہوا جہاں متعدد مشاعروں میں شریک ہوا۔

یہاں تک کہ زمانہ میں انقلاب آیا دنیا اِدھر کی اُدھر ہو گئی۔ معرکہ قتال گرم ہوا زمین "خونِ بے گناہاں" سے لالہ زار بنی تو وطن مالوف کے ساتھ قیام گاہ انبالہ کو بھی خیرباد کہنا پڑا۔ اور بود و باش و فکر معاش کے لئے مختلف مقامات کی خاک چھاننے کے بعد میاں چنوں (ضلع ملتان) میں فروکش ہو کر کاروبار کرنے اور خاموش زندگی گذارنے کا عہد کر چکا تھا مگر مذاقِ سلیم نے میری گمنام زندگی کو ابھارا اور عالم نامرو کھنو دمیں لا کر استادہ کر دیا مجکو ہر صنفِ سخن میں کچھ نہ کچھ ضرور دخل ہے رباعی، قطعہ، نظم بھی ضرورتاً کہہ لیتا ہوں۔

نمونہ کلام۔

وہیں مجبور سجدوں پر دلِ دیوانہ ہوتا ہے
نمایاں تو جہاں لے جلوۂ جانانہ ہوتا ہے

وہ سنتے ہیں مگر رودادِ غم دل سے نہیں سنتے
کرم ہوتا ہے جو مجھ پر وہ بے دردانہ ہوتا ہے

بن پئے ہی بن چلا بیگانۂ ہوش و حواس
المدد اے چشمِ ساقی ہوش میں لانا مجھے

اے شبِ ہجر نہ کر صبحِ قیامت کو طلوع
خلوتِ خاص میں کیا کام ہے بیگانے کا

منقلب ہو گیا یکلخت نظامِ ہستی
تم نے عنوان جو بدلا مرے افسانے کا

وہ اُدھر آئینہ خانے میں سنورتے ہیں شمیم
دم اِدھر ٹوٹ رہا ہے کسی دیوانے کا

مخمور نگاہوں سے جس دم پُر کیف اشارے ہوتے ہیں
سرمست فضائیں ہوتی ہیں، رنگین نظارے ہوتے ہیں

پیمانِ وفا کا وہ منظر اب تک ہے میری نظروں میں
شرمائی نگاہوں سے کہنا ہم آج تمہارے ہوتے ہیں

بنی بیگانۂ عیش و مسرت زندگی اپنی
نظر کیا حسن پر ڈالی کہ دنیا لُٹ گئی اپنی

تبسم اب کہاں لب پر دلِ ناکامِ الفت سے
تصدق کر چکا ہوں اُن نگاہوں پر ہنسی اپنی

کسی کے حسن کی رعنائیوں کے دیکھ کر جلوے
نظر واپس نہ آئی تھی کہ دنیا لٹ گئی اپنی

قطعہ

کسی کی عصمت و عظمت کی آج خبر نہیں
کسی کی موت کا سامان ساتھ لائی ہے
تمہیں خبر ہے بہاروں سے کھیلنے والو
کہ کس بہار سے دنیا میں عید آئی ہے

شمیم

محمد یوسف

محمد یوسف شمیم خلف محمد ابراہیم نبیرہ حاجی قمر الدین صاحب قریشی وطن مالوف ریواڑی مقیم حال حیدرآباد سندھ ۔ عرصہ سے شعر کہتا ہوں طبیعت موزوں پائی ہے میرے بزرگان نہایت متمول اور شریف النفس متقی پرہیزگار مردوں میں شمار ہوتے ہیں ۔ میرا سنہ پیدائش ۱۹۲۲ء ہے ۔

نمونہ کلام

لطف جفا کی شکوہ گذاروں کو کیا خبر
یہ حال آپ شکر گذاروں سے پوچھیے
اس چشم فتنہ زا میں مروت نہ ڈھونڈیے
خنجر سے واسطہ ہے محبت نہ ڈھونڈیے
اپنے پرائے بدلے زمانہ بدل گیا
اس دور میں شمیم رفاقت نہ ڈھونڈیے
وابستگی ہے دل کو اسی لالہ زار سے
سینے کے داغ کم نہیں فصل بہار سے
جان بہار اپنا مشرب نہیں ہے یہ
کلیوں سے دوستی ہو رقابت ہو خار سے

کیا نازِ محبت ہے ان کا انداز تکلم کیا کہیے
چتون پہ ادائے خودداری ہونٹوں پہ تبسم کیا کہیے

غزل

ہم کو ان سے کیا غرض ہم تو تشنہ کام ہیں — جانے کن کے واسطے یہ چھلکتے جام ہیں
تو نہیں تو کیا ہوا کون سی کمی رہی !! — ہم ترے بغیر بھی تجھ سے ہم کلام ہیں
ہاتھ میں ہیں دھجیاں پاؤں میں ہیں آبلے — نام تو جنون ہے اور یہ اہتمام ہیں
میرا غم نہ چھین لیں حسرتیں نہ لوٹ لیں — مجھ سے دور ہی رہیں وہ جو شاد کام ہیں

صرف خار سے نہیں پھول سے بھی ہوشیار
آشیاں کی شکل کے اس چمن میں دام ہیں

غزل

ہو راہزن کی ہدایت کہ راہبر کے فریب — مری نگاہ نے کھائے نظر نظر کے فریب
یہ بتکدے یہ کلیسا یہ مسجدیں یہ حرم — یہ سب فریب ہیں اور ایک سنگِ در کے فریب
سمجھ رہے تھے کہ اشکوں سے ہوگا دل ہلکا — نہ جانے کتنے کہیں یہ بھی چشمِ تر کے فریب
یہ زندگی تو مسلسل ہے ایک غم کی رات — وہ رات کھائے ہیں جس نے سحر سحر کے فریب
انہی کا نام محبت انہی کا نام جنون — مری نگاہ کے دھوکے تری نظر کے فریب

قفس ہے وہ کہ جہاں بال و پر بھی ہیں معنی
یہ آسمان ہیں کیا حرف بال و پر کے فریب

اخبار نویسی سے ذمہ دارانہ زندگی کی ابتدا ہوئی ہمدم کے قائم مقام مدیر رہے روزنامہ اودھ اخبار کے مدیر اعلیٰ رہے۔ پھر اپنا ذاتی اخبار روزنامہ طوفان نکالا۔ اخبار نویسی کے بعد آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو کر لکھنؤ کے ریڈیو اسٹیشن پر رہے پھر پنچولی آرٹ پکچرس میں اسٹوری رائٹر کی حیثیت سے لاہور آگئے۔ لڑائی کے زمانے میں گورنمنٹ آف انڈیا نے یو پی کا سانگ پبلسٹی آفیسر مقرر کیا۔ اور محکمہ کے ختم ہونے کے بعد پھر پنچولی آرٹ پکچرس لاہور واپس آگئے۔ ۱۹۴۷ء کی اگست تک پنچولی پکچرس میں رہے۔ اور قیام پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہیں

شوقؔ — شیخ عبدالحمید ہوشیارپوری

نام عبدالحمید تخلص شوقؔ عمر تقریباً ۷۵ سال والد مرحوم کا نام شیخ وزیرالدین تھا مسکینؔ تخلص فرماتے تھے گویا شاعری مجھ کو ورثہ میں ملی۔ والد مرحوم ہوشیارپور (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ چنانچہ میری پیدائش بھی وہیں ہوئی۔ میرا تعلق پنجاب کے قانون گو شیخوں کی ذات سے ہے۔ ۱۹۲۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز فرسٹ ڈویژن سے کیا۔ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالحکیم بسملؔ ہوشیارپوری مشہور شاعر تھے۔ اور میں نے ابتدائی کلام مرحوم بھائی ہی کو دکھایا۔ میں کچھ عرصہ فیروزپور جھرکا دہلی کے اسلامیہ ہائی اسکول میں سکنڈ ماسٹر رہا پھر ۱۹۲۴ء میں محکمہ نمک میں انسپکٹر کی جگہ پر کام کرتا رہا۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۹ء تک ریاست حیدرآباد دکن (مرحوم) کی علمی و ادبی فضا میں سانس لیے اور مختلف اسکولوں میں بحیثیت ہیڈ ماسٹر اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ ۱۹۴۸ء کی "ہندو گردی" میں اورنگ آباد دکن میں ۳۰ دن تک حکومت ہند کا "مہمان" رہا۔ اب گوجرہ ضلع لائلپور میں مقیم ہوں اور ایم بی ہائی سکول میں سینئر انگلش ٹیچر ہوں۔ عربی، فارسی، انگریزی اور اردو پر خاصی قدرت حاصل ہے۔ علوم دینیہ اور صوم و صلوٰۃ سے خاص شغف ہے۔ کم سنی سے ہی سخن گوئی اور سخن فہمی کا چسکا لگ گیا جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں شروع میں تو اپنے بڑے بھائی (مرحوم) سے اصلاح لی لیکن بعد میں شاعر مشرق علامہ اقبال سے اصلاح سخن کا فیض حاصل کیا۔ علامہ اقبال کے نام میرا ایک منظوم خط دکن میں اب تک مشہور ہے۔ میری غزلیں اور ادبی، فلسفیانہ، تاریخی اور اصلاحی نظمیں بہت مقبول ہوئیں۔ سلاست اور پاکیزگی جذبات میرے کلام کی خصوصیات ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ مشاعروں کی شرکت اور سستی شہرت سے دور بھاگتا ہوں ہاں کبھی کبھی تو یہ لت بھی لگ گئی اور اس کا مجھے اعتراف ہے جامعہ عثمانیہ کا ۱۹۲۷ء کا مشہور مشاعرہ جس کے صدر علامہ سلیم پانی پتی تھے۔ اس میں میں بھی شریک تھا۔ میری نظم "کیا نام اسی کا نغمہ ہے" حاصل مشاعرہ قرار دی گئی۔ اسی طرح ایک اور مشاعرہ (جو انجمن ترقی اردو کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا) میں بھی میری نظم "عورت" حاصل مشاعرہ قرار دی گئی۔ اس وقت بھی دنیاوی افکار و مصائب کے باوجود

مشق سخن جاری ہے چنانچہ ایک طویل مسدس "شہر آشوب حیدرآباد دکن" زیر تصنیف ہے میری مشہور نظمیں جو قبول عام حاصل کر چکی ہیں ابھی تک صندوقوں میں بند ہیں اور میری تنگدستی اور سستی شہرت کا قائل نہ ہونا ان دُرِ شاہوار کی طباعت میں حائل ہے طبیعت کو اگر ناگوار نہ گزرے تو میں آپ کو بتلاؤں کہ میں نے کیا کیا دماغ سوزیاں کی ہیں میرا کلام مندرجہ ذیل مجموعوں کی صورت میں محفوظ ہے

(۱) شہر آشوب حیدرآباد دکن (زیر تصنیف) (۲) نامۂ شوق بنام علامہ اقبال (۳) کیا نام اسی کا نغمہ ہے (۴) سلام شوق بحضور سرور کائناتؐ (۵) حضرت عائشہ صدیقہؓ (۶) حضرت ابوبکرؓ کا قبول اسلام (۷) علیؓ کی شیفتگیٔ اسلام (۸) شاعر اور گلاب کا پھول (۹) عورت (۱۰) آپ بیتی (۱۱) محبت (۱۲) خواجہ محمود گاواں (۱۳) ٹیپو سلطان (۱۴) شام تنہائی (۱۵) میرا نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے۔ شاید اس میں آپ میری زندگی کی تصویر دیکھ سکیں۔

نمونۂ کلام

کسی کی چشم میگوں سے مرا مخمور ہو جانا
ابد تک بے نیاز بادۂ انگور ہو جانا

وہ پروانہ کا سوز عشق سے معمور ہو جانا
وہ جلنا شمع کا جل کر سراپا طور ہو جانا

بروز حشر ان کا خون ناحق سے مکر جانا
وہ میری خامشی عذر جفا منظور ہو جانا

مرا ان کی وفا سے ڈھونڈھنا امن قیامت تک
زمیں کا سخت ہو جانا فلک کا دور ہو جانا

کسی کا لن ترانی کہہ کے مجھ سے رخ چھپا لینا
مرے داغ تمنا کا چراغ طور ہو جانا

مرا ہر چند عذر اجتناب میکشی کرنا
اشارہ چشم ساقی کا مرا مجبور ہو جانا

کہاں ہے درد کہہ کر اُن کا دل پر ہاتھ رکھ لینا
مرا چھوٹا ٹھہرنا درد کا کافور ہو جانا

کسی کا رخ دکھا کر بے نیاز شوق بن جانا
مرا فرہاد و قیس عامری مشہور ہو جانا

زندگی

دیکھ چشم شوق رہئے بے حجاب زندگی
ہاں الٹ دے ہے اگر کوئی نقاب زندگی

ڈھونڈ گہرائی میں اس کی کیسے کیسے ہیں گہر
دیکھنے کو ہے مکدر گرچہ آب زندگی

ہر گل تر باغ میں دیتا ہے تجھکو یہ سبق — ہے ہر اک برگ خزاں دیدہ کتاب زندگی
"لالۂ صحرا" کو گر چشم بصیرت سے تو دیکھ — ریگ کے ذروں میں ہے جام شراب زندگی
سینکڑوں نغمے نکلنے کے لئے بے تاب ہیں — طالب زخمہ ہے بس تار رباب زندگی
ہستی مبہم زندگی میں ہے مدار کیف و کم — شرح باب زندگی صد اضطراب زندگی
کس نے دیکھا ہے نشاط زندگی کو عیش میں — کارزار زندگی ہے فتح باب زندگی
بے خودی میں اور خودی میں فرق اتنا ہے فقط — وہ شراب زندگی ہے یہ حجاب زندگی
دل وہی ہے جس میں ہو حسن و عمل کی آرزو — جان وہ جس میں ہو سوز و التہاب زندگی

حسرت و ارماں کی دنیا ہے فقط عمر عمل
شوق ایسی زندگی نقش بر آب زندگی

شہید

قربان حسین جہلمی

نام قربان حسین تخلص شہید۔ ساکن جہلم۔ والد صاحب کا نام مولوی غلام علی تاجر کتب جہلم۔ تاریخ پیدائش ۱ر اکتوبر ۱۹۱۸ء۔ حال ایس۔ ڈی۔ او۔ ایف۔ اینڈ۔ ایس۔ ایبٹ آباد
سید عبد المجید عدم۔ اور (صوبیدار) محبوب حسن آسی رڑکوی سے استفادہ کیا۔

نمونہ کلام۔

ہستی کا بار ہم نے بڑی دیر سہ لیا — اب تو نجات دیجئے ہستی کے بار سے
ہونے لگا ہے ان پہ محبت کا کچھ اثر — رہتے ہیں دور دور ذرا بے قرار سے
کل تک گراں تھی جن کو عیادت مریض کی — لپٹے ہوئے ہیں آج وہ خاک مزار سے

کس کی فغاں نے حشر بپا کر دیا شہید
کون و مکاں لرز گئے کس کی پکار سے

اب یہی وجہ شادمانی ہے — میری تکلیف شادمانی ہے

آفتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہیں جب کبھی دل کی بات مانی ہے
کل جوانی ہمیں میسّر تھی آج حاصل غمِ جوانی ہے
کس توقع پہ دل کو سمجھاؤں دل نے کب میری بات مانی ہے
میں شہیدِ غمِ محبّت ہوں
درسِ عبرت مری کہانی ہے

سانس کے ٹوٹے ہوئے تاروں پہ جھنکاتا ہوں میں بزمِ امکاں کو بھی اپنے ساتھ تڑپاتا ہوں میں
جب تمھاری جستجو بےتاب کرتی ہے مجھے سرحدِ منزل سے بھی آگے نکل جاتا ہوں میں
پتّہ پتّہ کہہ رہا ہے مجھ سے افسانہ ترا ذرّہ ذرّہ میں تجھے جلوہ نما پاتا ہوں میں
پھر کسی نے کی نوازش قلبِ مضطر پر شہید
پھر دلِ خاموش کو گرمِ نوا پاتا ہوں میں

مقبول کوئی دعا نہیں ہے کیا تو میرا خدا نہیں ہے
میں ہاتھ اٹھاؤں کیوں دعا کو میرے قبضے میں کیا نہیں ہے
خاموش شہید کس لئے ہو
ہنگامہ کوئی بپا نہیں ہے

دیوانہ بنا دے نہ کہیں جوشِ مسرّت دانستہ نکل آیا ہوں منزل سے بہت دُور
قربت تو شہید اصل میں ہے مرگِ محبّت
رہتا ہے ستارہ مہِ کامل سے بہت دُور

قیمت میں جان و دل بھی اگر کوئی مانگ لے جلوہ بقدرِ ذوقِ تماشہ گراں نہیں
خاموش ہوں کہ ضبطِ محبّت کا ہے خیال سینہ میں دل نہیں ہے کہ منہ میں زباں نہیں
اب صاف دیکھ لیتا ہوں دل کی نگاہ سے اب کوئی پردہ میرے ترے درمیاں نہیں

کس سے مانگیں دُعا کہاں جائیں بےکسوں کا کہیں خدا بھی ہے
کشتیِٔ عمر کا خدا حافظ اب تو مایوس ناخدا بھی ہے
بجلیاں کس لئے چمکتی ہیں اب نشیمن میں کچھ رہا بھی ہے
کیا بتائیں شہید کا مشرب
بادہ کش بھی ہے پارسا بھی ہے

راؤ شہباز خاں کلانوری

میری پیدائش ۴ اگست ۱۹۲۸ء کو قصبہ کلانور ضلع روہتک میں ایک نواب راجپوت خاندان میں ہوئی۔ والد بزرگوار کا اسم گرامی ... خاں ہے جو کہ ایک فوجی گزیٹڈ آفیسر تھے جس وقت والد محترم نے انتقال فرمایا میری عمر دو سال کی تھی اور میں اپنے بھائیوں اور بہنوں میں سب سے چھوٹا تھا پرورش اور تعلیم کی ذمہ داری والدہ ماجدہ کو ہی اٹھانی پڑی کیونکہ میرے بڑے بھائی محمد آباد خاں کی عمر آٹھ سال کی تھی۔

۱۹۴۵ء میں سینٹرل مسلم راجپوت ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد گورنمنٹ کالج روہتک میں داخلہ لے لیا چونکہ بچپن سے ہاکی کا شوق تھا اور اسکول ٹائم میں متعدد بار ٹورنامنٹ کھیل چکا تھا اس لئے کالج کی فرسٹ الیون ٹیم کا ممبر چن لیا گیا۔ بعد ازاں ۱۹۴۶ء میں فرسٹ الیون کا کیپٹن منتخب ہوا یونیورسٹی کے میچ کھیلے اور اسکالر شپ حاصل کیا پاکستان پہنچنے کے بعد ۱۹۴۸ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا شعر و شاعری کا شوق ابتدا ہی سے تھا اور لیاقت کے مطابق اشعار کہتا رہا آجکل ستلج کاٹن ملز لمیٹڈ اوکاڑہ میں بطور کلرک کام کرتا ہوں فنی تفہیم کا شوق ہے مگر ہنوز آرزو پوری نہیں ہوئی نمونہ کلام ملاحظہ فرمایئے۔

جو ہیں تسلیم جمع جانان لئے ہوئے — وہ ہیں تجلیات کا عرفاں لئے ہوئے
اپنے ہاتھوں سے چلا دو دامن اپنا — بات گھر کی مرے اور پھر تیاں تک پہنچے

دل میں اب تاب ضبط راز نہیں — آپ کی بات حقیقت ہی سہی

نہ جانے کہاں خود کو ہم دیکھتے ہیں — انہیں جب خدا کی قسم دیکھتے ہیں
فضاؤں پہ طاری ہے سکتہ کا عالم — بہاروں کو مصروف غم دیکھتے ہیں

مرا عشق اب بلا نک کلی نہ سمجھے — نہ افلاک کیوں الا یا گیا ہوں

ادھر جائیں گے یا ادھر جائیں گے ہم — جہاں جائیں گے بہتر کہلائیں گے ہم
میرے اشکوں کو دیکھ کر شہباز — اور وہ بدگماں نہ ہو جائے

بلقیس جہاں بیگم

اگر کوئی گنتی کی چند نظمیں یا غزلیں لکھ کر شاعر کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے تو آپ میرا نام بھی بلا تامل شعرا بلکہ ملک الشعرا کی فہرست میں درج فرما لیں مجھے قطعاً آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہوگا ورنہ بصورت دیگر آپ مجھ سے نہیں مظہر بھائی سے جواب طلب کریں۔ جو مجھ سے اپنے انتہائی برادرانہ خلوص و محبت کے باعث "پرچم" کے شاعر نمبر کے لئے میرے حالات اور نمونۂ کلام طلب فرما رہے ہیں۔

نمونۂ کلام! اللہ! کتنا شاندار لفظ ہے! اس وقت تو میں سچ مچ خود کو شاعر سمجھنے لگی ہوں چلئے ایک مرحلہ تو طے ہوا اب رہ گئے حالات تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ میکہ جمنا کنارے کے خطۂ پنجاب میں واقع تھا۔ سسرال والے ستلج کے آس پاس کے علاقہ سے وابستہ تھے اور ۱۹۴۷ء کے خونیں ہنگامے نے پنجاب کے اس عروس البلاد میں مستقل طور پر لا بسایا جس کے دامن میں بوڑھا راوی لاکھوں بھوکے ننگے بے یار انسانوں کے لہو کے آنسوؤں سے لبریز چپ چاپ بہے جا رہا ہے۔

میکہ اور سسرال میں اعلیٰ تعلیم کا چرچا تھا۔ کچھ زیادہ کو افسانوں ناولوں سے بھی دلی شغف تھا لیکن افسانہ نگاری یا شعر گوئی کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ میں خود بھی نہیں جانتی کہ یہ مرض مجھے کیسے لگا؟ بس اتنا احساس ہے کہ پڑھنے لکھنے اور پھر گھر کے کام کاج میں مصروف رہنے اور زندگی کی ہر دلچسپی میں بڑی سرگرمی سے شریک ہونے کے باوجود شروع ہی سے زندگی میں گہرا خلاء سا محسوس ہوتا تھا۔ مطالعہ اور مشاہدہ کا بہت شوق تھا اور اس شوق کی آسودگی کے لئے موقعے بھی بہت تھے۔ دیکھے سنے واقعات کو حسین و دلگداز پیرائے میں ڈھال کر تخیل کی دنیا بسانے میں بیحد لطف آتا تھا اور اسی جذبہ کے زیر اثر یونہی ایکبار اپنا پہلا افسانہ "شہید عروس" گھسیٹ ڈالا اور اس روز مجھے یوں معلوم ہوا تھا جیسے ازل سے بھولے بھٹکے مسافر کو اپنی منزل کا نشان مل گیا ہو۔ پھر کیا تھا اللہ کا نام لیکر قلم سنبھالا اور پڑھنے والوں کا وقت ضائع کرنے کے لئے الٹی سیدھی کہانیاں

لکھنی شروع کردیں جو اپنی بے شمار خامیوں کے باوجود دنیائے ادب میں بے حد مقبول ہوتی رہیں۔ لیکن "کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیئے"، طبیعت کے تلوّن نے شاعری کی طرف بھی مائل کیا اور ہم نے سنبھل سنبھل کر نہیں کمال دیدہ دلیری اور احمقانہ بے پروائی سے اس "خارزار" میں بھی قدم رکھنا شروع کردیا۔ پہلی غزل نہ سہے "ولولہ نہ امید ہے......" غالباً ۱۹۴۳ء میں کہی اور محترم بزرگ علامہ سیماب علیہ رحمتہ کے ملاحظہ کیلیئے بھیج دی۔ جواب آیا تو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ صرف دو تین مصرعوں میں ایک آدھ لفظ کا ردّ و بدل کیا گیا تھا اور ایک علیحدہ خط میں چند فنی نکات کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ ساتھ میرے اسلوب کو سراہا تھا اور میری ہمت افزائی فرمائی تھی۔

افسانہ نویسی اور کبھی کبھار "شعر نویسی" کا یہ سلسلہ (جو اگرچہ میری قلم چوری کے باعث ٹراشست تھا) یونہی چل رہا تھا۔ اور میری ان ناچیز چیزوں کی ادبی دنیا میں بہت پذیرائی ہو رہی تھی کہ "ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے!"

قلم کی اس نیند کی وجہ خواہ گھرداری کی مصروفیتیں ہوں یا صحت کی خرابی، کوئی ذہنی الجھن ہو یا تاثرات کی شدّت ہر صورت یہ خاموشی سخت مجرمانہ نوعیت کی ہے خصوصیت سے اس وقت جب ہمارے ملک کے کروڑوں بیکس و لاچار عوام کے اپنے ہر لکھنے والے پر بے شمار تقاضے ہیں جبکہ لاتعداد چیختے جاگتے موضوعات کسی دردمند قلم کے منتظر ہیں۔ جب ادب کو ادبیت کے ساتھ ساتھ زندگی سے بھرپور شباب و لولہ کی اشد ضرورت ہے۔ میں نے آج تک جو بھی لکھا ہے زندگی سے الگ ہٹ کر کبھی نہیں لکھا جو دیکھا اور محسوس کیا۔ وہی تاثر اپنے پڑھنے والوں تک پہنچانے کی کوشش کی یہ بات ضرور ہے کہ پہلے نظر صرف اپنے ارد گرد ہی گھوم سکتی تھی لیکن اب دوسروں کے غموں کے مقابلے میں اپنا دکھ درد ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ دوسروں کی شدید جسمانی تکلیفیں دیکھ کر اپنی محض کسی ذہنی اذیت کے احساس کے بیان سے شرم سی محسوس ہوتی ہے اور دوسروں کی ناقابل برداشت پُر احتجاج زندگی کے سامنے اپنی خوش حالی گویا جرم معلوم ہوتی ہے۔ معاف فرمائیگا اس وقت تو بات شاعری کی ہو رہی تھی۔ ہاں تو میں نے اب تک فوقتاً وقتاً جو کچھ کہا ہے اس کا کچھ حصّہ آپ بھی پڑھ لیجئے۔ اگر اتفاق سے کوئی چیز پسند آجائے تو میرے حق میں دعا خیر کیجئے۔ یا رخاطر ہو تب بھی برا نہ کیجئے کیونکہ یہ دنیا اپنی تمام تر بدصورتی

بے اتفاقی اور بُرائی کے باوجود آج بھی مجھے بہت عزیز ہے۔

اُن آنکھوں کی مستی کا عالم نہ پوچھو — کوئی جیسے پی کر شراب آ رہا ہے
نہ جانے یہ کیا کہہ گئیں وہ نگاہیں — نہیں خود سے پوچھ پوچھ جواب آ رہا ہے
یہ پورب کی مجذوب بھیگی ہوائیں — مجھے یاد بھولا سا خواب آ رہا ہے
یہ ابر بہاراں یہ جشنِ مسرّت — ہر اک شے پہ جیسے شباب آ رہا ہے

نہ کسی کو پانے کی آرزو نہ کسی کے کھونے کا غم مجھے
نہ وفا جفاؤں میں مستِ ہیں نہ خلش کسی کے عتاب میں
نہ کسی کے قرب میں عیش ہے نہ کسی کے ہجر میں بے کلی
نہ کسی سے گفتگو روبرو نہ کسی کو دیکھا خواب میں
نہیں کوئی منظر جانفزا ترے غم میں حدِّ نگاہ تک
نہ وہ لطفِ شعر و شباب میں نہ وہ کیف چنگ و رباب میں

تڑپتا بہت تھا دلِ ناتواں — چلو تھم گیا خاتمہ ہو گیا
نظر نے کہا اور نظر نے سنا — پیامِ محبت ادا ہو گیا
دیا تھا جو تم نے مجھے سوزِ غم — وہی دردِ دل کی دوا ہو گیا

تڑپا رہی ہے مجھ کو تیری یاد ان دنوں — کیوں باعثِ سکوں تری فرقت نہیں رہی
بھیگی تھی اور رات قدر اک بدنصیب کی — اب خواب میں بھی آنے کی عادت نہیں رہی

بھوجپوری گیت

کس قدر ہے رنگ و محزوں کس قدر بیکار دن
مانگ لاؤں کس سے یا رب کیف زا دو چار دن!
جب غروبِ مہر سے رنگین ہو جاتی ہے شام
جیسے پھاگن رُت میں ہولی یا شرابِ لالہ فام

رات کے دامن سے جس دم جھانکتا ہے ماہتاب
جس طرح دلہن الٹ دے اپنے چہرہ سے نقاب
ذرہ ذرہ دہر کا خاموش ہو جاتا ہے جب
سارا عالم نیند کے افسوں میں کھو جاتا ہے جب
بادِ شب کی سرسراہٹ ہے کہ آوازِ رباب
جیسے عاشق کا تخیل جیسے اک شاعر کا خواب
یہ ہوائیں آتشیں نغمے سناتی ہیں مجھے
بھولی بچھڑی داستانیں یاد آتی ہیں مجھے

شکوہ

وہ آرزوئیں جن پہ تھا خود زہد کو بھی ناز
ان کی طرف سے اب ہو گئے تم ایسے بے نیاز
اللہ ان کے ذکر سے بھی آج اجتناب
کیوں ان پرانی یادوں سے آنے لگا حجاب
ماضی کے سب فسانے فراموش ہو گئے
آتے ہی ہوش بے خود و بے ہوش ہو گئے
لیکن ہمیں تو یہ بھلانا آیا نہیں کبھی
یہ لفظ دل زبان پہ لایا نہیں کبھی
تم ہی بتاؤ کیسے بھلاتے ہیں یادِ دوست
جب واقعات یاد دلاتے ہیں یادِ دوست

کہسار سے خطاب

اے مرے دیرینہ مونس اے شفیق و غمگسار
تا ابد اس دہر میں قائم رہے تیری بہار
یہ تری گل پوش چوٹی اور خودرو پھول پھل

یہ تری گلریز وردی اور سریلے آبشار
یہ تری خاموش صحبت اور بھیگی بھیگی دھوپ
یہ تری رنگین شامیں ہلکی ہلکی یہ پھوار

تاثرات

جبین افق پر یہ شعلے سے لرزاں   ہوں جیسے کہیں لاکھوں شمعیں فروزاں
یہ نارنگی کی شوخ و سیمیں کلیاں   یہ شبنم کی بوندیں یہ نکہت کا طوفاں
کہیں دور کچھ گنگناتا ہے کوئی
مرے لب پہ بھی شکوہ آتا ہے کوئی
یہ برکھا کی رت بہکی بہکی ہوائیں   یہ پورب کی اودی نشیلی گھٹائیں
یہ کوئل کی مجبور و غمگین صدائیں   پپیہے کی پرسوز محزوں نوائیں
نشہ بن کے آنکھوں پہ چھاتا ہے کوئی
مجھے شعر اپنے سناتا ہے کوئی
شفق اور سمندر کا دلکش تلاطم   ہوں جیسے کہیں جمع شعر و ترنم
ہو جیسے کہ رنگیں لبوں کا تکلم   یا جیسے کسی شاعرہ کا تبسم
کسک بن کے دل میں سماتا ہے کوئی
مجھے یاد رہ رہ کے آتا ہے کوئی

ساقی سے

تڑپ بجلی سے لی تو نے فلک سے وسعتیں لایا
سمندر سے روانی لی شفق سے سرخیاں لایا
دیا شبنم نے گریہ پھول سے رنگینیاں لایا
بنائی اک نئی دنیا کی یوں تصویر اے ساقی
ہوا اک شور سا برپا پھر اک دانائے راز آیا
شعار عزم لیکر ایک مرد صبح ساز آیا

---

۱ علامہ اقبال علیہ رحمۃ   ۲ قائد اعظم علیہ رحمۃ

لئے دردِ غلامی کا مداوا چارہ ساز آیا
نظر کے سامنے تھی منزلِ مقصود اے ساقی

رہِ منزل پہ اپنی ہم لٹا کر مال و زر آئے
ہزاروں بے گناہوں کو سفر کی بھینٹ کر آئے
ہم اپنے دامن اپنے ہی لہو سے کر کے تر آئے
نرالی شان سے ہم آئے پاکستان اے ساقی

وہاں غیروں کے بھالے تھے یہاں اپنوں کی نفرت ہے
وہاں مجروح تن تھے اور یہاں مجروح غیرت ہے
وہاں عزت کا مرنا تھا یہاں جینے میں عزت ہے
وہ ہندوستان تھا ساقی یہ پاکستان ہے ساقی

کہیں فاقوں پہ فاقے ہیں کہیں لوٹی ہوئی دولت
کہیں دم توڑتے گھائل کہیں ہر روز اک دعوت
کہیں حسنِ خراماں اور کہیں کھوئی ہوئی عصمت
میں حیراں ہوں کہاں گم ہو گیا انسان اے ساقی

تو کیا ان تیرے خوابوں کی یہی تعبیر ہے ساقی!
جہانِ نو کی تیرے کیا یہی تعمیر ہے ساقی!
وہی ہم ہیں وہی پھر شکوۂ تقدیر ہے ساقی!
کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں نئے انسان اے ساقی!

شفق کے پاس لیکن اک ستارہ مسکراتا ہے
نقابِ ابر میں اوڑھے ستارہ مسکراتا ہے
غریبوں کی دعاؤں کا سہارا مسکراتا ہے
فلک سے آ رہا ہے اک نیا پیغام اے ساقی!

متفرق اشعار

کیوں مجھ کو اپنے دل سے بھلاتے نہیں بھلا   کیوں کر رہے ہو اتنا مجھے شرمسار تم
وہ حسرتیں تھیں جن پہ کبھی زہد کو بھی ناز   ان کی طرف سے اب ہو گئے ہم اپنے ہی بے نیاز

شیدا صوفی محمد عمر کاشمیری

صوفی محمد عمر ابن صوفی غلام قادر کاشمیری ۱۹۱۲ء میں امرتسر میں پیدا ہوا۔
تعلیم ایف اے تک ہے عمر کا زیادہ حصہ ملازمت میں گزرا۔

رازِ حیات دردکے ماروں سے پوچھنا   اور ہو سکے تو چاند ستاروں سے پوچھنا
اتنی سی مختصر ہے غمِ دل کی داستاں   وہ آئے اپنا نقش جما کر چلے گئے

شیدا گجراتی

سالِ پیدائش ۱۹۲۲ء وطن گجرات

اے دوست تیری ایک تمنا کہاں کہاں   دیتی رہی فریب بہار و خزاں مجھے
نئے جہاں کے تقاضے نئے سہی لیکن   برائے دل کوئی تازہ پیام ہو تو سہی

ہست قرآں در زبان پہلوی

الہامِ منظوم

مثنوی مولانا روم کا مکمل اردو منظوم ترجمہ
جسے علامہ سیماب اکبرآبادی کا کارنامہ عظیم کہا گیا
مثنوی کے ہر شعر کے نیچے اردو کا شعر دیا گیا ہے
الہامِ منظوم چھ حصوں پر مشتمل ہے بہترین لکھائی چھپائی اور مجلد ہونے کے باوجود قیمت صرف چوبیس روپیہ
خصوصاً اک ہے

مکتبہ پیام کراچی

صبا

رفیع احمد متھراوی

نام :- رفیع احمد لیکن میری پھوپھی مرحومہ جو مجھ سے غیر معمولی محبت رکھتی تھیں مجھے پیار میں اقبال احمد کہتی تھیں۔

تخلص :- صبا

والد بزرگوار کا نام :- مولوی رضی الدین خطیب عیدگاہ متھرا (یو۔پی)

دیگر کوائف :- ۳۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو کرشن جی کی متھرا میں جنم لیا اور بقول فانی مرحوم کے ہندی کا پنڈت بننے کے بجائے اردو فارسی اور عربی کا ترقی یافتہ مولوی بن گیا۔ آبائی تعلیم کے بعد علوم شرقیہ کے اعلیٰ امتحانات فاضل (عربی) کامل (فارسی) اعلیٰ قابلیت آنرز ان اردو انفرادی حیثیت سے پاس کئے۔ معلمی کا خاندانی پیشہ اختیار کیا جس کے سلسلے میں انٹر تک انگریزی کا نجی مطالعہ کیا تاکہ انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں مستند معلم تسلیم کیا جا سکوں۔ تقسیم ہند سے پہلے متھرا کے مختلف انگریزی مدارس میں بحیثیت معلم زبان کام کرتا رہا۔ اور آجکل کراچی میں گورنمنٹ کی ایک انگریزی درسگاہ میں اسی خدمت کو انجام دے رہا ہوں۔ مختلف اداروں میں صحافت کا بھی شوقیہ تجربہ کیا ہے۔

بچپن ہی سے شعر گوئی مقالہ نگاری اور افسانہ نویسی میرے محبوب مشاغل رہے ہیں۔ علامہ سیماب اکبرآبادی کے قابل اعتماد اور فارغ الاصلاح تلامذہ میں سے ہوں۔"

اردو ادب کے قدیم اور جدید رجحانات سے واقف ہوں اور محتاط ترقی یافتہ ادب کا قائل ہوں۔ وقت کی آواز اور ماحول کی پکار کا پہلے جائزہ لیتا ہوں پھر قدم بڑھاتا ہوں؟"

نمونۂ کلام ملاحظہ فرمایئے۔"

سالِ نو

میں نے جب سوچا کہ لکھوں سالِ نو پر نظمِ نو　　بول اٹھا وقت کا سرگرم قاطعِ گورکن
زندگی کی قبر پر چادر چڑھی ہے اک نئی　　سالِ نو ہے عالمِ کہنہ کا اک تازہ کفن

یہ تصنع یہ تکلف یہ تنوع کچھ نہیں!　　زندگی کے واسطے سامانِ نو پیدا کرو
زندگی بھی مر گئی انسان جب سے مر گیا　　سالِ نو کے واسطے انسانِ نو پیدا کرو

یہ دہکتے سرخ چہرے یہ چمکتے پیرہن　　پھول ہیں کاغذ کے جن میں نام کو خوشبو نہیں
یہ ہی تہذیبِ حاضر نام کی تہذیب ہے　　قوم کی گائے کبھی نادان دودھ دیتی ہی نہیں

آج عالم میں یہاں ہر سو ظلمتیں ہی ظلمتیں　　صدق کی شمعیں نہیں اخلاق کے تارے نہیں
نرم و نازک پتیوں پر کبھی ہو کا لو کی کھٹک　　گلشنِ ہستی کے گلپارے کبھی گلپارے نہیں

زندگی جب زندہ ہو گی سالِ نو ہو گا وہی　　مست مٹا کر آدمی کبھی آدمی بن جائے گا
صبح میں بھی حسن ہو گا شام میں بھی اک نکھار　　گردشِ دوراں سلامت دورِ دہ بھی آئے گا

رباعیات

طوفان کی موجوں میں ابھرنا سیکھو　　تلوار کی دھاروں پہ گزرنا سیکھو
ڈرتے ہیں کہیں موت سے جینے والے　　زندہ نہیں رہنا ہے تو مرنا سیکھو

جو قوم سدا بزمِ عمل جاتی ہے　　اس قوم کی تقدیر بدل جاتی ہے
جب غیظ میں اٹھتے ہیں وطن کے غازی　　کتراتی ہوئی موت نکل جاتی ہے

متفرق اشعار

نشاط و عیش کھوئے ہیں یہاں فقیرانہ　　گزر رہا ہے گزرگاہِ غم سے دیوانہ!

سلام لے کے در و دیوار آ رہے تھا ... کہ اب تو منزلوں آگے ہے تم سے دیوانہ
بار ہا ایسے مواقع بھی نظر سے گذرے ہیں کہ تیرا گھر نہ ملا اور تیرے گھر سے گذرے
دمِ رخصت تمہیں دیکھا کیا صبا نقوی تک نہ تم لوٹے نہ پھر لوٹی نگاہِ ناتواں میری
راز سب زمانے نے کہہ دیئے زمانے سے ہل گئے لبِ فطرت میرے لب ہلانے سے
حسن کا ترانہ ہوں عشق کا فسانہ ہوں نازشِ زمانہ ہوں پوچھ لے زمانے سے
محبت ... [illegible] ... کا ذکر ہی کیا ہو کہاں تم ... ہم تھے
مقامِ عجز و دل کی رفعتیں کیا پوچھتے ہو تم فرشتوں کا گذر بھی غیر ممکن تھا جہاں ہم تھے
شگفتہ صورت کا آئینہ دار کیا ہوگی!! چمن کے پھول ہی ہوں گے بہار کیا ہوگی
ترے لبوں کی طرح نغمہ بار کیا ہوگی کلی کلی ہے کلیم بہار کیسا ہوگی
جو بدنصیب طبیعت نہیں الم انداز وہ کیفیت غمِ سکون و قرار کیا ہوگی

صبا اک بات کرتے ہیں ہزاروں پھول جھڑتے ہیں
لبِ فطرت کی رنگینی مری اردو زبان میں ہے



صبا نقوی

دیکھا تو نہیں سنا ہے کہ میں ضلع حصار (مشرقی پنجاب) کے مشہور قصبہ بروالہ میں ایک چھوٹی سی بستی اور نہایت اعلیٰ سید خاندان میں ۵ فروری ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوا میں بلاشبہ ذہین تھا ... تمام بچوں سے اچھی صحت کا مالک اور اتنی خصوصی صلاحیتوں کا حامل تھا جن کو بروئے کار لایا جاتا تو آج میں کیا ہوتا؟ اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور رہتا۔ اس کی ستم ظریفی سے ... تھا: پاس نے اور ... کے پرچہ کے ... کے لئے مجھے ... کا منتخب کر لیا تھا مجھے تعلیم حاصل کرنے کا انتہائی شوق تھا لیکن بدقسمتی سے میرا یہ شوق پورا نہ ہو سکا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے صرف "یسرنا القرآن" "ابتدائی اردو" قاعدہ اور

اردو کی پہلی کتاب ایک حافظ صاحب سے پڑھی تھی اور بس اگر مجھے مطالعہ کا شوق نہ ہوتا تو آج ہرگز دو حرف پڑھنے کے قابل نہ ہوتا۔ میں نے لکھنا صرف اپنی محنت سے سیکھا ہے۔ اوائل عمری ہی میں میرے والدین نے مجھے میرے تایا جی کے سپرد کر دیا جو پیران کلیر شریف کے قریب ہی پیرپور نامی گاؤں کے نزدیک کسی درگاہ کے سجادہ نشین تھے انہوں نے مجھے ہر طریقہ سے اپنے ڈھنگ پر لانے کی کوشش کی لیکن میں خود کو اس لائق نہ بنا سکا کہ سجادہ نشینی پیری و مریدی کے فرائض انجام دوں میری زندگی کا ابتدائی زمانہ انتہائی درد ناک گذرا ہے حتیٰ کہ ان کے تصور سے آج بھی تکالیف کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

پاکستان کا قیام میرے لئے انتہائی مبارک ثابت ہوا۔ اگرچہ تایا جی راضی نہ تھے لیکن میں کسی نہ کسی طرح ایک سال کے بعد اپنے خاندان سے آ ملا۔ اور پرمٹ سسٹم کی مزید مہربانی سے میں یہیں کا ہو رہا۔ میں نے اپنی تعلیمی کمی کو محسوس کرتے ہوئے ادیب عالم کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ اور منشی و میٹرک کے امتحان بھی بغیر کسی خاص تیاری کے پاس کر لئے اور اب کسی ایسی ملازمت کی تلاش میں ہوں جس کی مدد سے میں اپنی تعلیم کی کمی کو پورا کر سکوں۔ اگرچہ اب امید ہو چلی ہے کہ اپنی ترقی کے راستے کو ہموار کر سکوں گا لیکن پھر بھی غلط تربیت کے نتیجے کے طور پر اکثر اوقات اپنے اندر بعض ایسی شدید کمزوریاں محسوس کرتا ہوں کہ جن کی تلافی شاید نہ ہو سکے

ہوش سنبھالا تو پیر ہو چکے تھے۔ یوں جبری زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر خوفناک تعزیریں دی جاتیں اور پیٹا جاتا۔ ان حالات نے دل کو حساس بنا دیا۔ اور سوچنے کی عادت ہو گئی۔ اور دلی جذبات کے اظہار کے لئے قلم کا سہارا لے لیا۔ پاکستان آنے کے بعد محسوس ہوا کہ اس راہ کے لئے بھی کسی رہبر کامل کی ضرورت ہے بڑی جستجو کے بعد حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی کا دامن تھاما اور انہوں نے انتہائی شفقت سے اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا لیکن قدرت کے نا روا ظلم کو کیا کہئے کہ اس نے پھر مجھے تنہا بنا دیا اور

[illegible]

نمونۂ کلام ملاحظہ فرمایئے۔

انتخاب کلام

تو ساقی نے آہا کہ موافق ہوں فضائیں
گھبرا گیا اس سلسلۂ شام و سحر سے

کیوں ساغر و مینا کی ہے اسکو ضرورت
تو دیکھ لے ساقی جسے مخمور نظر سے

ہر شئے لطیف تر ہے تری کائنات میں
جو چیز سامنے ہوئی دل میں اتر گئی !!

رحمت کو یہ ادا مری شاید پسند ہو
ڈر ڈر کے کانپ کانپ کے پینا شراب کا

مجھے لطف آتا ہے الفت میں کیا کیا
جفا جب وہ کرتے ہیں بدلے وفا کے

کچھ اپنے انتظار کا عالم نہ پوچھئے
جیسے کہ پیدا ہوتے ہیں ہر ہر نظر سے آپ

رنج والم نہیں زندگی پہلے ہی خستہ حال تھی
ان کی نگاہ نیچی نے اور بھی حشر ڈھا دیا

اے مرے بیقرار دل اے مرے سوگوار دل
اس کو کبھی نہ بھولنا جس نے تجھے بھلا دیا

نیند نہ آئی وہ بھی نہ آئے
آنکھیں ساری رات دکھائیں

تم یاد آؤ کبھی بھول کر کبھی !
ہمیں اس طرح سے بھلاؤ تو جانیں

کیا یہ تاثیر عشق ہے ہمدم
حسن اب اشکبار سا کیوں ہے

صبا کوئی ہمدرد پایا نہیں
مصیبت میں حسرت ڈالی نگاہ

صوفی

احمد مجتبیٰ رامپوری

سن پیدائش ۱۹۲۸ء نام احمد مجتبیٰ تخلص صوفی وطن رامپور

سنورتے ہیں حسیں تو عاشقوں کی جان ہوتے ہیں
بگڑتے ہیں تو ان کی موت کا سامان ہوتے ہیں

صوفی عبدالحمید بٹ کاشمیری

اپنے حالات اس لئے نہیں لکھ سکتا کہ بڑے ہی ناگفتنی ہیں
مختصر یہ ہے کہ ہندوستان میں پیدا ہوا۔ اور پاکستان میں مرنے کا ارادہ رکھتا ہوں
نمونۂ کلام ملاحظہ فرمایئے۔

آہنگِ نو

جنونِ شوق کی تصویر لے کے آئے ہیں
قلم کی شوخیٔ تحریر لے کے آئے ہیں

عدو کے خرمنِ تدبیر کے جلانے کو
نگاہ میں شعلۂ تقدیر لے کے آئے ہیں

نوید خستہ دلی سوگوار کلیوں کو
بہارِ وادیٔ کشمیر لے کے آئے ہیں!

سکوتِ مرگ مسلط ہے لات و عزیٰ پر
خروشِ نعرۂ تکبیر لے کے آئے ہیں

قلم کی زمزمہ پردازیوں کے ساتھ تمام
سرودِ خنجر و شمشیر لے کے آئے ہیں

یزیدیوں کی اطاعت کا دور ختم ہوا
پیامِ اسوۂ شبیرؓ لے کے آئے ہیں

وہ اک نظر جسے تقدیرِ کائنات کہیں
وہی نظر کیمیا تاثیر لے کے آئے ہیں

خدا ہمارے ارادوں کو پختگی بخشے!
دلوں میں جذبۂ تعمیر لے کے آئے ہیں

صفدر علی خاں

میرے والد صاحب کا اسمِ گرامی یعقوب علی خاں اور رشید تخلص تھا۔ بزرگ افغانستان سے بعہد نواب فیض اللہ خاں والیٔ رامپور ریاست رامپور میں آکر آباد ہوئے۔ والد صاحب علومِ نجوم و جفر میں مہارت رکھتے تھے۔ اسی لیے نواب حامد علی خاں صاحب نے انھیں زمرۂ منجمین میں داخل کر لیا۔ اور تحصیلِ علمِ نجوم کے لیے انھیں اپنا استاد منتخب کر کے جوہر شناسی کا ثبوت دیا۔ مزید برآں نواب صاحب نے اعزازاً ایک پالکی برائے سواری عطا فرمایا۔

میری تعلیم و تدریس میں نواب صاحب نے بذاتِ خود بڑی دلچسپی لی لہٰذا عربی و فارسی میں کما حقہٗ دسترس حاصل ہو جانے کے بعد علومِ نجوم و جفر کے حصول کے لیے نواب صاحب نے حکم فرمایا۔ چنانچہ ان کے ظلِ عاطفت میں میں فارغ التحصیل ہوا۔ مجھے بچپن سے ہر علم کی تحصیل و تحقیق کا شوق بدرجۂ اتم تھا۔ میں نے پہلا شعر چودہ سال کی عمر میں کہا تھا۔ میرا شجرۂ تلمذ حضرت مصحفی تک پہونچتا ہے۔ مجھے ابتدا میں ناسخ کا رنگ پسند تھا۔ بعدہٗ داغ کا رنگ مرغوب رہا۔ پھر مومن اور اصغر کا رنگ اپنایا۔ اور اب تک یہی رنگ پسند ہے۔ تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ شغلِ شاعری ۱۹۴۳ء تک بڑی شد و مد سے جاری رہا۔ رات دن شعر و شاعری میں مشغول رہتا۔ دور دور کے مشاعروں میں شرکت کرتا رہا۔ ۹ جون ۱۹۴۳ء کو والد صاحب کے سانحہ ارتحال کے بعد سے ہز ہائی نیس، تمام باشندگانِ شہر اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کا کام اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ پھر شعر و شاعری خواب و خیال بن گئی۔ ریاست رامپور کے بھارت میں الحاق کے بعد میں نے رامپور کو مصلحتاً خیرباد کہہ دیا۔ اس لیے کہ میں فطرتاً خوددار واقع ہوا ہوں۔ نہ خود غلامی پسند کی ہوں۔ اور نہ آئندہ نسلوں کے لیے اسے بہتر سمجھتا ہوں۔ چنانچہ شروع ۱۹۵۰ء میں رامپور سے ہجرت کر کے کراچی آگیا اور اب فاڈل لائن کراچی میں مقیم ہوں۔ یہاں آنے کے بعد بغیر اشاعت کبھی یہ عالم ہے کہ صبح سے ۱۰ بجے شب تک اہلِ حاجت کا ایک میلہ سا لگا رہتا

ہے۔ وہی پہلی سی عدیم الفرصتی یہاں بھی جاری ہے۔ دن بھر سائلوں کی آمد و رفت زائچوں کا بنانا شاگردوں کو درس دینا۔ غرض کہ دن کا بیشتر حصہ اسی انہماک میں گذر جاتا ہے بھلا جب فرصت کے لمحات اتنے تنگ ہوں تو شاعری کیسے کی جائے۔ اس پر بھی دوستوں کے مجبور کرنے پر کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے۔ پالش کی کلفت کے باوجود میں مطمئن اور خوش ہوں۔

صفدر یہ قدر دانیٔ احباب دیکھنا
غربت میں ہیں وہ عیش کہ جیسے وطن میں ہوں

میں شہرت سے ہمیشہ محترز رہا ہوں اور نہ میرے پاس اتنا وقت تھا کہ خود نوشت سوانح حیات "شہرستانِ وفا" کے لیے تیار کرتا لیکن محترم ریاست علی خاں صاحب بی۔ اے اور جناب منظر الانعام مہر کے پیہم اصرار پر یہ خود نوشت تذکرہ اور اپنے پسندیدہ اشعار پیش کر رہا ہوں۔

حدِ سفر کو حاصلِ منزل بنا دیا ۔۔۔ ڈوبا میں جس جگہ اسے ساحل بنا دیا
بیچارگی کا شکوہ نہ کر اس کا شکر کر ۔۔۔ اس دل کو جس نے درد کے قابل بنا دیا
ناقص کی قید تھی نہ سرِ ساقی میں کمی تھی ۔۔۔ جس پر نظر پڑی اسے کامل بنا دیا
محتاجِ یک نگاہ تھا دل کا معاملہ ۔۔۔ مشکل تھا یہ کبھی کچھ جسے مشکل بنا دیا
صفدر خدا کرے نہ اٹھے آشنائے غم ۔۔۔ جس نے نشاطِ دل کو غمِ دل بنا دیا

وحشت میں دل بہلنے کا ساماں نہ ہو سکا ۔۔۔ دل دل رہا جگر کے بیاباں نہ ہو سکا
صفدر یہیں آیا کچھ کبھی نہ دقیقۂ وداعِ دوست ۔۔۔ کیا روکتا میں جب کوئی امکاں نہ ہو سکا

مانع کثرت کہ یہ دل نادان نہ ہوا ۔۔۔ ناخدا کو کبھی کچھ اندازۂ طوفاں نہ ہوا
روشنیٔ دہر کے ہمراہ رہی طرز جنوں ۔۔۔ جب بہار آئی گلستاں میں گریباں نہ ہوا

بنتا تو ہیں چلمن رخ روشن کی شعاعیں ۔۔۔ پردہ وہ اٹھاتے ہیں تو پردہ نہیں اٹھتا
اے جانِ حزیں تو بھی ذرا اس کی مدد کر ۔۔۔ دل سے مرے غمِ ہجر کا تنہا نہیں اٹھتا

رازِ دل ان پہ دمِ عرضِ تمنا کھل گیا ۔۔۔ میری گویائی سے میرے گھر کا پردا کھل گیا
کسی کی یاد لیے دل میں چٹکیاں ایسی ۔۔۔ سکون درد بنا چین اضطراب بنا
دیدۂ تر سے رواں جاری ہر سے برسوں لہو ۔۔۔ ابرِ باراں دو گھڑی دنیا میں برسا کھل گیا

نا پوچھو ٹھا ہر کے کبھی صفدر نے خاکساری کو
مٹا تو خاکِ در میں اپنی ہو تراب بنا

نالے ہے نازکی سے گراں طبعِ یار پر
اے جوشِ آہ رحم مرے حالِ زار پر
قائم رہے ملال یہ تمنا خدا کرے!
انکو ترس نہ آئے میرے حالِ زار پر
اے جوشِ اضطراب مری آبرو رہے
رکھا ہے اس نے ہاتھ دلِ بیقرار پر
صفدر نہ مجرئی نہ سلامی کسی کے ہم
تکیہ ہے صرف رحمتِ پروردگار پر

پالئے ہیں اس میں رازِ حقیقت نما کو ہم
حسنِ بشر میں دیکھ رہے ہیں خدا کو ہم
چشمِ کرم کو وہ ستم ناروا کہو ہم
یعنی خطا کو ہجرِ خطا کی سزا کہو ہم
لائے گا صورِ حشر جہاں کیا نشیب میں
کیا جانتے نہیں تری آوازِ پا کو ہم
بچپن کا صفدر اک یہی ہمسد پرخاش تھا
پچھتا رہے ہیں کھو کے دلِ مبتلا کو ہم

نہ تو رشتے پہ مری ہو نہ جہاں ہو تم
مثال دے کوئی کس سے کہ بے مثال ہو تم
وفا سے شکوے تمہاری زباں پہ کبھی آئے
میں خوش ہوا کہ چلو میرے ہم خیال ہو تم
زمانہ آیا زمانے نے پرسش غم کی
کبھی یہ تم نے بھی پوچھا کہ کیوں نڈھال ہو تم
نگاہِ ناز کہاں زحمتِ علاج کہاں
یہ آج کیا ہے کہ سرگرمِ اندمال ہو تم
کچھ ان سے ہو گئی شاید مصالحت صفدر
خدا نظر نہ لگائے کہ اب بحال ہو تم

ہوں وہ میکش کہ خدا نہ مجھے توفیق اگر
میں تو اک بات بھی بے ساغر و مینا نہ کروں
لختِ دل سٹتے ہیں کہاں نے کو غمِ الفت میں
کیا کروں اور جو ٹکڑوں پہ گزارا نہ کروں

سوچتا کیا ہے حق بجانب میں
جو کبھی آئے مزاجِ قاتل میں
جھٹکے حسرتوں کے ہیں دل میں
بیسیوں محفلیں ہیں محفل میں
جب انھیں شکل پر غرور ہوا
آئینہ آگیا مقابل میں
زندگی نے کہا خدا حافظ
پاؤں رکھا جو کوئے قاتل میں
کام سے کام ہے تکلف کیا
میں نے جب پی تو ساغرِ گل میں
تنگ تھا زیست سے مگر صفدر
رہ گیا جا کے کوئے قاتل میں

میں اس جہاں میں سبزۂ بیگانہ وار ہوں
سب آشنا ہیں اور کوئی آشنا نہیں
کوتاہی نگاہ کے قربان جائیے
وہ دیکھتے ہیں میں جو انھیں دیکھتا نہیں

ہیں خوفِ غم سے زرد تری انجمن میں ہوں
برگِ خزاں رسیدہ کی صورت چمن میں ہوں

ضیا — محمد صادق چنیوٹی

میرا نام محمد صادق اور ضیا تخلص ہے۔ والد گرامی کا نام میاں الٰہی بخش نکودر ہے۔ میں یکم اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء کو چنیوٹ ضلع جھنگ (پنجاب) میں پیدا ہوا میرا تعلق نکو قوم سے ہے جو پنجاب میں بہت با اثر اور با رسوخ مانی جاتی ہے۔

میری ابتدائی تعلیم چنیوٹ میں شروع ہوئی لیکن چونکہ والد صاحب قبلہ بسلسلہ تجارت آگرہ چلے گئے تھے۔ اور وہاں کے ممتاز تاجر شمار کئے جاتے تھے اس لئے میں بھی آگرہ چلا گیا اور وہیں میری باقاعدہ تعلیم ہوئی میں نے سنہ ۱۹۳۰ء میں شعیب محمدیہ ہائی اسکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۳۵ء میں آگرہ کالج سے بی۔ اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور پھر سنہ ۱۹۳۷ء میں ایل۔ ایل بی کرنے کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھا۔

میں ابتدائے زندگی ہی سے خاموش پسند اور گوشہ نشین واقع ہوا ہوں اس لئے میرا زیادہ وقت یا تو اپنے تجارتی ماحول میں صرف ہوتا تھا یا مطالعہ میں سنہ ۱۹۳۲ء میں میری طبیعت میں شعر و ادب کا ذوق پیدا ہوا۔ اور میرے مضامین رسالہ ... اور ہفتہ وار تاج وغیرہ میں شائع ہونے لگے۔

اور اسی زمانے میں اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء کو حضرت علامہ مولانا سیماب اکبر آبادی مرحوم و مغفور کا شاگرد ہو گیا۔ اب میری مشق سخن میں کافی ترقی ہو چکی تھی اس لئے ہفتہ وار تاج آگرہ میں میرے متعدد مضامین اور نظمیں وغیرہ شائع ہوئیں۔ اور اکثر انگریزی مضامین کا ترجمہ بھی کیا۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں فلمی موضوعات سے دلچسپی ہوئی تو بے شمار فلمی مضامین لکھے جو پنجاب اور کلکتہ کے ممتاز فلمی جریدوں میں شائع ہوتے رہے۔ اس زمانے میں مجھے ترجمہ کرنے کا بڑا شوق تھا چنانچہ اکثر انگریزی نظموں اور مضامین کے نہایت کامیاب ترجمے کئے۔

... سنہ ۱۹۳۶ء میں آگرہ میں سیماب لٹریری سوسائٹی کی بنیاد پڑی اور تمام ہندوستان میں اس کی شاخیں کھولی گئیں۔ چونکہ میں اس کا سکریٹری تھا اس لئے ان دنوں میری مصروفیت

بے انتہا بڑھ گئی تھی۔ جولائی ۱۹۳۳ء میں چنیوٹ میں میری شادی ہوئی۔ اسی سال کلکتہ کا سفر کیا۔ اور وہیں حضرت آغا حشر کاشمیری مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ جو میری ادبی صلاحیتوں کے بے حد مداح اور معترف تھے۔

۱۹۳۵ء میں آرٹ اور ادب سے متعلق میرے مضامین کا پہلا مجموعہ "حسن و رنگ" کے نام سے شائع ہوا۔ اور اسی سال "من کی آگ" ڈرامہ بھی شائع ہوا جسے عام طور پر بے حد پسند کیا گیا۔ اس کے علاوہ اسی زمانے میں اور بھی کئی اہم ادبی کام کیے جن میں موضوع تعلیم پر مبسوط مطبوعہ تبصرہ بطور خاص قابل ذکر ہے۔ جسے بڑی قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا۔ اور جو ہندوستان کے نوجوانوں کی عام تعلیمی حالت سے متعلق تھا۔

۱۹۳۶ء میں میرے افسانوں کا مجموعہ "شب چراغ" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد "صبح مشرق" کے نام سے نظموں اور غزلوں کا ایک مجموعہ شائع کیا جسے بہت کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ چونکہ اسی زمانے میں کاروباری سلسلے میں کافی عرصے تک مجھے کلکتہ رہنا پڑا۔ اس لئے میری ادبی مصروفیتیں کچھ کم ہو گئیں۔ لیکن مطالعہ برابر جاری رہا۔ اور وہاں میں نے اردو ادب اور آگرہ اسکول سے متعلق کافی تحقیقاتی کام کیا جس کے کچھ حصے ماہنامہ "شاعر" آگرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

جب ہندوستان تقسیم ہو گیا تو مجھے بھی مجبوراً ۱۹۴۷ء میں پاکستان آنا پڑا۔ آجکل دادو (سندھ) میں مقیم ہوں۔ اور تجارتی کاموں میں اس قدر مصروف ہوں کہ ادب و شعر سے بیگانہ سا ہو کر رہ گیا ہوں۔

میری ادبی زندگی کی یہ مختصر اور غیر مربوط سی روداد ہی میرے حالات کا آئینہ ہے۔ میں غزل کے مقابلے میں نظم کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ اور ہر صنف سخن پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

غلامی کے تسلط کو کہیں دیکھا ہیں صدیاں — کہیں چشم زدن میں چھین لی جاتی ہے آزادی
تخیل مائل پرواز ہے تنگئ خلوت سے — کوئی آواز مجھ کو دے رہا ہے بام رفعت سے
چمکتے ہیں ستارے جس سے مری لاکھوں تمنا کے — اور ایسے پاسے محبت ہے الٰہی تو!!
میں کارواں سے الگ ہو کے بھی رہا ہوں قید — مذاق فہم مرا کوئی کارواں میں نہیں!

ستاروں سے کہو کہ تھا میں مہتاب کا پیاسا
میں کسل سے تنگ آکر لیتا ہوں اک انگڑائی!

طاق

طالب حسین ہمدانی

اگر آپ میرا نام پوچھتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ لوگ مجھے طالب حسین کہتے ہیں، ویسے مجھے لوگ طاق ہمدانی کے نام سے بھی جانتے ہیں۔ ہمدانی کی وجہ تسمیہ تو نہیں بیان کر سکتا بس اتنا کافی ہے کہ یہ میری خاندانی نسبت ہے۔

مجھے بچپن سے شعر و ادب کا ذوق تھا آج بھی میرے ذہن نے وہ تاریخی قطعہ فراموش نہیں کیا ہے جو میں نے بہت چھوٹی سی عمر میں کہا تھا لیکن کیا کیجیے گا اسے سن کر

ٹھہریے ابھی آپ کو اپنے خاندانی حالات بھی بتا دوں تاکہ میرا تعارف مکمل ہو سکے۔

میرے والد ماجد پیر کرم علی شاہ ایک دلق پوش درویش اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ آپ سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اہل فقر میں آپ سرگروہ کے خطاب سے مشہور تھے آپ کے نیازمندوں اور مریدین کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ والد ماجد ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ کو بیمار ہوئے اور ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ یعنی ۴ دسمبر ۱۹۲۵ء بروز شنبہ معمولی سے بخار کی صورت میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ میرے جد امجد کا نام سید محمد جاہ ہمدانی ہے مگر آپ چونکہ لشکر کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے اس لئے لوگوں نے آپ کو لشکری پیر کے نام سے مشہور کر دیا۔ آپ عربی و فارسی کے عالم اجل تھے۔ صاحب تصنیف بھی تھے۔ آپ کی متعدد تصنیفات میرے پاس موجود تھیں مگر سرمایہ نیز میری نظموں، غزلیات کے مجموعے گھر کے اثاثہ کے ساتھ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کی نذر ہو گیا۔

والد مرحوم کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد مجھے ایک مولوی صاحب کے سپرد کر دیا گیا انہوں نے بڑی شفقت سے میری ابتدائی تعلیم مکمل کرائی۔ دن بیتے رہے یہاں تک کہ والدہ مرحومہ نے بھی ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو میرا ساتھ چھوڑ دیا اور [illegible] ہو گئی۔ ان پے در پے صعوبات کی بنا پر میری تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔ لیکن پھر بھی میں اس قابل ضرور ہو گیا کہ نیک و بد میں تمیز کر سکوں۔

چونکہ مجھے ابتدا سے ہی شعر کہنے کا شوق تھا آخر یہ شوق مجھے اکتوبر ۱۹۴۱ء میں کشاں کشاں آگرہ لے گیا اور وہاں علامہ سیمابؒ سے وابستہ ہو گیا۔ علامہ علیہ الرحمۃ میرے لئے خضرِ راہ ثابت ہوئے۔ انہوں نے اس فنِ لطیف کے رموز و نکات سمجھائے۔ مجھے میری خامیوں سے آگاہ کیا اور میرے کلام کو جلا دی۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ مرحوم کی ذاتِ گرامی میرے لئے بہت مفید ثابت ہوئی اور آج میں اس قابل ہوں کہ خود کو شاعر کہہ سکوں۔ والد ماجد مرحوم اور علامہؒ کا روحانی فیض آج بھی میرے لئے شمعِ ہدایت کا کام کر رہا ہے ——— میرے کلام میں غنائی اور صوفیانہ رنگ غالب ہے اور یہی رنگ مجھ کو پسند ہے۔

۱۹۴۲ء میں ہوشیارپور آ گیا اور وہاں کے اسلامیہ ہائی اسکول میں ملازم ہو گیا۔ ہوشیارپور کچھ ایسا پسند آیا کہ وہیں کی سکونت اختیار کر لی۔ اور ادیب عالم بھی وہیں سے کیا۔ اگر سچ پوچھئے تو میری پیدائش لدھیانہ کی ہے لیکن ہوشیارپور سے والہانہ محبت ہونے کی وجہ سے خود کو ہوشیارپوری لکھتا ہوں۔ میری نظمیں و غزلیں ملک کے بیشتر رسائل و اخبارات میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ مجھے وہ وقت کسی طرح نہیں بھولتا جب میرے استادِ گرامی علامہ سیمابؒ میرے یہاں ایک روز کے لئے تشریف لائے تھے۔ شام کو کھانا کھانے کے وقت مجھ سے فرمایا کہ آپ بھی میرے ہمراہ کھانا کھا لیجئے کیونکہ پھر یہ وقت نصیب نہ ہو۔ یہ سن کر میرے دل کو دھکا سا لگا لیکن نہ جانے کیا بات تھی میں مولانا سے کچھ نہ کہہ سکا چنانچہ میں نے آپ کے ہمراہ کھانا کھا لیا ——— اور مولانا کی یہ پیشگوئی درست ثابت ہوئی۔

اور آج ہم ان کی شفقت سے محروم ہیں ——— آہ! موت کے ظالم پنجے! ہجرت کے بعد میں نے منڈی بہاؤالدین میں سکونت اختیار کر لی۔ اکثر ارادہ کیا کہ یہاں سے راولپنڈی، کراچی یا پشاور کو منتقل ہو جاؤں مگر میرے کرم فرما جناب عبدالغنی صاحب [illegible] ڈاک خانہ جات کی ہمدردیاں میرے قدم روکے ہوئے ہیں۔

میرے نعتیہ کلام کے چند مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "افکارِ جمیل" کا چوتھا ایڈیشن ترمیم و اضافہ کے ساتھ عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

تہذیبِ نو کے شیدائی سے

تری نظر ہے مآلِ نظر سے بیگانہ | ہے تیرا ذوقِ محبت بتوں کا دیوانہ
یہ کیا فسانۂ عشق و طرب سناتا ہے | حدیثِ کرب و بلا کر بیاں دلیرانہ
مقامِ کبر و خودی سے بلند تر ہو کر | حصول ہوتا ہے ایقانِ سوزِ پروانہ
جمود بے حسی ہے مرگِ زندگی کا نشاں | حیات خیز ہے تدبیرِ سرفروشانہ
اٹھ اور اٹھ کے بصد اہتمامِ شبیری | مٹا دے دہر سے ہر سطوتِ یزیدانہ

متفرق اشعار

کب تک تو حماقت میں کھوئے رہیں گے ہم | پردے حقیقتوں کے اٹھانے کا وقت ہے
جلا دے غیرت کی بجلیوں سے یہ خرمنِ ظلم و جبرِ ہستی

ہلاک رہتے ہیں ہزاروں ناداں، تڑپ رہے ہیں ہزاروں دانا

مری سکوت پسندی سے تو یہ سمجھا ہے | کہ تیرے در پہ میں ہو گیا ہوں سر بسجود
تہذیبِ حق نواز کا اعلان کیجئے سر کرد | انسان کو اس جہاں میں انسان پھر کرو
مسلماں ہوں مجھے باطل سے دب جانا نہیں آتا
مجھے مایوسی و غم میں گھبرانا نہیں آتا

متاعِ زندگی و آگہی ہے میرے سینے میں | میں رہتا ہوں ادھر لیکن مدارِ دل ہے [illegible]
شکوہِ کفر کے آگے مجھے جھکنا نہیں آتا | کہ منزل سخت ہو کیسی کبھی رکنا نہیں آتا
جگا دے پھر جوانانِ وطن کو پیٹ نعرہ [illegible] | ہر اک سو [illegible] روح [illegible] پیدا کر
ازل سے وسعتِ آفاق میں آبادِ گردش ہیں | مہ و خورشید کی مانند درخشندہ نظر ہوں میں
نچوڑ ذوقِ تسلیم و رضا سے کھا گیا ہوں میں | [illegible]
روشن ہوں ذہن علم کی تابش سے اس قدر | شرما رہے ہیں چراغ جہاں علم کو دیکھ کر
کونین میں وہ قابلِ عز و وقار رہیں | جن کے نگاہ میں تو سر عز و وقار کے پا لیں
نالۂ عشق جنوں ہے جنوں کا حشر سکوت | سکوت میں نہیں ہوتے قلوب ننگ آلود
مسخر کر جہاں کو سیرتِ صوناک سے ناداں | نہیں اچھا بھٹکنا جادۂ ادراک سے ناداں

طاہر
غلام محمد کپورتھلوی

تاریخ پیدائش ۱۹ جنوری ۱۹۱۳ء غلام محمد نام تخلص طاہر وطن ریاست کپورتھلہ

کچھ مری وارفتہ نظروں سے فسانے بن گئے
کچھ ترے جلووں کی تنویریں پریشاں ہو گئیں

اب میرے تبسم دل کی ہستی کا جواب دے
کس نے کہا تھا میری طرف مسکرا کے دیکھ

طاہر
طاہر حسین دیوبندی

سن پیدائش ۱۹۰۸ء طاہر حسین نام تخلص طاہر وطن دیوبند ضلع مظفر نگر (یو۔پی)

فطرت ہی بدل دی مری بے بال و پری نے
ڈرتا ہوں قفس سے کوئی آزاد نہ کر دے

علامہ سیمابؒ کی وفات پر
ہند و پاکستان کے بے شمار

ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور ممتاز ترین ہستیوں نے اظہار افسوس کیا
ہند و پاک سے تقریباً ہر رسالے اور اخبار نے علامہ کی وفات کو ایک ناقابل تلافی نقصان لکھا
بے شمار عقیدت مندوں نے شاعر مشرق کو پرسا دیا
خطوط کے ذریعہ ۔ نظموں کے ذریعہ ۔ مضامین کے ذریعہ
ادارہ پرچم نے اس تمام مواد کو ایک ضخیم مجموعہ کی شکل میں "تعزیت نمبر" کے نام سے پیش کیا ہے
جن میں علامہ کی بیماری کے مفصل حالات۔ موت کے بعد کی تصاویر اور مزار شریف کی تصاویر بھی شامل ہیں
ایک تاریخی یادگار۔ قیمت عہ ۔ مکتبہ پرچم کراچی

یوسف ظفر

زندگی کے لفظ کی تعبیر کے لیے یہی کہہ دینا کافی ہے کہ فلاں شخص پیدا ہوا، اتنے برس جیا اور مر گیا لیکن جس ماحول میں اس کے سانسوں کی آمد و رفت ہوئی اور فطرت نے جس فضا میں دنیا کے چہرے کے خد و خال اور نقش و نگار پڑھنے کے لیے اس کی آنکھوں کو وا کیا۔ اسی کی ترجمانی ہی زندگی کی عکاسی ہے ورنہ زندگی ایک حقیقت بے معنی بن کر رہ جاتی ہے۔

میں یکم دسمبر ۱۹۱۴ء کی منحوس صبح کے پانچ بجے کوہ مری کی برفانی سرزمین میں پیدا ہوا۔ یہی مقام اپنی پرسکون سرد عظمت کے مظاہرے کے لیے میری نظروں کے سامنے آیا، اسی کے جمود نے میری زندگی میں سردی کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ اور شاید اسی لیے میں پیدائشی طور پر قناعت پسند واقع ہوا ہوں۔ یہیں کے پتھروں نے میری زندگی کی سنگینی کو سنگلاخ بنانے میں بڑا کام کیا اور یہ انہیں سانسوں کا کرشمہ ہے جو مجھے مری کی فضاء میں میسر آئے کہ میں اس قدر آلام و مصائب کے باوجود زندہ ہوں۔ ایک شریف، متمول خاندان کا اکلوتا لڑکا ہونے کی حیثیت سے مجھے ابتدائی زندگی میں ہر طرح کی نعمتیں نصیب تھیں اس پر کوہ مری کی دلنشین وسعتیں اور اس کا زیر و بم سونے پر سہاگہ تھا۔ آج بھی جب کبھی مجھے گہری خاموشی میں بیٹھنے کا موقع ملتا ہے تو مجھے وہی چٹانیں، وہی پتھر، وہی درخت، وہی صبحیں، وہی راتیں۔ وہی مناظر نظر آتی ہیں اور شاید مجھ سے شعر کہلوانے کے لیے ہی فطرت نے مری کی سرزمین کی دلآویزیوں میں مجھے جگہ دی تھی۔

اس کے بعد وہی کچھ ہوا جو عام بچوں کے ساتھ ہوتا ہے تعلیم و تربیت، ماں باپ کا پیار، عزیزوں کی مسکراتی ہوئی نظریں اور عمر کی رفتار دریجہ بدرجہ اپنا کام کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۹۳۲ء کا آغاز ہوا۔ میں ساتویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ والد بیمار ہوئے، کاروبار میں گھاٹا ہوا، بیماری نے طول کھینچا اور انہوں نے مسلسل دو سال کی علالت کے بعد انتقال فرمایا۔ میری بڑی ہمشیرہ جوان کی وفات کے وقت پاس کھڑی تھیں اس صدمے کو برداشت نہ کر سکیں اور حرکت قلب بند ہونے کے سبب فوت ہو گئیں۔ چنانچہ باپ اور بیٹی کا جنازہ بیک وقت اٹھا۔ یہ روحانی کرب میرے لیے اتنا شدید تھا کہ میں بھی شریک مرگ ہو گیا ہوتا لیکن قدرت کو ابھی کچھ اور منظور تھا۔ یہاں سے میری زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ وہ روحانی طلسم جس میں اب تک گھرا ہوا تھا ٹوٹ گیا میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا

کی ٹھوس اور بلند دیواریں تھیں جن کا کاٹنا میرے ناتواں اور کمزور بازوؤں کا کام نہ تھا۔ خوش بختی سے مجھے ایسے عزیز میسر آئے جنہوں نے میری زندگی کو سہارا دیا کہ میری ماسیوں اور میری والدہ کی دل شکنیوں میں خاطر خواہ ہاتھ بٹایا لیکن میری مصیبتیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ دوران امتحان میں علیل ہوا۔ اور پورا امتحان نہ دے سکا۔ اس کے دو ماہ بعد والدہ بھی ساتھ چھوڑ گئیں۔ اب وہ زمانہ تھا جب دنیا میرے لئے بالکل بے رنگ تھی۔ زندگی میرے لئے ایک ناقابل عبور خلیج بن کر رہ گئی۔ مجھے ہر دل آویزی سے نفرت ہو گئی۔ دوسرے سال بادل ناخواستہ امتحان میں شریک ہوا۔ اور غنیمت ہے کہ کامیاب ہو گیا۔ لیکن یہ کامیابی ایک اور مصیبت کا پیش خیمہ تھی۔ میں اکیلا تھا۔ مصیبتیں تھیں اور کسی نہ کسی طرح اپنا پیٹ پالتا رہا۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہیں جب ایک وقت کی روٹی بھی غیر مترقبہ سمجھا کرتا تھا۔

اسی زمانہ میں شیخ جوش ملیح آبادی سے تعارف ہوا جنہوں نے ازراہ کرم کلیم کی تحریری کے فرائض میرے سپرد کئے۔ چنانچہ یہی زمانہ میرے لئے قابل قدر رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ قدرت نے مجھے آلام و مصائب کے سپرد کر کے بہت احسان کیا کہ جوہر کو بہت حد تک چمکا دیا ہے۔ اور میں اسی جھٹکا میں ہر شے کو پرکھتا ہوں۔ شعر و سخن کے بارے میں اسی پر اکتفا کروں گا کہ والد شعر کہتے تھے اور گھر میں اکثر اسی کا چرچا ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اگر مجھے ورثے میں ملا ہے تو یہی ذوق شعری۔

سب سے پہلا شعر تو معلوم نہیں کب کہا تھا ہاں پہلی نظم میں نے والد کی وفات پر ۱۹۱۹ء میں کہی تھی پہلی غزل بھی اسی سال ہوئی تھی۔ اس کے بعد طبیعت بہت جلد رواں ہو گئی ۱۹۲۵ء میں تقریباً ہر رات ایک غزل کہہ کر سویا کرتا تھا۔ دلی میں حضرت جوش ملیح آبادی نے میری دو ایک نظمیں دیکھ کر فرمایا "غزلیں کہنا چھوڑ دو نظم کہا کرو" چنانچہ اس وقت سے آج تک نظموں کو ہی حاصل فن سمجھتا ہوں اگرچہ غزل بھی کبھی کبھی کہہ لیتا ہوں۔ مگر اسی وقت جب طبیعت سے مجبور ہو جاؤں۔ میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ میں اپنے دل و دماغ کی صحیح عکاسی کر سکوں۔ لاہور میں مختلف ادبا اور شعراء کی نشست و برخاست سے اور ایک خاص تحریک کی بنا پر میرا رنگ سخن بدل چکا ہے میں اسی زندگی کی شاعری کو حاصل کلام سمجھتا ہوں۔

نمونۂ کلام

اس انقلاب دہر کا کچھ تو خیال ہو — کل وہ ملے تھے تو بہت ہی کم ملے

معیار حسن دل ہے۔ نظر ہے فسانۂ دل — ہم دل کو دیکھتے ہیں جہاں بھی نظر ملے

لینے نگار شوق سے ... سر اٹھا — منزل نہیں تو جادۂ منزل مگر ملے

دورِ حیات میں سے کئے رخصت قرار — ہم کو ترا ستم بھی نصیب [illegible]
شامِ فراق خود ہی گذرتی چلی گئی — ہیں تیرے غم میں [illegible]
یہ کیا ستم ہے تو نے [illegible] تیرا غم — غم ہائے روزگار سے شیر و شکر [illegible]

دن کٹ رہے ہیں اب اسی امید پر ظفر
راحت کے دن [illegible] رہیں گی جو تم [illegible]

تیرے ہوتے مرا محروم [illegible] ہو جاتا — ہو مبارک تجھے ہمدرد کا [illegible] ہو جاتا
میری قسمت میں وہ [illegible] آ جاتی ہے — تا [illegible] تری زلف پریشاں ہو جاتا
ان [illegible] تو کبھی ہم سے ملے دل والا — [illegible] دستِ دعا ہو جاتا
ہم نے اشکوں سے [illegible] — اس طرف بھی کبھی [illegible] ہو جاتا
تجھ سے [illegible] اے دوست — اب جدا ہو [illegible] ہو جاتا
[illegible] — [illegible] دل کی صدا ہو جاتا

تیرے شعروں میں [illegible] ظفر
[illegible] تم نہ خفا ہو جاتا

ملاقات

اب تو [illegible] فراق کے مارے تمام [illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
آنکھوں میں [illegible] — [illegible] بات [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
وہ [illegible] ملاقات [illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]

سراج الدین ظفر

میں ۲۵ مارچ ۱۹۱۲ء کو بمقام جہلم پیدا ہوا۔ میرے والدین نے میرا نام سراج الدین ظفر رکھا چنانچہ مجھے تخلص ڈھونڈنے کی تکلیف نہیں کرنی پڑی۔ میرے والد [illegible] ریلوے میں انجینئر تھے لیکن انہیں ادب سے بھی خاصہ لگاؤ تھا۔ میری والدہ مشہور عالمِ دین مولوی فقیر محمد صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ میرے نانا جان تقریباً ایک سو مذہبی کتابوں کے مصنف تھے۔ پرانے اخبار نویسوں میں ان کا نام مولوی محبوب عالم صاحب پیسہ اخبار والے کے ساتھ آتا ہے۔ وہ سراج الاخبار کے نام سے ایک روزنامہ نکالتے تھے جو تقریباً نصف صدی تک شمالی پنجاب کا واحد اردو اخبار رہا۔ میری والدہ کو ادبی ذوق انہیں سے ودیعت ہوا۔ "زاہدہ" "صدائے جرس" "وادیٔ قاف" اور "لاشوں کا شہر" میری والدہ کی تصانیف ہیں۔

میں نے ۱۹۲۸ء میں میٹرک اور ۱۹۳۰ء میں ایف سی کالج لاہور سے ایف ایس سی کیا اور پھر کالج کی تعلیم چھوڑ کر ہوا بازی کی تعلیم شروع کی۔ اسی سال ناردرن دہلی فلائنگ کلب سے ہوا بازی کا اے کلاس لائسنس حاصل کیا۔ اس وقت میں ہندوستانی مسلمانوں میں شاید سب سے کم عمر ہوا باز تھا۔ اس کے بعد میں نے کمرشل لائسنس حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن والد صاحب کے ناگہانی انتقال کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ اب میں پھر ایف سی کالج میں داخل ہو گیا جہاں سے میں نے ۱۹۳۴ء میں بی اے کیا۔ میرا خیال سیاسیات کا ایم اے کرنے کا تھا لیکن ایف سی کالج کے اربابِ بست و کشاد میری ایک نظم پر جو اسی کالج کے ایک ہوسٹل کے متعلق میں نے ماہنامہ "ہمایوں" لاہور میں شائع کرائی تھی بگڑ گئے اور مجھے مجبوراً لاء کالج کی طرف رجوع کرنا پڑا جہاں سے میں نے ۱۹۳۵ء میں ایل ایل بی کیا۔ اسی اثناء میں میری شادی مولوی فیروز الدین بانیٔ فیروز سنز کی صاحبزادی سے ہو گئی اور میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ اول اول میں نے وکالت شروع کی لیکن جلد ہی اس پیشے سے میری طبیعت اکتا گئی۔ اتنے میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو میں آفیسر کی حیثیت سے ہوائی فوج میں بھرتی ہو گیا اور تقریباً دس برس تک متعدد ذمہ دار عہدوں پر مقرر رہا۔

سنہ ۱۹۵۰ء میں میں نے اس ملازمت کو بھی خیرباد کہا اور اب تجارت کی طرف متوجہ ہوں۔

میں نے شاعری کب شروع کی اس کا مجھے علم نہیں اتنا جانتا ہوں کہ چار برس کی عمر میں اپنے آپ کو شاعر سمجھتا تھا۔ فنون لطیفہ سے محبت مجھے والدہ کی طرف سے ملی ہے یہ ودیعت صرف مجھ تک محدود نہیں میرا چھوٹا بھائی میجر عالمگیر ایک قابل مصور ہے اور اس سے چھوٹا کرنل ہمایوں مصوری کے علاوہ شاعری میں بھی دخل رکھتا ہے۔

میرے کلام کا مجموعہ "زمزمۂ حیات" اور افسانوں کا مجموعہ "آئینے" سنہ ۱۹۶۲ء میں فیروز سنز نے شائع کیا۔ اس کے بعد ابھی تک اور کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

متفرق اشعار

محبت کچھ سہی لیکن یہ شے ہے ۔۔۔ یکے از حادثاتِ اتفاقی

مجھے شاخِ گل نے روکا مجھے آپ جو نے ٹوکا ۔۔۔ کبھی روٹھ کر بہاروں سے ہوا جو میں روانہ
مرے ہاتھ میں سبو تھا تو چمن میں رنگ و بو تھا ۔۔۔ جو چھپا دیا سبو کو تو بہار بھی روانہ
وہ ادھر سے ہو کے گزرے تو یہ حال تھا کہ جیسے ۔۔۔ سرِ راہ میں نے دیکھی ابھی گردشِ زمانہ

سمن بروں سے غنیمت ہے رسم و راہ رہے ۔۔۔ اگر سیاہ ہے فردِ عمل سیاہ رہے
نہ پوچھ عشقِ جلالی کا طمطراق کہ ہم ۔۔۔ جس انجمن میں رہے مرکزِ نگاہ رہے
زباں دراز نہ ہو جوشِ بے خودی میں ظفر ۔۔۔ گدا کو پاسِ ادب روبروئے شاہ رہے

بسوئے ترکانِ کافر کام کرنا ۔۔۔ انھیں بھی مشرف بہ اسلام کرنا
ہزاروں ہیں عشرت کے آئینہ خانے ۔۔۔ ارادہ نیا ایک ہر شام کرنا
محبت کی دشواریاں ہم سے پوچھو ۔۔۔ غزالوں کو آساں نہیں رام کرنا

قطعات

عرش تھم تھم سے شراب اترتے دیکھی ۔۔۔ روح مہر و آفتاب اترتے دیکھی
میخانے کی اصطلاح نہ دیکھی کہ یہاں ۔۔۔ ہر روز نئی کتاب اترتے دیکھی

سودائی دخترانِ بت خانہ ہوں ۔۔۔ شیدائی ہر انجمن و میخانہ ہوں
کیا شور تھا مجکو جھنجھوڑے گا کہیں ۔۔۔ پازیب کی جھنکار کا دیوانہ ہوں

غزل

اٹھو زمانے کے آشوب کا ازالہ کریں
بنامِ گل بدناں رخ سوئے پیالہ کریں

بہار ہو کہ خزاں امتحانِ نالہ کریں
نوائے شوق سے روشن چراغِ لالہ کریں

بلند ہم جو تری یاد میں پیالہ کریں
نسیم رقص کرے عود و چنگ نالہ کریں

بیادِ دیدۂ مخمور ہم پیالہ کریں
اٹھو کہ زہر کا بھی زہر سے ازالہ کریں

وہ رند ہیں نہ اٹھائیں بہار کا احساں
ورودِ ہم تری خلوت میں بے حوالہ کریں

اگر ہو گردشِ شام و سحر سے خدشۂ شر
ہم اس کو دور و بدلتے گردشِ پیالہ کریں

کہاں کے دیر و حرم آؤ ایک سجدۂ شوق
بپائے ہوشربایانِ بسنت سالہ کریں

برس پڑے جو گلستاں میں اس نظر سے شراب
بہک بہک کے ہم آگے سبوئے لالہ کریں

سبو اٹھا کہ گدایانِ کوئے میخانہ
ترے حوالے مہ و مہر کا قبالہ کریں

اٹھو کمندِ نظر ڈال کر گلستاں پر
اسیرِ دامِ محبت کوئی غزالہ کریں

حدیثِ زہد ہو یا وارداتِ زہرہ وشاں
کسی کے نام کو ہم زیبِ ہر مقالہ کریں

دکھا صحیفۂ رخ اس طرح کہ اہلِ بہار
ورق ورق بخجالت بیاضِ لالہ کریں

شررِ طرب ہیں جو دل میں ہمارے آجائے
عروسِ راز کو حاضر سرِ پیالہ کریں

اٹھو جلا کے مئے سرخ سے چراغِ ایاغ
نشاطِ صحبتِ شب کو ہزار سالہ کریں

تلاشِ دوست سحر کو کریں سپردِ نسیم
غزالِ صبح روانہ پسِ غزالہ کریں

حکایتِ رخِ محبوب ہے شراب غلط
بہار ہو تو بیاں وارداتِ لالہ کریں

اٹھا وہ ابرِ بہاراں اٹھو کہ آج اسے
شریکِ کوکبۂ شاہد و پیالہ کریں

ادا وہ بھی نگاہوں کی ہے کہ جیسے ظفر
تلاشِ کنجِ غزالانِ خورد سالہ کریں

عارف — رشید الظفر حیدر قدوائی بارہ بنکوی

۱۹۳۲ء میں پیدا ہوا بالکل اتفاقاً ابھی زندہ ہوں اور جب تک مر نہ جاؤں زندہ رہنے کا ارادہ ہے۔ ابتدائی تعلیم قرآن کریم اور اردو فارسی کی گھر پر مولانا بدرالحسن نگرامی کے زیر نگرانی حاصل کی۔ ذوق شعر انہیں کا فیض اثر ہے البتہ شعر گوئی کی ابتدا حضرت عزیز بارہ بنکوی کی صحبت سے ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول علی گڑھ میں داخل ہوا اور ۱۹۴۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہائی اسکول کیا۔ ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ چھوڑ کر لکھنؤ آگیا اور ۱۹۴۹ء میں کرسچین کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ ۱۹۵۱ء سے [illegible] اورینٹل کالج لاہور میں بی اے کا طالب علم ہوں۔ شعر کہنے سے زیادہ شعر سننے کا شوق ہے اور ادب کے مطالعہ کا اس سے زیادہ۔ اودھ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہونہار ہوں۔ مہاجر ہوں۔

نمونۂ کلام

چارہ گری سے اور رسوا ہو — درد دے اے معبود عطا ہو
ضبط کی آخر حد بھی ہے کوئی — بھول سے تیرا نام لیا ہو
راہِ طلب آسان ہے عارف — چشم کرم گر راہ نما ہو

تیری نگاہ ناز کے صدقے — دل جانے اور بہتر جانے
آئی اجل بھی ساتھ ہی ان کے — آئے جو وہ روٹھے کو منانے
بیتی باتیں بھولی یادیں — ماضی کے رنگین فسانے
آنکھ ہے ظالم کی بھی پُرنم — چھیڑے کس نے دکھ کے ترانے

عارف حجازی حیدرآبادی

سن پیدائش ۱۹۳۲ء وطن حیدرآباد دکن ہے دو شعر پیش کرتا ہوں

مجھے بجلی کا خطرہ کیا چمن میں — کہ بجلی بھی چراغِ آشیاں ہے

رواں ہے کاروانِ زیست عارف
مگر اب دیکھیے رکتا کہاں ہے

عارف جلالی

سالِ پیدائش ۱۹۳۲ء

شعورِ کائنات ابھی کہاں کسے ابھی جہاں
ستارے توڑ کے لاؤ کہ پھول برساؤ

شہید راز سلسبیل و حور و کوثر و جناں
مگر یہ بات سچ ہے کہ آدمی کہلاؤ

محمد عالم

میری سن پیدائش ۱۹۳۱ء ہے صرف ایک شعر سن لیجئے

سلامت رہے میری فکرِ نشیمن
کہ خود ہی بربادیٔ آشیاں ہے

عابد گیلانی

عابد گیلانی کے نام سے ادبی حلقوں میں معروف ہوں۔ جائے پیدائش ڈومیلی جہلم ہے اور وہیں پر پروان چڑھ کر بلوغت کو پہونچا ہوں۔ عمر کے اعتبار سے ۱۷ جنوری ۱۹۵۲ء کو پورے اٹھارہ سال کا ہو گیا ہوں۔ تعلیم کچھ اتنی زیادہ نہیں کہ واجب الذکر ہو۔

میری شاعری کسی خاص صفت سے متصف نہیں ہیں۔ طبعاً رومانی ہوں اور ROMANCE کو زندگی کا ایک اہم جز تصور کرتا ہوں۔ میرے نزدیک عشق نہ ہوا اور نہ تقدس ہی کا نام زندگی نہیں۔ میری شاعری جہاں زندگی اور خیالات کا ایک الجھا ہوا نوحہ ہے وہاں "رومانس" اور خیالات کا ایک دلچسپ حادثہ بھی ہے۔

نمونہ کلام

سفیروں کے مقابل کون آہن بن کے تنتا ہے
زمانہ کب اخوت کا علمبردار بنتا ہے
شہنشاہی کے پیمانے تو نہیں توڑ سکتا ہے!
جو مظلوموں کی خاطر قیصری کو چھوڑ سکتا ہے
تمنا ہی نہیں تاروں بھرے ان آسمانوں کی
جہاں کے پاسبانوں کی خدا کے رازدانوں کی
محبت کی نظر سے دیکھتا ہوں ناتوانوں کو
رسائی عرش تک ہے جن کے پاکیزہ ترانوں کی

عاقل

سید محفوظ حسین جعفری

سید محفوظ حسین جعفری نام "عاقل" تخلص اور جعفری خاندانی نسبت ہے والد ماجد کا اسم گرامی سید شمشاد حسین جعفری اور جائے پیدائش میرٹھ (یو۔پی) ہے

دو شعر ملاحظہ فرمایئے

جنونِ عشق میں ہم سے جو ہم کلام ہو تم   قسم خدا کی حقیقت میں اک پیام ہو تم

فضا میں چھو نہ سکیں گی خیال کا دامن

جہاں پہ منتظر دید صبح و شام ہو تم

عنبر

حکیم عبدالرشید خاں

سلسلۂ خاندان یکجدی راجگان ناہپارہ سے ہے۔ میرے مورث اعلیٰ خان رسول خاں کو شاہجہاں نے علاقہ ناہپارہ تفویض کیا تھا۔

میرے والد کا اسم گرامی عبدالرؤف خاں تھا جو ساری عمر سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔

میں نے طبیہ کالج لکھنؤ سے ۱۹۲۲ء میں سند تکمیل طب حاصل کی اور کانپور لکھیم پور اور سیتاپور وغیرہ میں مطب کرتا رہا۔

سنہ ۱۹۵۱ء میں پاکستان آ گیا ہوں

مجھے مستقیم خیرآبادی سے جو کہ امیر مینائی رح کے شاگرد رشید تھے شرف تلمذ حاصل ہے نمونۂ کلام پیش کرتا ہوں۔

جو موج کبھی اٹھی مرے سر سے گذر گئی — نذرِ بلا ہوئی مری کشتی جدھر گئی

ان کی نگاہِ ناز عجب کام کر گئی — دل میں ہزار بار مرے ارمان بھر گئی

پایا تجھی کو میں نے ہر اک شے میں جلوہ گر — دنیا کی وسعتوں میں جہاں تک نظر گئی

جینا غم کی بس یہی وجہِ حیات ہے — ہر چند ان کا جور کاوشِ دردِ جگر گئی

وہ مہرباں ہوئے کبھی تو کب مہرباں ہوئے — ٹپکی جب آئے آنسو شبِ غم ٹھہر گئی

مجبوریوں کا نام زمانے میں صبر ہے — جب قید ہو گئے ہوسِ بال و پر گئی

کیا پوچھتے ہو اس کے نشیمن کا ماجرا
جس کی تمام عمر قفس میں گذر گئی

رحم آئے گا جب ان کو تو بیداد کریں گے — اس طرح وہ ہستی مری برباد کریں گے

خوں روتا ہوں بلبل کے اسیرانِ قفس ہے — جب سنتے ہو سنا ہے مجھے آزاد کریں گے

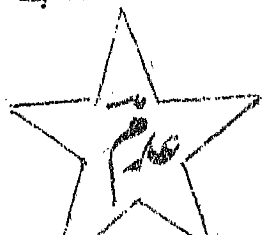
ناکامیٔ امید پہ رو لینے دے مجھ کو
پھر دفن تجھے اے دلِ ناشاد کریں گے

شبِ غم میں کوئی انیس نہیں — اک نفس ہے کہ آئے جاتا ہے

ہو چکے ختم امتحان حدود — پھر بھی وہ آزمائے جاتا ہے

منزلِ عشق کچھ نہیں آساں — ہر قدم ڈگمگائے جاتا ہے

عشق کی آبرو ہے یا رب اب
وہ مجھے آزمائے جاتا ہے



سید عبدالحمید

آپ ... موسیٰ خاں ڈگو گوجرانوالہ میں پیدا ہوا۔ نام عبدالحمید رکھا گیا ...
[illegible]
اس لئے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد فوجی ملازمت میں منسلک ہو گیا

لیکن پیشہ آبا سپہ گری "ہونے کے باوجود" شاعری ذریعہ عزت نہیں ۔

میں پیدا تو گوجرانوالہ میں ہوا لیکن پرورش لاہور میں ہوئی۔ اس لئے لاہور کی گلیوں سے محبت ہے۔

شعر کہنا میری سرشت میں داخل ہے۔ بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے دنیاداری کی قبا اوڑھے ہوئے ہوں۔ لیکن جب کبھی تصورات میں کھو جاتا ہوں تو مجھے اکثر ہنسی آجاتی ہے میں کیا ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔ بے صورت زندگی کی منزلیں طے کئے جا رہا ہوں۔

میں نے شعر و شاعری کے میدان میں جب قدم رکھا تو بہت سی دشواریاں پیش آئیں۔ پامال زمین پر چلنے سے مجھے دکھ ہوتا تھا۔ نئے قافیے ذہن میں موجزن تھے لیکن اسکے لئے ابھی زمین تیار نہیں ہوئی تھی

شاعر خصوصاً نوجوان شاعر دنیا والوں کو ایک پیغام دیتا ہے۔ وہ پیغام کیا ہے؟ زندگی اور موت کے درمیان انسان کے لئے ایک ایسا وقفہ ہے جس میں زندگی کو عروج پر پہنچانے کے لئے شاعر کو اپنے قلم کی ساری طاقتیں ایک مرکز پر جمع کر دینی چاہئیں تغزل ایک حد تک شاعری کی جان ہے لیکن صرف اسے ہی شاعری کا مطمح نظر نہیں ہونا چاہیے

مجھے شرف تلمذ کسی سے حاصل نہیں استادی شاگردی کو اپنانا سے ہی میں ایک مہمل چیز سمجھتا ہوں۔ نہ میں نے کوئی استاد بنایا اور نہ کوئی میرا شاگرد ہے۔

مستیٔ چشم غزالاں ہے صراحی میری — غیرت چشمۂ حیواں ہے صراحی میری
اس کی قلقل میں چھلکتے ہیں بہاروں کے لہو — نغمۂ جوشِ گلستاں ہے صراحی میری
کوہ غم روک نہیں سکتا روانی اس کی — ایک بہتا ہوا طوفاں ہے صراحی میری
کس مسرت سے پریشاں ہیں اندھیرے شب کے — کس محبت سے فروزاں ہے صراحی میری
ساز بجتے ہیں ہوا چلتی ہے رنگ اڑتے ہیں — اس طرح سلسلہ جنباں ہے صراحی میری
مخزن حسن حقیقت ہے تغزل میرا — پرتو رحمت یزداں ہے صراحی میری
بھید بڑے بڑے خاموش ہوا ہوتے ہیں — طائر گلشن عرفاں ہے صراحی میری

آج محسوس کچھ ایسا مجھے ہوتا ہے عالم!
جیسے اک فرصتِ رقصاں ہے صراحی میری

مجھے بدگمانی نہیں ساز سے — شناسا ہوں میں تیری آواز سے
اگر چھیڑنی ہے کہانی مری — تو پھر چھیڑنا اس کو آغاز سے
فضا اتنی محدود تھی باغ کی! — ندامت ہوئی ذوقِ پرواز سے
مغنی! مری روح ویران ہے — مجھے پھونک دے اپنی آواز سے
نہیں دور ہوتا دلوں کا ملال — مگر تیری آنکھوں کے اعجاز سے
ہم آشفتگانِ ازل کا مزاج — سمجھ لو طبیعت کے انداز سے

نہ جانے عدم میرے وجدان کا
تعلق ہے کس گلشنِ راز سے

آرٹ

آنکھوں کو چاندنی میں ملایا ہے بارہا — وجدان کا نقاب اٹھایا ہے بارہا
نازک سی اک لکیر میں سوچیں ڈال کر — موسیقیوں کا رقص دکھایا ہے بارہا
بجھتے ہوئے نقوش کی تابانیوں کے لئے — ادراک کا چراغ جلایا ہے بارہا
آتے ہیں غیب سے جو حسیں خیال ہیں — ان گیسوؤں کو دل میں بسایا ہے بارہا
لیکن ہنوز شوق کی شدت ہے برقرار — گو دل کی تشنگی کو بجھایا ہے بارہا
قحطِ سکوں ہی ذوقِ نظر کا ثبات ہے — آشفتگی وطیرۂ زلفِ حیات ہے

موت بھی نیند کا بہانہ ہے — نیند آجائے تو برا کیا ہے
موت نادم نہ ہو عدم آکر — زیست کے پاس اب رہا کیا ہے

قطعات

ہوائیں ٹھنڈکیں برسا رہی ہیں — فضا میں تتلیاں لہرا رہی ہیں
مجھے ان گرمیوں کی دلکشی سے — پرانی گرمیاں یاد آ رہی ہیں

کہتے ہیں جس کو زیست وہ رنگین حادثہ — زہراب و انگبیں سے بھرا ایک جام ہے
یزدان و اہرمن کی تو کوئی خبر نہیں — انسان ایک تلخ حقیقت کا نام ہے

عزیز احمد

میرا نام عزیز احمد ہے میرے والد نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل مرحوم تھے شاعری کا ماحول شروع سے ملا ابتدا میں غزلیں کہیں پھر نظموں کا شوق ہوا غزل اور نظمیں دونوں لکھیں انگریزی افسانوں کو اردو کا جامہ پہنانا میرا دلچسپ مشغلہ ہے۔ مقام پیدائش حیدرآباد دکن ہے اور اب میری عمر ۳۵ سال ہے۔

گزارش

میرے اشعار کو رنگیں بنا کر — تخیل کو مرے گلچیں بنا کر
مرے ہر لفظ کو پردیں بنا کر — سراپا مجھ کو وجدآگیں بنا کر
بھلا دو شوق سے مجھکو بھلا دو

مجھے فردوس کے جلوے دکھا کر — نیاز و ناز کے پردے اٹھا کر
مجھے نغمات لاہوتی سنا کر — انہیں تانوں کی موجوں میں سلا کر
بھلا دو شوق سے مجھکو بھلا دو

مری ہر آرزو کو دل بنا کر — نگاہ حسن کے قابل بنا کر
جہان درد کا حاصل بنا کر — ہمیشہ کے لئے بسمل بنا کر
بھلا دو شوق سے مجھکو بھلا دو

حریم ناز میں مجھکو بلا کر — کوئی دم اپنے پہلو میں بٹھا کر
لب رنگیں سے میخانے پلا کر — مجھے سارے زمانے کو بھلا کر
بھلا دو شوق سے مجھکو بھلا دو

پس پردہ

مری نظروں نے جو تم کو پیام بھیجا تھا — مریض درد محبت کا نام بھیجا تھا

مری امیدوں کا لہو جس پہ چھپا کر بھیجا تھا — بصد نیاز جو میرا سلام بھیجا تھا

قبول بارگہ ناز میں ہوا کہ نہیں!

کچھ ارتعاش ابھی ساز میں ہوا کہ نہیں

کہو تمہاری بھی کیا یونہی غیر حالت ہے — خدا نخواستہ ناساز کیا طبیعت ہے

بہار حسن کی بدلی ہوئی جو رنگت ہے — یہ کیا ہے پھر تو تمہیں بھی کسی سے الفت ہے

کلی کلی کو ہنسی آ رہی ہے گلشن میں!

صبا کی چھیڑ شگفتہ بہار ہے گلشن میں

طبیعتوں میں نیا انقلاب ہے کہ نہیں — نئی امنگوں پہ رنگیں شباب ہے کہ نہیں

ادا ادا سے عیاں اب حجاب ہے کہ نہیں — کہو تو میری نظر کامیاب ہے کہ نہیں

ستارۂ صبح کا شرما رہا ہے آپ ہی آپ

اسے بھی آج حجاب آ رہا ہے آپ ہی آپ

تمہارا حسن بھی کروٹ میں بدلتا ہے — کہ جیسے سبزۂ خوابیدہ آنکھ ملتا ہے

دبا ہوا کوئی آتش فشاں ابلتا ہے — چراغ ہستی ناشاد جس سے جلتا ہے

شباب دیکھنے کی دنیا میں ہے ارزانی؟

کوئی تو بات ہے جس کی یہ پردہ داری ہے

غزل کے چند اشعار

دل میں غارت گر صد ہوش نظر آتے ہیں — چشم ادراک سے روپوش نظر آتے ہیں

مست کل مست تقاضا مست ہوا کرتے ہیں — مست سب [illegible] بردوش نظر آتے ہیں

درد سے آشنا ہوا ہے جگر

غم دل کا نشانہ ہے ہستی

عزم
غلام حسنین خاں بنارسی

رودادِ عمر سخن نوازی ہے حقیقت پہ
فرہاد کا قصہ کیا افسانہ پھر افسانہ

دنیائے شاعری میں مجھے عزم بنارسی کے لقب سے یاد فرمایا جاتا ہے۔ میرا نام غلام حسنین عرفیت امراؤ ہے۔ ماہ اکتوبر ۱۸۹۵ء میں بنارس کے ایک شریف گھرانے میں پیدا ہوا۔ اردو فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی اور ۱۹۱۰ء میں انٹرینس پاس کر کے عدالت ججی بنارس میں ملازمت کر لی سنہ ۱۹۱۰ء میں پولیس ٹریننگ اسکول مرادآباد بھیجا گیا۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۱ء تک سب انسپکٹر پولیس کی خدمت انجام دیں۔ پولیس کی ملازمت کے ابتدائی دور میں بغرض حصول تعلیم اردو شارٹ ہینڈ رپورٹنگ پیپرن کالج لکھنؤ بھیجا گیا جہاں سے امتیازی کامیابی حاصل کی جس کی بنا پر سی آئی ڈی الٰہ آباد کے لئے جو نو رپورٹران منتخب ہوئے ان میں میرا انتخاب بھی فرمایا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں جب کہ تحریک خلافت ترک موالات شروع پر تھی علمائے کرام کے فتاوے شائع ہوئے کہ پولیس اور فوج کی ملازمت حرام ہے جس کی تائید و اتباع میں اپنی گیارہ سالہ ملازمت سے مستعفی ہو گیا۔ کچھ زمانہ اخبار انڈیپنڈنٹ الٰہ آباد اور سینٹرل خلافت کمیٹی بمبئی میں بحیثیت قومی رپورٹر خدمت انجام دیں۔ ازاں بعد اپنے وطن بنارس میں تجارت کا سلسلہ اختیار کیا جو قریب سات سال تک جاری رکھا مگر بخت کی نارسائی سے کافی نقصان اٹھانے کے بعد اسے ختم کرنا پڑا۔ اور بہ مجبوری ریاست بھوپال میں دفتر لیجسلیٹیو کونسل میں اردو شارٹ ہینڈ رپورٹر کی خدمات قبول کیں اور خدمات کی بدولت دفتر مذکور کی ہیڈ کلرکی تک ترقی پائی۔ خاکسار کی تحریک پر گورنمنٹ بھوپال نے ایک شعبہ تعلیم اردو شارٹ ہینڈ قائم فرمایا۔ اور شکر ہے کہ خاکسار کی مساعی سے سات آٹھ طلبا اسمیں پاس ہو کر اور تجربہ سے کامیاب ہو کر نکلے۔ علاوہ دفتر لیجسلیٹیو کونسل کے چھ سات سال تک خاکسار نے معلم اردو شارٹ ہینڈ کی خدمات انجام دیں . . . .

ریاست بھوپال حکومت ہند کے حوالہ ہو جانے پر محکمہ ایجوکیشن کونسل شکستہ کر دیا گیا۔ اور ملازمان کو سبکدوشی کا نوٹس دیدیا گیا۔ اور ماہ اگست ۱۹۴۹ء میں مجھے اٹھارہ سال کی ملازمت پر عطائے انعام سبکدوش فرما دیا گیا جس کے بعد قریب دو سال کا زمانہ میں نے بھوپال بنارس اور ضلع مرزاپور میں گذارا۔ اور ماہ اکتوبر ۱۹۵۱ء چھاگا نگر سے اپنے فرزند محمد رضا خاں بی۔ اے۔ ریلوے گارڈ خانیوال جنکشن کے پاس چلا آیا ہوں شعر و سخن کا شوق مجھے اوائل عمری ہی سے تھا۔ ابتدا میں بنارس کے مشہور و معروف استاد جناب مرزا محمد حسن صاحب فائز سے شرف تلمذ حاصل رہا اُن کے بعد اپنے حقیقی ماموں نادر بلا جناب خواجہ غلام محمود رضا اقبال بی۔ اے وکیل بنارس سے فیض حاصل کرتا رہا حضرت داغ مرحوم کے رنگ شاعری کا زیادہ گرویدہ ہوں۔ اپنی چند غزلوں کے دو دو شعر بطور نمونہ حاضر ہیں۔

فصل خزاں میں شکر ہے آئی قضا مجھے — شرمندہ بہار نہ ہونا پڑے مجھے
اس وقت پوچھتے ہوں محو بے خودی — پھر کچھ نہ کہہ سکوں گا جب ہوش آگیا مجھے

وہ آئے کب کہ لحد میں پڑا ہوا ہوں میں — نصیب جاگ اٹھا ہے تو سو رہا ہوں میں
وہ دن کہاں گئے اکثر یہ سوچتا ہوں میں — بدل گیا ہے جہاں یا بدل گیا ہوں میں

اس طرح خوش ہیں ہم اپنی خانہ ویرانی کے بعد — جیسے حاصل ہو کوئی شے سعی امکانی کے بعد
عزم مرگ نامرادی پر عبث مغموم ہو — ایک عالم اور ہے اس عالم فانی کے بعد

لمحہ کوئی جہاں میں نہ گذرا خوشی کے ساتھ — مرنے کی آرزو بھی رہی زندگی کے ساتھ
کیا ذکر مہر مہر سے بھی دیکھتے نہیں — لو دشمنی بھی ختم ہوئی دوستی کے ساتھ

مجھے ہو کبھی مسرت کوئی دل لگی نہ سمجھو — میں جنوں میں ہنس رہا ہوں اسے تم ہنسی نہ سمجھو
مرا سکوت پیہم بھی ہے اک فسانۂ غم — نہ کہوں اگر زباں سے اسے خامشی نہ سمجھو

لیا کرتا ہوں ضبط درد و غم کا امتحاں اکثر — میں دہراتا ہوں دل ہی دل میں اپنی داستاں اکثر
نہیں کچھ منحصر تم پر وطن سے بے وطن ہونا — ہوئے ہیں بے مقدم راہ محبت میں بے خانماں اکثر

چمن اپنا ہے گل اپنے ہیں اور فصل بہار اپنی — نہیں کھلتا کہ پھر کیوں ہے طبیعت بیقرار اپنی
ہمیں کب آنسوؤں کے پونچھنے کا ہوش آیا ہے
جنوں میں ہو چکیں جب آستینیں تار تار اپنی

عشرت رحمانی

"اپنی گورا پئے لگا رہے" مثل مشہور ہے۔ غالباً "ایڈیٹر صاحب پرچم" نے اس قدیم مثل کو شعرائے پاکستان پر آزمانے کا بیڑا اٹھایا ہے

یعنی شعراء کے خود نوشت حالات اور بقلم خود انتخاب کلام اس سلسلہ میں شائع کئے جارہے ہیں

باضابطہ شعراء کو تو خیر التزاماً شامل کیا گیا ہے لیکن چند بے ضابطہ شعراء کو شاید احتیاطاً اس بزم میں شریک کیا جارہا ہے۔ اور مؤخر الذکر صف میں خاکسار بھی ہے۔

یوں تو میں اپنی شاعری کی عمر کا اندازہ لگاتا ہوں تو خیر سے ۲۵ برس سے اوپر ہے سلور جوبلی تو ماشاء اللہ منا سکتا ہوں۔ مگر منوانا" سخن دریں است" دیوان خانہ کو دیکھئے۔ تو چند چھوٹی بڑی اینٹوں اور روڑوں کے ڈھیر نظر آئیں گے۔

چشم بد دور میرا تذکرہ صحیح معنوں میں تو مکمل ہو گیا۔ اب رہا شاعرانہ مبالغہ تو دیوان ابھی لکھا ہی نہیں جو کسی بزرگ سے درخواست کروں کہ حضور مقدمہ درپیش ہے۔ دیباچہ فرما دیجئے۔ اس وقت شاید وہ ازراہ ترحم فرمائیں کہ "عشرت رحمانی" نے سات آٹھ یا شاید دس سال کی عمر میں پہلا شعر کہا تھا اور سالہا سال سے مشق سخن جاری ہے۔ دس بارہ دیوان لکھے مگر طبیعت میں انکسار تھا سے تجاوز کر گیا چنانچہ خاندانی شرافت کے نام پر نذر آتش کر کے بزرگوں کا نام روشن کیا۔

مگر غرض یہ ہے کہ جہاں تک میرے شاعرانہ کمالات کو دخل ہے اس میں کسی ایسی روایت کی نوبت نہیں آئیگی میرے پاس بیاض وغیرہ نہیں حافظہ بہت کمزور ہے شعرائے متقدمین و متاخرین کے بیشمار دیوان مطالعہ میں رہے۔ دوسروں کے اچھے شعر اکثر یاد رہتے ہیں۔ لیکن ایک غزل بھی پوری یاد نہیں"

جہاں تک مجھے یاد ہے ۱۹۲۶ء سے طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل ہوئی۔ علم زیادہ

اور "عمل کم" کا قائل رہا۔ شاعری میں استادی شاگردی پر اعتقاد کبھی نہ ہوا۔ اب چاہے عیب شاعری میں "بے دین" سمجھ لیجئے چند مخصوص دوستوں سے صلاح مشورے کا قائل ہوں۔ غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی نئی بحروں میں بھی اور بے قافیہ بھی مگر چونکہ نظم کہنے کی مناسبت کبھی نہ ہوئی گیت بھی کہے لیکن وہ دے لیے نہ کہہ سکا کئی فلموں میں میرے چند گیت میری اجازت کے بغیر گائے گئے اور گائے جا رہے ہیں۔ ڈائرکٹروں نے مجھ سے رجوع نہ کیا یہ ان کی خوشی یا ہمت ـــ میں نے ان پر کوئی دعویٰ نہ کیا یہ میری مرضی یا حماقت غرض کہ ہر صنف سخن میں ذوق کی رعایت سے طبع آزمائی کرتا رہا مگر شاعر ہونے کا مدعی نہیں۔

بہرحال مجھے شعر کہنے سے زیادہ دوسروں کے اچھے شعر سننے پڑھنے اور انھیں سمجھنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔

میرے گیتوں کے دو مجموعے "میرے گیت" اور "تیرے گیت" ادارہ ساقی بک ڈپو سے شائع ہو چکے ہیں۔ اور ایک مختصر مجموعہ بچوں کے گیتوں کا "ہمارے گیت" کے نام سے [illegible] سے شائع ہوا ہے۔ ان کے علاوہ جس قدر غزلیں نظمیں وغیرہ کہی ہیں وقتاً فوقتاً سب کی سب مختلف رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ نثر میں مختلف موضوعات پر ڈھائی درجن سے اوپر مطبوعہ تصانیف ضرور ہیں۔ باقی خیریت ہے"۔

تنقید نگاری کی طرف زیادہ توجہ رہی اور ممکن ہے دوسروں کے کلام میں بال کی کھال نکالتے نکالتے اپنی بے بال و پری کا احساس زیادہ قوی ہو گیا۔ اس لئے خود [illegible] زیادہ گو نہ بن سکا۔

اوائل عمر میں مشاعروں کی محفلوں میں اکثر شریک ہوتا رہا۔ ہند و پاکستان کے بڑے اچھے اور بڑے شاعر کے ساتھ اپنی یاد آوری پر اترانے کی جرأت نہیں۔ اب دس سال سے ہنگامی مشاعروں سے خائف ہوں۔ مشاعروں کی مجالس میں اپنے ناز و انداز دیکھتے ہیں کہ اگر کو افسانے مرتب کروں تو مشاطۂ سخن کو حجاب آنے لگے

یہ چند سطور تذکرۃً لکھ دیں تاکہ سند رہیں اور "شاعری کا رسیا کاراں" اساتذہ کے طور پر کام آئیں۔

اب رہا انتخاب کلام کا معاملہ تو شعروں کے انتخاب سے رسوائی اس لئے گوارا ہے کہ قارئین کی متذکرہ بالا "گزارش واقعی" کی سند بھی مل جائے ورنہ یہ نہیں کہ شاعری کو نبھا نہ

ایک افسانہ سے زیادہ نہیں سمجھتا اور وہ بھی

اک حرفِ آرزو کا افسانہ بن گیا ہے!

یا ؏ اک تبسم ہے کسی کا راز دارِ زندگی

لیجئے غزلوں کے چند اشعار حاضر ہیں :

ان کی نگاہوں میں حیا کی کشمکش
مژدہ اے بیتابیٔ دل راز افشا ہو گیا

دل کی ہر جنبش علیم بس دار کیفیات ہے
تیرا ہلکا سا تبسم بھی فسانہ ہو گیا

میری فطرت ہے مرا مائلِ عصیاں ہونا — دیکھنے والے ذرا دیکھ کے حیراں ہونا
داستانِ دلِ ناشاد سنا دوں لیکن — کون دیکھے گا ترا سر بہ گریباں ہونا
میں تجھے وعدہ فراموش کہوں اے توبہ — میں نے دیکھا نہیں کیا تیرا پشیماں ہونا
دستِ گستاخ ہے اور جوشِ جنوں کی تائید — اب گریباں کو مبارک ہو گریباں ہونا
چمن سے تا بہ قفس مستقل نشیمن ہیں — جہاں جہاں مری قسمت کو آب و دانہ ملا
نغماتِ ترنم میں اندازِ تبسم میں — اک شانِ شریف آگیں ہر پا نظر آتا ہے!

ہنستا ہے زمانہ کیوں دیوانۂ الفت پر
کیا بات نئی دیکھی داماں و گریباں میں

ہے ابھی دنیا کو انساں کی تلاش — صاف کہتی ہیں یہ دنیا داریاں

در پئے آزارِ قسمت ضبط سے بیگانہ ہم
تا بہ کے آخر نہ کہتے عشق کا افسانہ ہم

دلربائی کی ضرورت ہے نگاہ جانستاں
تیری بزمِ ناز میں لائے ہیں اک دیوانہ ہم

ہر قدم پر جوششِ مستی رنگِ میخانہ بنا
کھو چکے اب احترامِ لغزشِ مستانہ ہم

چشمِ میگوں نے کبھی ڈالی تھی دزدیدہ نظر
جب سے آنکھوں میں لئے پھرتے ہیں اک میخانہ ہم

بزمِ انجم منتظر ہے دم بخود ہے کائنات
دیکھ کس کس کو سناتے ہیں ترا افسانہ ہم

فطرتِ غم دوست عشرت ہو سکی کی حریف
اجتناب اس سے رکھتے ہیں بنایا عشرت خانہ ہم

دکھا دیتے ابھی محفل سے اٹھنا مگر محفل سے اٹھ جانے کا ڈر ہے

پھر دل پر شوق ہے منت گزارِ زندگی
پھر تبسم ہے کسی کا رازدارِ زندگی!!!

اے خوشا وہ دل کہ جس کا مدعا کوئی نہیں
بے نیاز آرزو ہے کامگارِ زندگی

دنیا والو مفلس کی حالت پر کیا ہنستے ہو
اس کی ہستی کچھ نہ ہی دنیا کی کیا ہستی ہے

زندگی اور موت ہیں تھی جس کے دم سے کشمکش
ایک ہچکی میں مکمل وہ فسانہ ہو گیا

ان کی دزدیدہ نظر کو کچھ نہ سمجھے اہل بزم
میری بیتابی کا لیکن اک فسانہ ہو گیا

مل کے بچھڑ گئیں ہم سے نظریں بن کے مقدر پھوٹ گیا
ان کے ہاتھوں کھیل میں آخر دل کا کھلونا ٹوٹ گیا

تم سے شکایت کس کو ہے سمجھ کر بیٹھے دو کچھ بات بھی ہو
میں نے باندھا عہد محبت تم نے توڑا ٹوٹ گیا

وہ گزر رفتہ نگاہِ دل فریب | تا بکے آخر یہ دنیا داریاں
ہر قدم پر ایک منزل بن گئی | کام آ نہیں راہ کی دشواریاں
کانپ جاتا ہے دلِ انجام بیں | دیکھ کر امید کی دلداریاں
سرفرازی سر کے جھکنے کا ہے نام | ہے نیاز دار ہیں سرداریاں

جسے اہل چمن نے آج تک آنکھوں میں رکھا تھا
وہ حسن بے محابا ہر رگ گل سے نکل آیا!!!

خدا شاہد ہے کہ کمبخت کو دل کی توقع تھی
مگر دزدیدہ نظروں کے توسل سے نکل آیا

سمایا رنگ و بو بن کر حجابِ لالہ و گل میں!
کمالِ حسنِ فطرت شوقِ بلبل سے نکل آیا

پرستش نے بہت رنگینیاں بھر دیں محبت میں
خدا بن کر کوئی میرے تخیل سے نکل آیا

میری حیرت میں نظر آئے تمہاری تصویر
پردہ در آج اگر دیدۂ حیراں ہو جائے

زلفِ پُرپیچ کے بل ہیں میری تقدیر کے بل
میری مشکل نہیں ایسی کہ جو آساں ہو جائے

عیش و نشاطِ آرزو خونِ حیاتِ آرزو
وہ بھی مرا شباب تھا یہ بھی مری بہار ہے

جب اپنی دھن ہے اپنی طلب اپنا راستہ
پھر کیوں تلاشِ نقشِ کفِ پا کرے کوئی

پہلے سمجھ لے فرق نیاز و نماز کا
پھر جلوہ گاہِ حسن میں سجدہ کرے کوئی

حاصلِ ذوقِ عبودیت دلِ دیوانۂ عشق — سر بسجدہ تھا مگر سجدہ کا ذرا ہوش نہ تھا
چشمِ مخمور میں معصوم ادائیں کیا تھیں — پوچھ اس مست سے دنیا کا جسے ہوش نہ تھا
ہاں مجھے بزمِ تصور کی خبر اتنی ہے — تم جس آغوش میں تھے وہ مرا آغوش نہ تھا

محبت کے ہاتھوں عجب دکھ اٹھایا
نہ کچھ ہم نے کھویا نہ کچھ ہم نے پایا

حاصلِ امید دانستہ تغافل ہی سہی — آپ نے کچھ تو دیا میری محبت کا جواب
آئینہ ہوں میں تری حسن تحیر خیز کا! — تیری صورت میں ہے گویا میری صورت کا جواب

جھک گئیں کیا دلربا ہیں شوق کے احساس سے
کتنا دلکش تھا حیاؤں میں محبت کا جواب

تم کہ تسکینِ جان و دل ٹھیرے		نگہ جانستاں کو کیا کہئے

چھپائے سے کہیں چھپتا ہے رازِ الفت کا!
کہ کھوئے جاتے ہیں ہم اور وہ پائے جاتے ہیں

دیکھ وارفتہ نہ کر دے حیرت بے چارگی!
اے نگاہِ شوق چھٹ جائے نہ دامانِ جمال

رنگ دبوئے آب و گل ہیں گل کھلا کر رکھ دئے
خاک کے ذرّوں میں دیکھے کوئی طوفانِ جمال

حسن کی تعریف کر دی آہ میں نے کیا کیا
داستانِ آرزو کہہ دی بعنوانِ جمال

اپنی گذر رہی جائے گی لیکن یہ صبح و شام		گردش میں ہیں اسیر بچاروں کو کیا کروں

اٹھنا نگاہِ ناز ذرا دیکھ بھال کے
دل آرہا ہے شوق فدا واں لئے ہوئے

جفائے خاص اک تمہید ہے رسمِ محبت کی
کوئی کیوں مہرباں ہونے لگا نامہرباں ہوکر

نگاہِ شوق پہونچی جلوہ گاہِ ناز تک لیکن
تحیّر رہ گیا آخر حجابِ درمیاں ہوکر

ذرا میں بھی تو اپنی بے کسی کی قدر پہچانوں
اگر اے چارہ گر کچھ چارۂ دردِ نہاں ہوکر

کبھی کے دن بڑے تھے اور اب راتیں بڑی یا رب
اسی شام و سحر میں عمر ساری کٹ گئی میری

ابھی تک ہے وفا کا حوصلہ اے وائے ناکامی!
خداوندا یہ رسمِ عشق ہے یا بندگی میری

شمع نے جل کر رات عجب اک بات کہی پروانے سے
رونقِ محفل ختم ہوئی ہے ایک ترے جل جانے سے!

وہ تو کچھ اپنے طرزِ ستم پہ نازاں نے کو جی چاہا!
ورنہ کیوں سنتے دلچسپی کیا تھی میرے افسانے سے

چپہ چپہ رشکِ جنت ذرّہ ذرہ میخانہ
گلشن گلشن دورِ بہاراں ایک ترے آجانے سے

اداسیاں یہ بکھیری ہیں کس نے راہوں میں
یہ کون لوگ تری رہ گذر سے گذرے ہیں
شکایت نہیں برسبیلِ حکایت سنیں تو اے آسماں اور بھی ہیں
محبت ایک دلکش خواب ہے عہدِ جوانی کا
مگر اس خواب کی تعبیر ملتی ہے مقدر سے

میری وفائیں ان کی جفائیں دونوں کا انداز ہے ایک
رسوا رسوا دونوں ہیں اور کوئی بھی بدنام نہیں

کلیوں کی پامالی کا ہے نام جہاں میں جشنِ بہار
پھول یہ کھل کھل کر کہتے ہیں فیضِ بہاراں عام نہیں

خردشکار دوانے کے کام کیا آتے دیارِ عشق میں یاروں نے ساتھ چھوڑ دیا
بساط بھر تو سہے داغ صحبتِ شب کے
نظر چرا کے ستاروں نے ساتھ چھوڑ دیا
تاروں کی کہانی یاد کریں یا دل کا فسانہ دھرائیں
گذری ہوئی چاندنی راتوں پر شبنم کے موتی برسائیں

وہ رات سہانی کیا بیتی عشرت کی کہانی ختم ہوئی
اے گردشِ دوراں تو ہی بتا کس طرح سے دل کو بہلائیں
پھر اسی شان سے تکلیفِ تبسم فرما!
آسماں از سرِ نو آج رلاتا ہے مجھے

عکس

محبوب عالم

لوگ کہتے ہیں کہ شاعر پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا۔

شاید اسی اصول کی بنا پر میں بچپن میں بڑے شوق سے ٹوٹے پھوٹے لفظوں کو نظم کیا کرتا تھا۔ اس وقت (ریاست) رامپور جو کہ میری جائے پیدائش بھی ہے، کے ادبی ماحول میں امیر و داغ کی شاعری کا چرچا۔ غالب کے ندرت بیان کا ذکر اور جوش و جگر کے رنگ کا تذکرہ کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس وقت شعر گوئی کی ایک عام وبا پھیلی ہوئی تھی۔ جسے دیکھئے بال بکھیرے گریباں چاک جھوم جھوم کر شعر سنا رہا ہے۔ ایک تو طبیعت فطرتاً شاعر واقع ہوئی تھی۔ اس پر ماحول کا اثر چنانچہ میں بھی اس کا مریض ہو گیا لیکن ذرا شائستہ قسم کا۔ ہر روز پانچ چھ شعر کہتا اور پھاڑ کر پھینک دیتا کیونکہ کسی کا شاگرد تو تھا نہیں جس سے اصلاح لیتا۔ اور خواہ مخواہ شعر سنا تا پھرتا یہ میری طبیعت کے خلاف تھا۔ آخر کافی عرصہ بعد ضبط ربانی صاحب رامپوری سے ملاقات ہوئی باتوں ہی باتوں میں شعر و شاعری کا ذکر چھڑا اور انھوں نے میرے اشعار پر اصلاح دینی منظور فرمائی۔ اور پھر انھیں سے عرصہ تک اصلاح لیتا رہا۔ پھر حالات سے مجبور ہو کر کلکتہ چلا گیا وہاں بھی شاعری کے ذریعہ حتی الامکان اردو کی خدمت کرتا رہا۔ اور کئی کتابیں "آدمی"، "چاندنی رات"، "سماج کی لاش"، "ہفت رنگ" وغیرہ لکھیں جو سب کی سب کلکتہ کے خونی فساد کی نظر ہو گئیں۔ اب پاکستان آکر فرصت کے اوقات کا یہی مشغلہ ہے

متفرق اشعار

قسم خدا کی نکھریں گے جلوہ رنگیں — نقاب چہرہ پرنور سے اٹھا کے تو دیکھ

جب بار کائنات اٹھانا محال تھا — کیوں دائرہ وسیع لیا انتخاب کا

سعی ناکام پہ تدبیر نے جھنجھلا کے کہا — پھینک دیجئے الٰہی تقدیر کے ٹکڑے کر کے

جب میں قائل ہوں ذات باری کا — پھر مرے کیوں ارادے ٹوٹتے ہیں

دو گھڑی بھی تو نہ پایا آرام　　تیری دنیا میں خدایا میں نے
دل بھی بہکا نگاہیں بھی بہکیں　　یہ جوانی بھی کیسا جوانی ہے
پتیاں بن گئیں لالہ و گل کی　　دھجیاں میرے گریبانوں کی
تیری خاطر ہی لیے وفا میں نے　　اپنی ہستی خراب کر ڈالی
یہ بلندی میرے خیال کی ہے　　جب کبھی دیکھا تمہیں قریں دیکھا

عندلیب شادانی

میری عمر کوئی دس گیارہ برس کی تھی کہ ہمارے شہر میں ایک بڑا بھاری مشاعرہ ہوا بعض ہم عمر اور ہم سبق لڑکوں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی چند شعر کہے اور اس دن مجھے معلوم ہوا مبدءِ فیاض نے مجھے طبع موزوں عطا فرمائی ہے اور اس کے بعد تو قریب قریب ہر روز دوران گفتگو میں درجنوں مصرعے بے ساختہ موزوں ہو جایا کرتے تھے لیکن باقاعدہ شعر کہنے اور کسی کے آگے زانوئے تلمذ طے نہ کرنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا کیونکہ حالات سازگار نہ تھے۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں تعلیم کی غرض سے مجھے لاہور جانا پڑا جہاں وہ سب سامان موجود تھے جن کی بدولت انسان کی شاعرانہ صلاحیتیں پوری قوت کے ساتھ ابھر آتی ہیں۔ ایک طرف مولانا تاجور جیسے شاعر گر کا پڑوس اور ان کے اصرار سے لاہور کی ادبی صحبتوں میں شرکت اور دوسری طرف یکایک دل کی گہرائیوں میں اس لطیفۂ ازلی کا ظہور جس کے طفیل زندگی زندگی بنتی ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو حیات نقطۂ آغاز وہی ہے۔

عشق سے ہوتا ہے آغاز حیات
اس سے پہلے زندگی الزام ہے

میری شاعری کی ابتدا نظم سے ہوئی اور تصویر بہار میری پہلی نظم ہے جو دیال سنگھ کالج لاہور کی بزم ادب کے ایک جلسے میں ۲۹ جنوری سنہ ۱۹۲۴ء کو پڑھی گئی۔

سامعین کی بے اختیار داد تحسین نے دل بڑھایا اور میری دوسری نظم "شالامار" وجود میں آئی۔ اس نظم نے گمنام نوارد کو لاہور کے ادبی حلقوں میں اچھی طرح روشناس کرا دیا ۵ مئی ۱۹۲۵ء کو "حقیقی زندگی" اور اس کے ساتھ ہی "حقیقی شاعری" کا آغاز ہوا۔ یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے

گو بے ہوا ہی سے پردہ ستم ناز
دل یہی سمجھتا ہے شوق کارفرما ہے

میری شاعری کو دو دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا دور جنوری ۱۹۲۷ء سے لیکر اگست ۱۹۲۹ء تک اور دوسرا دور جولائی ۱۹۳۴ء سے لیکر آج تک دونوں دوروں کے کے درمیان تقریباً پانچ برس کا زمانہ بالکل خاموشی میں گذرا ہاں دسمبر ۱۹۳۱ء میں ایک خاص واقعہ سے متاثر ہو کر ایک نظم "روسی نورینا" لندن میں کہی تھی۔ اس کے بعد پھر مکمل خاموشی ۱۹۳۴ء میں یکایک احساس نے انگڑائی لی اور یہ غزل وجود میں آئی۔

گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انھیں کی یاد میری زندگی ہے

میری شاعری کا نام "تر خیال" ہے اور پہلے دور کی بعض نظموں کو چھوڑ کر کہ وہ بھی بیان واقع سے خالی نہیں ہیں میں نے زندگی میں ایک شعر بھی ایسا نہیں کہا جس پر آپ بیتی کا اطلاق نہ ہو سکے۔"

اوّل سے لیکر آخر تک رنگین ہے میرا افسانہ
کچھ اسکے لبوں کی سرخی سے کچھ میرے لہو کی سرخی سے

انتخاب کلام

چاندنی سیکڑوں سے لغزوں سے — جی کبھر آتا ہے کیوں خدا جانے
آرزو میری بن گئی امید — کیا تبسم میں سمجھا تھا جانے
بیٹھے بیٹھے اداس لگتا ہے — دل کو کیا ہو گیا خدا جانے
جسم سے جان کھنچی لگتی ہے! — چاندنی میں ہے کیا بلا جانے
آہ کی قدر اشک کی قیمت — کوئی تم ناشناس کیا جانے
زخم دل کو چھپا رہا ہوں میں — کوئی میری ہنسی کو کیا جانے

تو ہی بتلا وہ تجھ سے کیا چاہے   جو تجھے اصل مدعا جانے!

چاندنی اور اداس تنہائی
تم ہو کس حال میں خدا جانے

دیکھنا یوں کوئی شکووں سے خفا ہوتا ہو   ناز ہو جس پہ اسی سے تو گلہ ہوتا ہے
بدگمانی ہے عبث میری خموشی سے تمہیں   کیا کبھی تار سے نغمہ کبھی جدا ہوتا ہے
پیکرِ ناز میں آجائے جہاں روحِ نیاز   حسن دنیائے محبت کا خدا ہوتا ہے
جو یہ کہتے ہیں کہ ہر حال میں خوش ہیں ہم تم   ان کے دل میں کبھی مقدر کا گلہ ہوتا ہے
ایک شعلہ ہو کہ سینے میں لپکتا ہے مدام   شاید اتنا ہی محبت کا صلہ ہوتا ہو

جھانکنا چاند سے نغموں سے صدائیں دینا
اے مری روح کی تسکین یہ کیا ہوتا ہے

تیز ہے رفتارِ دل کی سست رفتار تھا   اب یقیناً منزلِ جاناں بہت نزدیک ہے

پڑتی ہے اپنے خونِ تمنا پہ جب نظر
ہوتا ہے دل میں شک کہ خدا ہے کبھی یا نہیں

دل آج بے حد گھبرا رہا ہے   اے دوست ان کا کچھ تذکرہ کر
توڑ دیئے ہوں یاس نے جس کے تمام آسرے   آہ وہ نامراد پھر کیا کوئی آرزو کرے
بہت مختصر تھے محبت کے لمحے   مگر پھر بھی ہر لمحہ اک زندگی تھا

یہ دنیا زمانہ برا ہے بہت گذرنے والے!!
نہ سمجھ قلب کی رفتار ہوئی کتنی کہ نہیں

انہیں آرائشِ گیسو سے مطلب   کوئی دیوانہ ہو جائے بلا سے
سنا ہو تم نے شاید میرے ہمسایوں میں چرچا ہو   کہ اکثر رات کو روتی کی اک آواز آتی ہے
محبت دونوں جانب سے محبت   نہ پوچھو آہ کیسی زندگی ہے
رشک کرتی ہے مجھ پر اک دنیا   شعر ہو نغمہ ہو بہار ہو تم

دل سے اک دھواں اٹھا آنکھ ڈبڈبا آئی!
انتظار کی آخر کوئی انتہا بھی ہے!

ملنے کا اثر ہے کہ یہ چھٹنے کا اثر ہے   پہلو میں کئی دن سے خلش آٹھ پہر ہے

غالب
عبدالغالب بھٹی

تاریخ پیدائش ۱۸ جنوری ۱۹۲۷ء۔ پورا نام عبدالغالب بھٹی وطن اکال گڈھ (آزاد کشمیر)

جہاں کا ذرہ ذرہ ہے اسی کے نور کا پرتو　　نگاہِ شوق آخر طور پر جانے سے کیا ہوگا

جہاں میں تنگ دِل رہ کر بھی جینا کوئی جینا ہے
حریم دل کو پھیلا کر حریف دو جہاں کرے

غلام محمد

حالاتِ حیات:۔ دنیا میں جو شخص شاعر نہیں میں سمجھتا ہوں وہ اسرارِ حیات سے حقیقت آشنا نہیں ——— مگر جو شاعر ہے وہ یوں دنیا کے کسی کام کا نہیں

جس طرح کسی جادوگرنی نے کسی شہزادے کو اپنے طلسم و سحر میں جکڑ رکھا ہو۔ جس طرح کسی خوبصورت پنچھی کو تتلیاں دینے پر کتر کر پنجرے میں ڈال رکھا ہو۔ بالکل اسی طرح فطرت نے اس فطرت شناس کو ابتدائے آفرینش سے تا امروز حسن و محبت کے زندان خانہ اور راز کائنات کے طلسم کدہ میں ڈال رکھا۔ یہ پتہ نہیں کہ یہ میں ہزار کس جرم کی پاداش میں ہے کہ وقت کا بے درد ہاتھ بھی اس منتر تم فرد کو ہمیشہ جھٹک کر تا رہتا ہے۔ یہ پرے پھینک دیتا ہے اور یہ معتوب فطرت دیوانہ گھوم کی طرح منزل منزل سے بے نیاز اپنی دھن میں مگن گاتا یا روتا رہتا ہے۔ موسم جدا، دنیا سے بے پرواہ آزاد ہے۔ دور سے بیگانہ۔ زندگی کے کالے ڈبا رہے انگنت تو ہاں لگا ۔۔۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی زندگی میں کوئی کانٹا سا چبھ گیا ہو۔ جب اکیلا ہو جھنجھلا اٹھتا ہے اور جیسے

لذتِ درد کے سبب وہ انکا لنا بھی نہ چاہے۔

نظامِ حیات کو قائم رکھنے کے لئے ایک آدمی ہر قسم کے حالات سے نبرد آزما ہوکر صبح کو شام اور شام کو صبح کرتا ہے۔ مگر یہ کائناتِ خیال کا خالق، ایک شعر موزوں، ایک مرصع غزل، ایک کامیاب نظم کی تخلیق کے لئے دنیا کے ہر کاروبار سے بے تعلق ہوکر روز و شب مشغولِ سخن رہتا ہے جس کی قیمت اسے نہ زرِ نقد تو کجا بسا اوقات دادِ محبت کی صورت میں بھی نہیں ملتی۔

پھر بھی جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں ایک شاعر ہوں۔ تو میں بے حد خوش ہوتا ہوں۔ کہ خدا کا شکر ہے۔ کہ میں۔ رہزن۔ رہبر۔ حاکم۔ جنرل۔ منجم۔ وغیرہ نہیں ہوا۔ کیونکہ ان سب میں سے اگر میں کوئی ایک بھی ہوتا تو شائد زندگی کے حقائق سے باخبر نہ ہوتا۔ اور صرف ذاتی مفاد کی خاطر، جلبِ منفعت اور تسکینِ جذبات سے کام رکھتا ــــــ اب مجھے ایک گونہ مسرت ہے۔ کہ میں نے ہر مہرِ راز کو سینۂ گیتی کے اندر جھانک کر دیکھا ہے۔

شعر کہنے کے لئے اگرچہ کسبِ فن کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ شعر، نالہ کی طرح خود بخود دماغ کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ زبان و محاورہ کی پابندی کے بغیر اور سوزِ سخن بہاؤ میں لاو اسے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ پھر بھی تماشائے اہلِ کرم دیکھنے، شوقِ ملاقات اور تسکینِ ذوق کے لئے میں نے اس ضمن میں بہتوں سے مشورۂ سخن کیا ہے۔ باکمال اساتذہ سے بھی اور صاحبِ فن شعراء سے بھی۔ مگر میں نے کسی سے وابستگی کا اعلان آج بھی محض اس لئے نہیں کیا۔ کہ شکوک یا شکایت کا کوئی موقع پیدا نہ ہو کیونکہ میں نے جس کسی سے جو کچھ بھی سیکھا ہے۔ اس کا میں بے حد احسان مند ہوں۔

میں نے باقاعدہ تو اپنے تلمذ حضرت بیخود دہلوی جانشین حضرت داغ مرحوم کے سامنے طے کیا ہے۔ اگرچہ میں نے ان سے کچھ بھی نہیں سیکھا۔

مجھے اس چیز کا صدمہ ہے کہ مجھے زندگی کی کسی بھی منزل میں شفیق استاد نہیں ملا۔ کیونکہ فیضِ استاد سے آدمی کو چند ساعت میں وہ کچھ مل جاتا ہے۔ جو ایک عمر کی ابتر کے بعد بھی نہیں ملتا۔ مگر ہر مقام و منزل پر استاذِ دیگر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ـــ اگر میں سالہائے گذشتہ میں کسی بھی استاذ کا اعلان کر دیتا۔ تو شاید مجھے فنِ شعر سے اتنی شد بد بھی نہ ہوتی جو آج ہے ــــــــــ شعر کی بافت میں علامہ آرزو لکھنوی مرحوم خاص درجہ رکھتے تھے افسوس کہ مجھے ان سے اس باب میں استفادہ حاصل کرنے کا موقع نہ ملا۔

شاعری جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ ایک نشہ سا ہے۔ نیم دیوانگی سی۔ جی چاہتا ہے کہ ہمہ وقت جنتِ تخیل کی رنگا رنگ بزم آرائیاں ہوں۔ مگر یہ جان کر کہ فی زمانہ شاعری کا ثمر بھوک اور موت

کے سوا کچھ بھی نہیں، سانس کے زیر و بم کو قائم رکھنے کے لئے جان بوجھ کر دیگر کاروباری مصروفیات میں الجھ جاتا ہوں اور شاعری نہیں کر پاتا۔ حالانکہ دل و دماغ۔ درد و افکار سے معمور رہتے ہیں۔ شعور و لاشعور کے پردے میں فریادِ نے غم کا دکھ بھرا راگ چھیڑ رکھا ہے۔ شعر و سخن کی شوخ و چنچل پریوں نے حسن و جمال کی سبھا سجا رکھی ہے۔ مگر بہر چیز آن کی ہے۔ ہر چیز وقت کی طالب اور تکمیل طلب ہے۔ بالفاظ دیگر میرا مجموعہ کلام غیر مرقوم میرے دل و دماغ میں ہوا جمع ہے جیسے تلی کھڑی گھٹا۔ مجھے تمنا ہے کہ مجھے فرصت میسر ہو تو اسے قلم بند کر کے اسی انداز میں پیش کر دوں جس کا خاکہ ذہن نے ایک مدت سے بنا رکھا ہے۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری اس ناچیز خواہش کا انجام بھی حیرت انگیز طور پر غیر متوقع ہوگا۔

اور اگر مجھے ادارت و دیگر دھندوں سے مہلت نہ ملی تو میرے مرنے کے بعد علم دوست احباب صرف یہی کہیں گے کہ وہ ایڈیٹر تھا۔ اور دوسرے لوگ — محرر، مصور، خزانچی اور محنت کش جس نے مجھے جس عالم میں بھی دیکھا ہے، مگر شاعر کوئی نہیں کہے گا جو میں سب سے اول ہوں۔

بہر نوع نیچے یہ چند قطعات ملاحظہ فرمائیے جو وقتاً فوقتاً میں نے لاتعداد جھگڑوں سے آنکھ بچا کر یا ارتجالاً لکھے گویا یہ ایک فضول خرچ کی پس ماندہ رقم ہے یا ایک مصروف ترین شخص کے پیدا کردہ لمحاتِ فرصت کا اندوختہ (بہت سا سرمایہ سخن تو تقسیم ہند کی نذر ہو گیا)

تخلص چونکہ اشاعتِ کلام کے لئے جادو کا اثر رکھتا ہے میں نے بوجوہ ترک کر رکھا ہے

قطعات

آتشِ گل سے باغ جلتے ہیں — شعلۂ دل سے داغ جلتے ہیں
اور یہاں سوزشِ محبت سے — آنسوؤں کے چراغ جلتے ہیں

گو سکوں کی تھی اک بہار گھڑی — عیش پرور تھی زندگی کی گھڑی
ان کی جب یاد آئی آنکھوں سے — لگ گئی خون کے آنسوؤں کی جھڑی

اٹھا یا شوق نے کھینچے ہزار نقش و نگار — مگر میں صیدِ ادا بن گیا ہوں میں
سمجھ رہا تھا میں اک گیت زندگی کو مگر — غمِ حیات سے فریاد بن گیا ہوں میں

میں سوچتا ہوں کہ کیا ہو گئی ہنسی میری — ہنسی سے پھول کہ ہر سمت سے برستے ہیں
جہاں کو حیرت و حسرت سے دیکھتا ہوں میں — کہ لوگ کس طرح یوں کھلکھلا کے ہنستے ہیں

تسلسلِ غمِ دنیا کا محبت سے — مری ندیم اب لمحوں پہ زندگی کا ہے
نسیم صبح کے جیسے لطیف جھونکے سے — چراغِ صبح کی لو کانپ کانپ اٹھتی ہے

فانی

سعید اختر مراد آبادی

اپریل ۱۹۲۹ء کی تیرہ تاریخ تھی جب میں نے اس عالم رنگ و بو میں پہلی مرتبہ آنکھیں کھولیں یہ آنکھیں کہاں اور کب بند ہوں گی؟ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرا تاریخی نام سعید اختر تجویز کیا گیا تھا۔ لیکن والدین محمد ایوب کہنے لگے۔ ۱۹۴۱ء میں میں نے کلام پاک کا حفظ پورا کر لیا۔ ۱۹۴۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کیا اور ۱۹۴۹ء میں ادیب عالم اور اب لائل پور کے ایک سرکاری دفتر میں کلرک ہوں۔ مجھے بچپن ہی سے شعر پڑھنے اور سننے کا شوق تھا اور اسی شوق کی وجہ سے میں ادبی زندگی میں داخل ہوا۔ میری ادبی زندگی ۱۹۴۶ء سے شروع ہوتی ہے ابتدا نثر نگاری سے ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ میں نے شاعری کب اور کس طرح شروع کی لیکن جب مصرعے موزوں کرنے لگا تو مجھے استاد کی ضرورت محسوس ہوئی اور میں نے حضرت رئیس امروہوی کا انتخاب کیا۔ انہوں نے میری رہنمائی فرمائی۔ اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے لیکن یہ تعلق ۴۷ء کی وجہ سے جلد ہی ختم ہو گیا۔ اور اب ۱۹۵۵ء سے میں ادبی دنیا کے معروف فنکار حضرت نازش پرتاب گڑھی کے دامن فیض سے وابستہ ہوں اور یہ ان کا کرم ہے کہ وہ مجھ پر خاص نظر عنایت رکھتے ہیں۔ جہاں تک میرے ادبی نظریات کا تعلق ہے میں ادب میں ترقی پسند قدروں کا قائل ہوں مگر اس طرح نہیں کہ قدیم ادبی سرمائے کو بالکل ہی لغو سمجھوں اور اشتراکیت کی تبلیغ و اشاعت ہی کو ادب کے لئے ضروری قرار دے دوں۔ میں مسلمان ہوں اور اسلام کی کاملیت پر پورا پورا ایمان رکھتا ہوں۔ چونکہ ہر مسلمان مذہباً ترقی پسند ہوتا ہے اس لئے میں بھی ترقی پسند ہوں۔

حضرت نازش پرتاب گڑھی نے میرے "سو شعر" کے مجموعے پر اظہار رائے کرتے ہوئے تحریر فرمایا: "اسلوب اور انداز بیان کے ساتھ ساتھ فانی مراد آبادی کے کلام میں تاثرات کے گہرے نقوش ہیں احساسات کی تڑپ ہے۔ جذبات کی جھلکیاں ہیں زندگی کی ٹھوس حقیقتیں ہیں فکر و نظر کے زاویے ہیں اور یہی سب کچھ آج کی "غزل" کا طرۂ امتیاز ہے"

اسی مجموعہ پر حضرت ماہر القادری کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

فانی کے کلام میں سوز و گداز کے ساتھ ولولہ اور جوش بھی پایا جاتا ہے۔ "قنوطیت" کے مقابلے میں "رجائیت" کی طرف ان کا میلان زیادہ ہے اور آج کی انقلابی دنیا کے معرکہ آرا دور میں رجائیت کی ہی ضرورت ہے۔"

گاہے گاہے "نعت" بھی کہتا رہتا ہوں۔ میرے نعتیہ کلام کے ایک زیرِ ترتیب مجموعہ کا تعارف لکھتے ہوئے حضرت نظیر لدھیانوی فرماتے ہیں۔

"فانی مرادآبادی کو حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عقیدت اور محبت ہے وہ اشعار سے صاف صاف ظاہر ہوتی ہے۔"

ابھی میں اپنے مستقبل کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میرے متعلق مقتدر شعراء کے تاثرات کا اندازہ ان سطور سے بخوبی ہو جائیگا۔"

حضرت نازش پرتاب گڈھی نے لکھا ہے "فانی کی شاعری سرعت کے ساتھ ترقی یافتہ اور آفاقی ادب کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کے تغزل کا رنگ نکھر رہا ہے۔ اس کے لہجے میں قوت اور انداز بیان میں دلکشی آتی جا رہی ہے اور اس کے اشعار عام حیاتِ انسانی سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔" میں طبیعت پر زور دے کر زبردستی شعر کہنے کا عادی نہیں ہوں جب طبیعت موزوں ہوتی ہے تو شعر خود بخود ہونے لگتے ہیں۔ مگر اس روانی میں واردات اور جذبات میں بالکل ہی نہیں گم ہو جاتا بلکہ تفکر اور تدبر سے بھی کام لیتا ہوں ہر چند کہ معاشی پابندیاں اور دوسری مصروفیات فکرِ سخن کے لئے زیادہ مواقع نہیں دیتیں پھر بھی جب جذبات اور احساسات ابھرتے ہیں تو اپنے غیر شاعرانہ ماحول کے باوجود شاعر بن جاتا ہوں۔ اور شعروں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔

میرا کلام ملک کے معیاری رسائل میں چھپتا رہا ہے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ نعتوں کے مجموعے "خیابانِ نعت" اور سو شعروں کا مجموعہ "سہدگل" زیرِ ترتیب ہیں یہ مجموعے عنقریب منظرِ عام پر آ جائیں گے۔ میں ماہنامہ "فرمان" لائلپور کے ادارہ کا رکن بھی رہ چکا ہوں۔

نمونۂ کلام۔

ہنسی کے ساتھ چھلک آئے اشک آنکھوں میں
چھپایا چاہا غمِ دل مگر چھپا نہ سکے

اکثر وہ بھٹک جاتے ہیں ساحل پہ پہنچ کر | لیتے ہیں جو طوفاں میں سفینے کا سہارا
آنسوؤں میں مسکراہٹ گھول دے اے بےخبر | زندگی میں امتزاجِ برق و باراں چاہیے
ذرا تعمیر کی جانب تو آنے دے زمانے کو | تو پھر یہ بجلیاں خود ہی کریں گی شاخ تر پیدا
وفورِ درد ہے دراصل پیامِ سکوں فانی | جب بڑھ جاتی ہے ظلمت تو ہوتی ہے سحر پیدا
گلستاں کیلئے رونے سے کچھ بنتا نہیں فانی | نظر میں حسن پیدا کر سنور جائیگا ویرانہ
دوستی عشق کیا اس زمانہ میں | دشمنی پر بھی اعتبار نہیں
جو زندگی پوچھو تو ہے جینے کا حق اس مرد کو حاصل | اجل میں بھی جو کر سکتا ہو شانِ زندگی پیدا

فانی
سعادت حسن

میں ۱۹۳۵ء میں سہارنپور کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوا والد صاحب کا انتقال میری پیدائش سے ۵ ماہ قبل ہی ہو چکا تھا لہذا میری پرورش میرے پھوپھا کے زیر سایہ ہوئی۔
میرے بچپن کا زمانہ بڑے ناز و نعم میں گذرا ابتدائی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ مگر جیسے جیسے سن شعور کو پہونچتا گیا میرے دل میں سرمایہ داری کے خلاف نفرت کا جذبہ بڑھتا گیا۔ باوجودیکہ میری پھوپھی مجھ سے والہانہ محبت کرتی تھیں لیکن میں سرمایہ دارانہ ماحول کو اپنے لئے قید خانہ تصور کرنے لگا

میرے شوق و ذوق کی ابتدا بھی عجیب طریقہ سے ہوئی۔
جب میں گیارہ سال کا تھا تو میرے اسکول میں ایک مشاعرہ ہوا اساتذہ میری موزونیٔ طبع سے کسی طرح واقف تھے لہذا انہوں نے ہمت افزائی کے طور پر مجھ سے بھی شاعرہ میں پڑھنے کے لئے اصرار کیا چنانچہ میں نے حکم کی تعمیل کے طور پر ایک غزل مشاعرہ میں پڑھی۔ لوگوں نے میری ہمت افزائی کی اور نتیجہ میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اسی ہمت افزائی نے میرے شوق کو ابھارا۔ اور ادب نواز دوستوں کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ میں بھی پرچم کے صفحات پر موجود ہوں۔
حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ شعر کہنے کی صلاحیت بھی بڑھتی گئی ساتھ ساتھ افسانہ نویسی کا

ذوق بھی بڑھتا گیا۔ اب تک متعدد افسانے لکھ چکا ہوں "انقلاب"، "گوندیاں" اور "تاریکی" وغیرہ کے نام سے میرے کئی افسانے بہت مقبول ہوئے۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے خونیں انقلاب نے مجھ کو بہت متاثر کیا جس کا اثر میرے افکار پر بھی پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ میری نثر اور منظومات میں اس کا اثر بہت نمایاں ہے۔ پاکستان آنے کے بعد حیدرآباد سندھ آگیا اور اب یہیں مقیم ہوں خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے پیروں پہ کھڑا ہونے میں کامیاب ہوگیا ہوں اور کسی کا شرمندۂ احسان نہ ہوا۔ "افسانہ نگاری" اور شاعری کا سلسلہ ہنوز جاری ہے اور تا دمِ مرگ یہ سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا۔ آج کل ایک ضخیم ناول کی تیاری میں مصروف ہوں۔ میں کیا کہتا ہوں۔ اور کہاں تک اپنی کوششوں میں کامیاب ہوں۔ اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

نا محرمِ رازِ ضبط و سکوں مغلوبِ محبت ہوتا ہے ۔۔۔ اور حسن کا دل بہلانے کو سامانِ ضیافت ہوتا ہے
عرفانِ جنوں کی آزادی معراجِ محبت ہوتی ہے ۔۔۔ باوصفِ خرد پھر انساں کیوں مجبورِ محبت ہوتا ہے
اربابِ خرد کی باتوں سے ہوتا ہی تکدّرِ خاطر کو ۔۔۔ اور جنبشِ لب سے دیوانہ ہر بزم کی زینت ہوتا ہے
اس وقت مکمل ہوتا ہے افسانۂ الفت اے فانی
جب کشتی و موجِ طوفاں میں اعلانِ عداوت ہوتا ہے

چمن تو آتشِ گل سے تھا تو لگائے ہوئے ۔۔۔ وہاں تو آگ لگا دی مگر بہاروں نے
کسی کی نیچی نگاہوں نے تیر سے جو کئے ۔۔۔ تو اُٹھ کے پانی نہ مانگا نظر کے ماروں نے
عداوتوں میں بھی مخلص رہے ہیں یہ فانی
کیا ہے خون تمنا بھی جاں نثاروں نے

فاتح — قاضی فتح محمدؒ

میرا نام فتح محمد اور تخلص فاتح ہے۔ بچپن کالاباغ تحصیل عیسیٰ خیل ضلع میانوالی میں گذرا جہاں میرے والد قاضی محمد حسین مرحوم نواب آف کالاباغ کے مختار عام تھے۔ تاریخ پیدائش ١٠ جون ١٩٠٢ء ہے۔ تعلیم بی۔ اے تک ہے۔

ہر صنف سخن میں شعر کہنے کی دستگاہ رکھتا ہوں

صبر ہی آیا نہ جا کر دلِ مضطر آیا — جانے والا مرے پہلو سے نہ پھر کر آیا
طشت از بام محبت کا کہیں راز نہ ہو — اس طرح توڑ مرے دل کو کہ آواز نہ ہو
مرے دل میں پنہاں تری آرزو ہے — مری آنکھ کو بس تری جستجو ہے

فریدی — محمد یعقوب

سنِ پیدائش ١٩٢٣ء۔ پورا نام پیرزادہ محمد یعقوب فریدی وطن فتحپور سیکری ضلع آگرہ۔

رونق افزائے جبیں نقش ریا ہوتا نہیں
داغ بن جاتا ہے جو سجدہ ادا ہوتا نہیں

فرید — فرید جاوید

سن پیدائش ١٩٣٢ء وطن سہارنپور (یو۔ پی)

زندگی کو بہت عزیز ہوں میں — ڈھونڈھ لیتے ہیں حادثات مجھے
جلوہ فشاں تھا آفتاب آپ کا انتظار تھا — آپ کا انتظار رہا ڈوب چلا آفتاب

فرخ

سیّد داؤد اصفہانی

مدیرہ "چار چیسم" کا شعراء سے اُن کے خود نوشت تذکرے طلب کرنا یقیناً ایک انوکھا اور دلچسپ ادبی مذاق ہے لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ یہ مذاق ہے یا ستم ظریفی کیونکہ اپنے نشہ میاں مٹھو بننے کی دعوت نے آج خود شاعر کا قافیہ تنگ کر دیا ہے۔

مگر کاش کہ میں شاعر ہوتا۔ اور زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا آج میرے لیے آسان ہو جاتا! بات یہ ہے کہ شاعر ہونا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ کہنے کو تو ایک عدد تخلص کا طرّہ اپنے سر بھی لگا ہوا ہے۔ اور کوئی "ہذیان" سمجھے یا "بکواس" اشعار تو میں بھی کہہ لیا کرتا ہوں۔ اب رہا شاعر ہونے کا دعویٰ تو خدا کا شکر ہے یہ خبط ابھی تک تو اپنے دماغ میں پیدا نہیں ہوا ہے آیندہ کا حال خدا جانے۔

شعر میں کیونکر کہتا ہوں۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔ اور شعر گوئی کی ابتدا کس طرح اور کب ہوئی تھی؟ یہ مجھے یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ایک مرتبہ جبکہ میں شاید پورے دس برس کا بھی نہ ہوا تھا۔ والد صاحب قبلہ "داہن آتی" کو خوش خبری سنا رہے تھے کہ "یہ لڑکا ایک دن اچھا شاعر ہو گا" اور شاید یہ پسند ہے مجھے اس روز اس لیے ملی تھی کہ میں نے "شمس تبریزی" کی ایک مناجات کو پاکستان کی قومی زبان میں ڈھال کر رکھ دیا تھا۔

یہ زمانہ میری تعلیم کے اُس دور کا تھا جہاں "میزان منشعب" "دروس الادب" اور "گلستان و بوستان" وغیرہ سے اکھاڑ پچھاڑ ہو رہی تھی لیکن میں ابھی اس منزل سے گزرنے بھی نہ پایا تھا کہ "والد صاحب" مرحوم ہو گئے اور میں یتیم!

"خانۂ ازہر" کے سند لانے کی اسکیم بھی والد صاحب کے ساتھ ہی ملک عدم کو سدھار گئی۔ اور افسوس کہ "دیوبند" کی پگڑی ہاتھ نہ لگ سکی اچھا ہی ہوا کیونکہ آج کل پگڑی کو جرم سمجھا جاتا ہے اس کے بعد بھی تین منزلوں سے گزرتا رہا۔ انہیں کسی غیر شاعر کو شاعر بنانے کی قدرتی کوشش یا لوازم کہنا زیادہ موزوں رہے گا۔ غرض یہ کہ اس وقت سے آج تک کے حالات کی تفصیل کا اجمال "عشق" "عاشقی" "پیری" سے زیادہ کچھ نہیں۔ مگر چونکہ اس وقت میں اپنا تذکرہ آپ لکھ رہا ہوں

اس لئے ضروری ہے کہ "مٹھو میاں تیجی تیجی" کے اصول کا پورا پورا خیال رکھوں۔ خیر تو مختصر یہ کہ ہم لکھنؤ میں قندھاری بازار کے نواب صاحب (زمیندار) تو باپ دادا کے وقتوں سے بنے چلے آرہے تھے۔ یہاں تک کہ جب شہر لکھنؤ کی ترقی ہوئی آبادی نے "احاطہ آصف خاں" ہماری آبائی زمینداری کا علاقہ کو اپنے حصار میں لے لیا اور وہ سڑک جو ہماری رعایا کے مکانوں کو روندتی ہوئی "حسین گنج" اور "لال باغ" کے چوراہوں کو ملانے لگی تو اس سڑک کے نام کا سوال پیدا ہوا۔ ہمارے دادا صاحب قبلہ نے کسی سڑک کو اپنے نام سے موسوم کرنا شاید اپنے بزرگوں کی توہین خیال کیا ہوگا۔ اس لئے ہماری زمینداری کے مختار کار صاحب جو اس وقت اپنی خدمات کے صلے میں مبلغ پندرہ روپے ماہوار سکہ کلدار وصول کرتے تھے ان کے نام نامی سے وہ سڑک موسوم کردی گئی۔ اور آج تک "مراد علی لین" کہلاتی ہے۔

ہاں تو مطلب یہ ہے کہ میں نے شہر لکھنؤ کے اسی علاقے سے جون ۱۹۱۲ء کو اپنے رونے میں اپنی آمد کا اعلان سنایا تھا لیکن میری پرورش اور تعلیم اور اس کے بعد کی زندگی کا بڑا حصہ ریاست بھوپال سے متعلق رہا ہے چنانچہ وہاں آج بھی ۲۵ ہزار روپے کی لاگت کا میرا ایک موروثی مکان کسٹوڈین بھارت کے قبضہ میں موجود ہے۔ خیر تو بات یہ ہے کہ میں نے دس برس کی عمر کے بعد وہ سب کچھ دیکھا جو کسی بھی یتیم ہو جانے والوں کو دیکھنا ہی پڑتا ہے مگر فضل الٰہی دونوں میں تحت جانفشانیوں کے بعد کاشتکاری، ٹھیکیداری اور کلرکی کی سنگین ترین دیواروں کو توڑ کر تحصیلداری، کسٹم افسری اور مجسٹریٹی کی اعزازی کرسیوں کو بھی عروج کرنے میں کامیاب ہوا۔

مگر چونکہ شاعری کی دیمک ہر جگہ لگی چلی آرہی تھی۔ اس لئے گردش روزگار نے بھی پیچھا نہ چھوڑا حتی کہ ہجرت کی نوبت آگئی۔ اور میں لکھنؤ اور بھوپال کی جاگیریں چھوڑ چھاڑ کر کراچی بیچ منجدھار رہ گیا۔ یہاں علامہ سیماب مرحوم کے آگے زانوئے ادب طے کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اللہ میاں نے ان کو بھی دربار میں حاضری کا حکم بھیج دیا۔ شعر و ادب کے پہلے استاد حضرت ذکی الوارثی میری ہجرت سے پہلے ہی اپنے اصلی وطن کلدیر کو مراجعت فرما چکے تھے۔ اس طرح میں شاعری کے سفر میں (اپنے نزدیک) شاید آدھا راستہ بھی طے نہ کر پایا تھا کہ صحیح رہنمائی کرنے والوں سے محروم ہو گیا۔ اس لئے اب میں اپنے آپ کو شعر و ادب کی راہ میں ایک بھٹکتا ہوا مسافر خیال کرتا ہوں۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ میں تو اس سفر میں اب ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ چکا ہوں اور ذوق لطیف سے وہ لگاؤ باقی نہیں؟ جو مہاجرت کی زندگی سے پہلے تھا۔

کراچی آنے پر میں نے شعر و سخن سے کنارہ کشی اختیار کر لی لیکن یہاں "ابو سعید بزمی" مرحوم نے مجھے ایک دوسری "نثر" چکی میں گھسیٹنا شروع کر دیا یعنی انہوں نے مجھے "روزنامہ احسان" میں گمنام ایڈیٹر بنا کر نثر نگاری کی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کر دینے کا حکم دیا۔ اور تقریباً ایک سال تک میں روزنامہ احسان کراچی" میں اپنی ایڈیٹری سے متعلق "کالم" سیاہ کرتا رہا۔ اسی اثنا میں مولانا "بزمی" امریکہ کی سیاحت کو گئے اور وہیں سے آسمانوں کی سیر کو نکل گئے۔ ادھر "احسان کراچی" بزمی کی مفارقت کا غم برداشت نہ کرتے ہوئے خودکشی کر بیٹھا۔ اور میں اپنے بارے میں ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پایا تھا کہ "نقّاد" نے کہا ہاتھ ملاؤ۔ اور میں نے کہا بہت خوب! چنانچہ اب اتنی پکی دوستی ہو گئی ہے کہ میں "نقّاد کا ہوں" اور "نقّاد" میرا۔

مگر اس دوستی نے مجھے اتنا مستغنی بنا دیا ہے کہ میں نے "اسلام آباد" کے برساتی نالے پر ۸۰ روپے کا ایک بنگلہ اپنے ہاتھوں تعمیر کر لیا ہے۔ اسی میں مع اپنے آٹھ عدد متعلقین کے ٹھاٹ کے ساتھ آزادی کے مرثیے (!) پڑھا کرتا ہوں۔ اور ہاں حسب و نسب کی پوچھئے تو مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں "کھرا سیّد" ہوں۔ خاندانی برتری کے زبانی دعوے قابلِ قبول نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا میرے خاندان کا پورا شجرہ شہرہ آفاق کتاب "آئینہ اودھ" میں موجود ہے جو میرے دادا مولوی سیّد فرزند حسین صاحب کے زمانے میں تکمیل کو پہنچی تھی۔ چنانچہ "آئینہ اودھ" میں اپنی شاخ شجرہ بھی نصب ہے۔ اور یہ تو ساری دنیا جانتی ہے کہ "آئینہ اودھ" وہ کسوٹی ہے جس پر ہند و پاک کے بسنے والے اہلِ سادات کا کھرا کھوٹا پن پرکھا جاتا ہے۔ خیر تو "ہندیہ" قصبہ "کرّہ سادات" (یو۔ پی) میرا آبائی مسکن ہے۔ اور مورثِ اعلیٰ "اصفہان" سے "ہلاکو خان" کی ہلاکت آفرینی کے سبب ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے تھے۔ اسی نسبت سے میں اپنے تخلص کے ساتھ "صفہانی" لکھتا ہوں۔ میرا نام سیّد داؤد احمد۔ اور والد صاحبؒ کا نام حافظ سیّد ابراہیم حسین ہے۔ "فرخ" میرا تخلص ہے۔ یعنی طرّہ امتیاز رہا کہ شاعری کی دم! ----

اچھا صاحب۔ جنوں میں کیا کیا کچھ بک چکا ہوں اب کچھ وہ بھی سن لیجئے۔

عمر بھر برق کے دامن میں رہے — کیا رہے ہم جو نشیمن میں رہے
عشق کی شورش و طغیانی کیا — میرے آنسو مرے دامن میں رہے
ہم تو کیا صحنِ چمن میں رہتے — رہنے والے بھی نہ گلشن میں رہے
خوف صیاد نے چھوڑا نہ ہمیں — سو قفس ایک نشیمن میں رہے

برقِ سوزاں کو ہے راحت کی تلاش   آئے اور میرے نشیمن میں رہے

فصلِ گل آئی، گئی بھی فنرّخ

کب تعمیرِ نشیمن میں رہے

گُھن بھی جائے وہ پرواز تو جاؤں گا کدھر   میں قفس میں ہوں، قفس خانۂ صیاد میں ہے

تیری محبت میں بھٹکتا ہے جہنم اے شیخ   عشرتِ خلد مری فطرتِ آزاد میں ہے

ان کا کعبہ بھی نہیں طور بھی نہیں وہ بھی نہیں   کوئی جنت ہے تو وہ کیوں عدم آباد میں ہے

ہجر کا رنج، محبت کی خلش، آپ کی یاد   ساز و سامانِ جنوں سب دلِ برباد میں ہے

سوز بھی، درد بھی، اُلجھن بھی، تڑپ بھی دل میں   کیا کوئی اور مزا موت کی افتاد میں ہے

جلوے سمٹ کے عالمِ امکاں میں آ گئے   تیرے حجاب حسن کا عنوان لئے ہوئے

ہر پھول دے رہا ہے مجھے دعوتِ جنوں   گلشن ہے خارزارِ بیاباں لئے ہوئے

دل کا انداز والہانا تھا   وہ زمانہ بھی کیا زمانا تھا

کس کی آنکھیں نہ تھیں نشیمن پر   چار تنکے نہ تھے خزانا تھا

یوں بھی گذری ہے زندگی برسوں   نہ قفس تھا نہ آشیانا تھا

کیوں نہ گرتی مرے نشیمن پر   برق کا بھی کہیں ٹھکانا تھا

وہ کن آنکھوں سے جلوے دیکھیں   شوقِ بیتاب ہم کدھر دیکھیں

ہر طرف حسن، ہر طرف جلوے   کوئی بتلاؤ ہم کدھر دیکھیں

اُن کے جلووں میں کھو گیا ہوں میں   میری صورت نہ چارہ گر دیکھیں

دل تو خود پیکرِ تجلّی ہے   کیوں نگاہیں اِدھر اُدھر دیکھیں

حُسن کی برہم مزاجی الاماں   ساری دنیا مجھ سے روٹھی جائے ہے

اُف محبت کی ستم آغوشیاں   درد میرے دل سے لپٹا جائے ہے

دیکھو فرّخ عشق میں سمجھائے کون   وہ تو ظالم خود نہیں سمجھائے ہے

دل میں تصویر پاس رہتی ہے   ہر خوشی غم شناس رہتی ہے

جب مرے پاس تم نہیں ہوتے   ساری دنیا اداس رہتی ہے

ہائے رے تشنگی محبت کی   پیتا جاتا ہوں پیاس رہتی ہے

شامِ فرقت بھی میں نہیں تنہا   آس جائے تو یاس رہتی ہے

عشق میں دل عرش ہی ہے طور بھی   ذوقِ موسیٰ، غیرتِ منصور بھی
اُف یہ بزمِ ناز کی پابندیاں   دل مرا مختار بھی مجبور بھی
درسِ عبرت ہے نظامِ صبح و شام   خوش بھی ہونا چاہیئے رنجور بھی
کیوں نہ لوٹیں لذتِ وصل و فراق   وہ ہمارے پاس بھی ہیں دور بھی

تمھیں نے ڈبویا تمھیں نے اُبھارا   نہ کوئی تلاطم، نہ کوئی کنارا
نہیں چاہیئے ناخدا کا سہارا   مجھے شورشِ موجِ طوفاں گوارا
محبت ہی کشتی، محبت ہی طوفاں   یہی لے کے ڈوبے، یہی دے سہارا
کوئی دولتِ پارسائی پہ نازاں   کسی کو امیدِ کرم کا سہارا

آپ کو چھپنا اگر منظور تھا   کیوں نظر کو جذبۂ موسیٰ دیا
نامرادی، یاس، غم، بیتابیاں   عشق نے فرخ ہمیں کیا کیا دیا

دل میں احساسِ درد رکھتا ہوں   اور تعریفِ بندگی کیا ہے
غم نہ ہو جب مدارِ زیست تو پھر   کوئی بتلائے زندگی کیا ہے
کوئی سمجھا نہ آج تک فرخ   رنج کیا چیز ہے خوشی کیا ہے

رنج کو راحت بنانا چاہیئے   درد میں بھی مسکرانا چاہیئے
رشکِ ساحل ہے بہارِ موجِ غم   بس یہیں پر ڈوب جانا چاہیئے
عشق ہے وجہ بہارِ زندگی   روتے ہوئے مسکرانا چاہیئے

کافی ہے اعتبارِ عزائم کا آسرا   گمراہیاں قبول مرے راہبر مجھے

اس طرح اٹھتی ہے موجِ اضطراب   ڈوبتا ہوں میں اُبھر آتا ہے دل
دل کے پردوں میں نظر آتے ہیں وہ   اُن کے جلوؤں میں نظر آتا ہے دل

نظر نیچی کیے وہ آ رہا ہے   عجب نشتر چبھویا جا رہا ہے
اِدھر وقتِ طلوعِ صبحِ رخصت   اُدھر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

پیشِ نظر خیال میں جلوۂ حسن چاہیئے   ذوقِ نظر کی قسم جلوہ اٹھا کے رکھ دیا
عشق کی کشمکش بڑھا عشق میں زندگی بنا   آ ہی رہے گی ایک دن موت کا آسرا رکھ دیا

آئینۂ تجلی روزِ ازل میں ہم   کب تک چھپیں گے آپ حجابِ نگاہ میں

شروعِ محبت، شروعِ جوانی — سحر ہو رہی ہے سہانی سہانی
بہارِ تمنا، فسردہ جوانی — بہت قیمتی ہیں یہ لمحاتِ فانی
گزرتا ہوں کیفیتوں کے سہارے — مجھے دیکھ لے موجِ غم کی روانی

چہرۂ بے نقاب کا عالم — ماہتاب آفتاب کا عالم
کیفیاتِ شراب کا عالم — ہوشیاری ہیں خواب کا عالم

وہ یقیناً آ رہا ہے، آئیگا، آنے کو ہے — دل مگر کہتا ہے یہ سب کچھ مرے بہلانے کو ہے
شامِ تنہائی ہے اور کوئی نہیں پرسانِ حال — ٹوٹی پھوٹی سانس ہی آنے کو ہے جانے کو ہے

کتنا پیارا ظلم ہے، کتنی حسین بیداد ہے — میں ہوں ناکامِ تمنا دل کی دنیا شاد ہے
اس عنایت کے تصدق، اس محبت کے نثار — لٹ کے بھی دنیائے دل آباد کی آباد ہے

جو متاعِ غم سے دلشاد ہو اسے راحتوں کی خبر نہیں
جو نہ انتظار میں جی سکے اسے اعتبارِ سحر نہیں
وہ ستم پہ ہو ستم کریں مرا اضطراب نہ کم کریں
مری شامِ غم ہی دراز ہو مجھے آرزوئے سحر نہیں

میری پستی میں نہاں ہیں کیا کہیں کی رفعتیں
رشک سے کیوں دیکھتا ہے عالمِ بالا مجھے
پوچھتے کیا ہو مری سرمستیوں کا ماجرا
عشق نے اپنی عطا کی درد نے پالا مجھے
التفاتِ یک نظر نے ساری دنیا لوٹ لی
میں اسے دیکھا کیا ہر دیکھنے والا مجھے
عشق کی بیگانگی کو اب کہاں سے لائیے
عقل نے آنکھیں دکھائیں ہوش نے ٹالا مجھے
سچ اگر پوچھو تو ختمِ سخن ساری دنیا بے قصور
اعتبارِ خود فریبی نے مٹا ڈالا مجھے

کہاں ان کے جلوے کہاں میری نظریں — یہ اوہامِ باطل کی خوش پوشیاں ہیں
اگر دل سے دیکھو تو ہر شے تجلی — مگر آنکھ ڈھونڈے تو روپوشیاں ہیں

وہیں ہوں فرخ وہی بیقراری — وہی ان کی وعدہ فراموشیاں ہیں

مری گم گشتگی آسودۂ منزل نہ بن جائے — جسے طوفاں سمجھتا ہوں کہیں ساحل نہ بن جائے
تصور رفتہ رفتہ اُن کا جلوہ بنتا جاتا ہے — محبت بڑھتے بڑھتے پردۂ حائل نہ بن جائے
حجابِ حسن نازاں کا طلبگار محبت ہے — ادائے بے نیازاں کی سوالِ دل نہ بن جائے
محبت اور شانِ بے نیازی واہ کیا کہنا — یہی شائستگی برہم زنِ محفل نہ بن جائے

لہرا رہی ہے آنکھ میں پھر آنسوؤں کی موج — دل بحرِ اضطراب میں ڈوبا ہوا ہے آج
لے دائے راحتِ غمِ تنہائی فراق — سارے جہاں کا درد سہارا ہوا ہے آج
گلشن میں آکے دعوتِ صحرا ملی مجھے — ہر پھول خارزارِ تمنا ہوا ہے آج
کیا دل کسی کی زلف میں اُلجھا کے آئے ہو — فرخ بناؤ نا تمھیں یہ کیا ہوا ہے آج

غم سے جب معمور ہو جاتا ہے دل — حسن، جلوہ، نور ہو جاتا ہے دل
خود تمنا، خود تجلی، خود نظر — جانے کیوں مجبور ہو جاتا ہے دل
اللہ اللہ اُس نظر کی مستیاں — دیکھتے ہی چور ہو جاتا ہے دل
دل تو فرخ آپ ہی کے دل میں ہے — کس کے دل سے دور ہو جاتا ہے دل

تغافل کی شکایت پر بگڑ کر اُن کا یوں کہنا — جسے الفت نہ ہو اللہ کرے بد نام ہو جائے

نیچی نیچی تری معصوم نگاہوں کی قسم — ذوقِ دل بادہ کشِ نور ہوا جاتا ہے
مجھکو اتنا بھی سبکسارِ تجلی نہ کرو — ہر نفس شورشِ منصور ہوا جاتا ہے
توبہ توبہ یہ ترے حسن کا اندازِ غرور — دیکھنے والا بھی مغرور ہوا جاتا ہے

عشق کا بندہ ہوں میں ایثار میری بندگی — ہر قدم پر سیکڑوں قربانیاں کرتا ہوں میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں فرخ انبساطِ درد و غم — یوں دلِ ناشاد کو شاداں کرتا ہوں میں

دل نے ہم سے کچھ کہا کہتے رہے کچھ دل سے ہم
بس یونہی گذرے چلے جاتے ہیں ہر منزل سے ہم
آپ ہی کے ذکر سے ہوتی ہے تسکین الم
اور تنہائی میں کیا باتیں کریں گے دل سے ہم
اپنی دنیا اپنی عقبیٰ اپنا سب کچھ ہے یہیں
اب کہاں جائیں بھلا اُٹھ کر تری محفل سے ہم

فضلی

سید فضل احمد کریم

سکریٹری محکمۂ تعلیمات مشرقی پاکستان۔ ولادت نومبر ۱۹۰۷ء وطن الہ آباد۔ یو۔ پی والد بزرگوار سید فضل رب صاحب فضل اپنے عہد کے خوشگوار شعراء میں شمار ہوتے تھے [illegible]ی ذوق ورثہ میں ملا۔ بی۔ اے تک الہ آباد میں تعلیم حاصل کی پھر آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں کامیاب ہو کر ۱۹۲۶ء میں ٹریننگ کے لئے ولایت جانا ہوا۔ وہاں آکسفورڈ سے (بی۔ لٹ)، کی ڈگری حاصل کی نومبر ۱۹۳۲ء میں واپس آگیا۔ اور بنگال میں تقرر ہوا مختلف عہدوں پر ممتاز رہ کر بالآخر حکومت مشرقی پاکستان میں سکریٹری محکمۂ تعلیمات کے منصب پر مامور ہوا ۱۹۴۷ء میں مجموعۂ کلام ,,نغمۂ زندگی'' کے نام شائع ہو کر اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔

دہلی کے پھول

خاک دہلی سے نکلتا ہے جو پھول
بوئے خونِ شہدا آتی ہے!
سینۂ چاک سے ہر اک گل کے
دل دھڑکنے کی صدا آتی ہے

غزل

خزاں کو بھی بہار بے خزاں کہنا ہی پڑتا ہے
جو کہلاتا ہے ہم سے باغباں کہنا ہی پڑتا ہے
اسیری میں کسے معلوم کیا دل پر گذرتی ہے
اسیری میں قفس کو آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے
جلایا گھر بھی اور صبا دلنے لوچے مرے پر بھی
مگر ظالم کو پھر بھی مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ سچ ہے تاکید انگاروں کو بھی سمجھو گلِ لالہ
دہکتی آگ کو بھی گلستاں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ مانا اس سے خودداری ہماری ذبح ہوتی ہے
مگر رہزن کو میرِ کارواں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ ہے افتادگی کا اپنی اب عالم کہ کیا کہیے
زمینِ زیرِ پا کو آسماں کہنا ہی پڑتا ہے

ہماری تشنگی و بے کسی کی انتہا یہ ہے!!
کہ ہر قطرے کو بحرِ بیکراں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ ہے شرطِ وفاداری ستم کو بھی کرم سمجھیں
دلِ نالاں کو بھی شادماں کہنا ہی پڑتا ہے

وہ اپنی گفتگو اب آپ سمجھیں یا خدا سمجھے
مگر اس پر بھی ان کو ہمزباں کہنا ہی پڑتا ہے

خیالوں کو ہمارے جو کرم فرما غلط سمجھیں
قیامت ہے کہ ان کو بدگماں کہنا ہی پڑتا ہے

ستم دیکھو تو وہ کہتے ہیں تو اچھا تو ہے دقیقیؔ
نہیں دل میں سہی لیکن مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

ترانۂ مجاہد

آؤ چلیں لے کے پھر طبل و علم تیز تیز — اور قدم تیز تیز اور قدم تیز تیز
سینہ سپر بن کے چل اور ذرا تن کے چل — اور قدم تیز تیز اور قدم تیز تیز
پاک ہے تو پاک دین پاک تیری سرزمیں — اور قدم تیز تیز اور قدم تیز تیز
تیرا محافظ خدا، ڈر تجھے کس بات کا — اور قدم تیز تیز اور قدم تیز تیز
جان کی بازی جہاں تجھ سا سپہ نامی دلا — اور قدم تیز تیز اور قدم تیز تیز
موت مجاہد کی عید مر نہیں سکتا شہید — اور قدم تیز تیز اور قدم تیز تیز
منزلیں ہا دور نیست منزلِ ما دور نیست — اور قدم تیز تیز اور قدم تیز تیز

فضا
سیّد دل محمد جالندھری

نام سید دل محمد جالندھری ابن سید امام الدین شاہ جالندھر شہر کے معزز سادات خاندان سے ہوں۔ وہاں سراج گنج میں آبائی مکان تھا میں ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو نور محل (اپنے ننھیال سید برکت علی شاہ ترمذی کے) ہاں پیدا ہوا۔ ریاضی۔ سائنس۔ ہسٹری۔ جغرافیہ کی تعلیم ہائی ڈیپارٹمنٹ تک پائی اور پنجاب یونیورسٹی کے اردو و فارسی کے اعلیٰ امتحانات منشی فاضل۔ ادیب فاضل وغیرہ بھی پاس کئے۔

۱۹۲۲ء میں جالندھر شہر میں زیر تعلیم تھا کہ شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں حفیظ جالندھری بڑے اہتمام سے مشاعرے کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۴ء تک ان مشاعروں میں حصہ لیتا رہا۔ پھر ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۰ء تک پٹیالہ بسلسلہ ملازمت مستقل طور پر رہا۔ اور بزم اقبال جالندھر میں اکثر و بیشتر کلام پڑھا اور داد و تحسین حاصل کی۔

میں نے پہلے ریاض خیرآبادی اور فصاحت جنگ جلیل مرحوم سے چند سال اصلاح لی۔ لیکن ۱۹۳۰ء سے مستقل طور پر حضرت دل شاہجہانپوری کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور ۱۹۴۲ء تک مسلسل اصلاح لیتا رہا۔ اس کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ۱۹۳۰ء سے اب تک مشاہیر ادب سے خط و کتابت کر رہا ہوں۔ علامہ سیماب اکبرآبادی۔ اثر لکھنوی۔ نیاز (مدیر نگار) محاق لکھنوی۔ فانی بدایونی۔ حسرت موہانی (بابائے اردو) مولوی عبدالحق صاحب۔ بیخود دہلوی۔ علامہ سالک انقلاب لاہور۔ میاں بشیر احمد صاحب (ہمایوں) سائل دہلوی وغیرہ حضرات سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ افسوس تمام خطوط کا مجموعہ مشرقی پنجاب کے ہنگاموں میں تمام سرمایہ کے ساتھ برباد ہو گیا۔ اور اپنے تین دیوان اور ایک بڑا کتب خانہ بھی ادھر چھوڑ آگیا۔

میری تصاویر رہنمائے تعلیم جوبلی نمبر جدید لاہور رسالہ شاعر آگرہ ۱۹۴۲ء میں مفصل حالات کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں۔

میرا کلام پاک و ہند کے موقر رسائل و جرائد میں بارہا شائع ہوا چنانچہ ہمایوں۔ الحمرا۔ مخزن۔ عالمگیر۔ ادبِ لطیف۔ رہنمائے تعلیم لاہور۔ شاعر آگرہ۔ زمانہ کانپور۔ فصاحت۔ ہندوستانی

ادب کے اوراق پر نقوشِ فضا کے نام سے شائع ہوتا رہا ہے۔

اب میں ۱۲ ستمبر ۱۹۴۷ء سے خانیوال میں مقیم ہوں اور گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر خاموشی سے ادبی خدمات سرانجام دیتا رہتا ہوں۔

میرے دو صاحبزادے اعجاز حسین شاہ اور حسن رضا پرائمری جماعتوں میں تعلیم پا رہے ہیں

میرے کلام پر چند مشاہیر کی آرا

حضرت بیخود جانشین داغ دہلوی: میں نے آپ کا کلام دیکھا۔ خیال کی جدت، بیان کی صفائی، بندش کی چستی، الفاظ کی تلاش، زبان کی لطافت، مصرعوں کی برجستگی قابلِ داد ہے۔

سائل دہلوی جانشین داغ دہلوی: آپ کا کلام جس قدر سنا۔ اس میں لطفِ تغزل پایا۔ میرے بچے بھی آپ کی شاعری کے معترف و ثناخواں ہیں۔ آپ کا کلام اکثر پرچوں میں نکلتا رہتا ہے آپ نے جو کلام مجھے بھیجا۔ اس میں سے اکثر شعروں نے مجھے بہت پرکیف کیا۔ خدا کرے۔ آپ کی سعی مشکور اور زمانہ آپ کو سراہے مطبوعہ عام آپ کا کلام ہو میں نہایت بےچینی سے آپ کے دیوان کا منتظر ہوں۔

فصاحت جنگ جلیل: سید محمد فضا جالندھری کا منتخب اور متفرق سلسلہ کلام دیکھ کر بلا تامل کہا جا سکتا ہے۔ کہ پاکیزہ خیال، سلجھی ہوئی زبان، معنی آفرینی ان کے ہر شعر سے نمایاں ہے۔ ان کا مجموعہ کلام مقبولِ عام ہوگا۔

علامہ صفی لکھنوی: ماشاء اللہ آپ کہنہ مشق معلوم ہوتے ہیں اور صاحبِ علم و فضل بھی مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ترقی پسند اردو کے اثرات سے آپ کا کلام پاک ہے۔

لسان الہند مرزا عزیز لکھنوی: فضا صاحب بہت قابل اور ہونہار ہیں۔

حضرت اعجاز صدیقی مدیر شاعر آگرہ: فضا صاحب مشرقی علوم کے ماہر ہونے کے علاوہ آپ نے فن کو حاصل کرنے کی طرح حاصل کیا ہے۔ قدیم و جدید تغزل کے متعلق بھی مطالعہ وسیع ہے۔ ادب و شعر کی جدید تحریکوں سے بھی آپ کماحقہ واقف ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں خاص انفرادیت ہے جس نے آپ کے شعر میں ابہام نہیں پیدا کیا۔ پھر یاس و قنوطیت کا آپ کے یہاں نام نہیں۔ یاس انگیز مضامین میں شگفتگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور رکھتے ہیں۔

حضرت فانی بدایونی: ماشاء اللہ آپ خوب فرماتے ہیں۔ غزل آپ کی پختہ مشق کو ظاہر کرتی ہے نوادر نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ اسلوبِ بیان سلجھی ہوئی طبیعت کا پتہ دیتا ہے۔ تلاش

مضامین فکر کو بلند دکھاتی ہے۔

حضرت دل شاہجہانپوری ۔ جناب فضا جالندھری گلستانِ سخن کے وہ تر و تازہ پھول ہیں جن کے الفاظ اور معانی کو رنگ و بو سے تشبیہ دی جائے تو مبالغہ نہیں باعتبارِ ندرتِ خیال شگفتگی ترکیب، جدت، انداز بیاں ایک مکمل شاعر ہونے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ جدید شاعری کے دلدادہ اور اس صنفِ سخن پر قادر ہیں جناب فضا صاحب کا کلام ہر اعتبار سے قابلِ ستائش ہے

انتخاب کلام

عشق میں کام لے ہمتوں سے — مصیبت میں بھی مسکراتا چلا جا

منتظر موسمِ بہار کے ہم — بجلیوں کو ہے آشیاں کی طلب

ڈھونڈتا ہوں وہی آغازِ محبت کے مزے — کیوں نہیں اب اثرِ آہِ رسا کیا باعث

کبھی اظہارِ غم کرنا کبھی خاموش ہو جانا — بدلتا ہے محبت میں محبت کا نظام اکثر

اللہ اللہ جذبۂ دل کی عجب تاثیر ہے — سینۂ بسمل میں ہیں جو تیر تھے قاتل کے پاس

آج ہر پیمانۂ رنگیں ہے لبریزِ نشاط — تیری انگڑائی ہے یا ساقی بہار آئی ہوئی

مری آنکھوں سے اپنے حسن کو دیکھ — آئینے میں تو دیکھتا کیا ہے

ہمت اگر ہو سینۂ دریا کو چیر دے — پھر خود ہی بنتے جائیں گے ساحل جگہ جگہ

جو تھپیڑے ہیں اٹھاتے نہیں ناخدا کا احساں — کہ جہاں سفینہ ڈوبا وہی بن گیا کنارا

کرن پھوٹتے کو ہے خورشید کی — شب غم کے ڈوبے ستاروں کے بعد

سے کے گا نرمی کون لے تہذیب — صبا کان پھولوں کے بھر جائیگی

فطرت

عبد العزیز

والد محترم کے اچھے "علمی ذوق" اور پہلے "ڈاکٹر طاہر" اور بعد میں جناب مولانا الکا... سے تلمذ کے باوجود کم فرصتی اور افتادِ طبع کے باعث نہ تو علمی ذوق کی سب آرزو و ترتیب ہو سکی اور نہ ہی عروض سخن سے کماحقہ بہرہ یابی ہوئی۔ بہرحال، جس قدر فرصت اور مہلت میسر ہوئی ... کی بیداری کے بعد ملا کی۔ وہ بیشتر ادبی مشاغل ہی کی نذر ہوئی۔ راولپنڈی میں قبل از تقسیم کے ادبی ہنگاموں سے اپنا نام علیحدہ کرنا ناممکن سا ہے۔ تقسیم وطن کے فوراً بعد بھی پاکیزہ تر ادبی مجالس کی تنظیم کی عزت جس حلقہ احباب کو حاصل ہے۔ اس میں قادم کا شمول بھی ہے۔

عمر چھیالیس سال، ملازمت محکمہ ڈاک، عمر بھر میں بجز دو ایک دوہوں کے غزل سے زیادہ قرابت نہیں رہی البتہ تقسیم وطن کے بعد کی وجوہ سے دل کو اطمینان یا قرار نہیں ہے۔ اسی سے قبل از تقسیم اور بعد از تقسیم کی شاعری میں کافی نمایاں فرق ہے۔ غزل اور نظم دونوں سے شغف ہے۔ قلمی ناموں سے شعر بھی کافی کہے۔ ... کسی خاص مدرسہ فکر کی تقلید نہیں کرتا۔ شعر کی پاکیزگی کا خیال ضرور رہتا ہے۔ اور پابندیوں کا احترام بھی۔

احساس نے ہر زاویہ سے راہبری کی — بدلی کبھی صورت نہ مری کم نظری کی

وارفتۂ غم ضبطِ فغاں پر نہیں قادر — ان کی نگہ لطف نے کیا پردہ دری کی

اندازہ ہیں کیا میری پریشاں نظری کے — ناساز طبیعت ہے غم چارہ گری کی

کیفیت نگہِ دوست بیاں ہو نہیں سکتا — گم شعر ہے زباں آج مری خوش نظری کی

اسرارِ محبت کوئی ظاہر نہیں کرتا — رہ رہ کے نہ پوچھو مری آنکھوں کی تری کی

فطرت کے مصائب پہ ہیں دنیا کی نگاہیں
کیا خوب زمانے نے سزا بے ہنری کی

قابلؔ

عبدالرحیم اجمیری

عمر ۲۵ سال ہے، نام عبدالرحیم، عرائض نویسی کا کام کرتا تھا لیکن تقریباً دو سال سے بیکار ہوں، تپ دق کا مریض ہوں، زندگی اور موت میں رسہ کشی ہو رہی ہے خدا جانے کون کامیاب ہوگا اجمیر آبائی وطن ہے، تیرہ سال کی عمر سے ذوقِ سخن ہے مطالعہ کی کوئی حد نہیں ہے لیکن کسی یونیورسٹی کی سند نہیں رکھتا حضرات ارمانؔ اور معنیؔ اجمیری کو بالترتیب کلام دکھایا۔ لیکن کسی کا رنگ غالب نہ آیا۔ اپنا علیحدہ راستہ اختیار کیا۔ نثر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ ذریعہ فکر صرف نظم اور غزل ہے۔ شعر کہنا روزانہ کا عمل ہے خلوت ہو یا جلوت سفر ہو یا حضر غرض ہر وقت اور ہر ماحول میں شعر کہہ لیتا ہوں، اصناف سخن میں غزل کو زیادہ طبعی اور وسیلع سمجھتا ہوں لیکن اسے محض "عورت سے باتیں" کرنے تک محدود رکھنے کا قائل نہیں میرے نزدیک غزل میں زندگی کے اہم سے اہم مسائل کا حل بھی مشکل نہیں لیکن اس سے نظم کی اہمیت اور ضرورت کم نہیں ہوتی وہ بھی ایک بہتر اور مستقل صنف ہے جسے زندہ اور ترقی پذیر رہنا چاہیئے ادب برائے زندگی کی تقسیم خلوص اور تنوع کے لئے مضر ہے ملیاقت اور زبان کے سلسلہ میں بھی محتاط رہتا ہوں بسیار گوئی کے باوجود جو کچھ کہتا ہوں خوب سوچ سمجھکر کہتا ہوں۔ نمونے کے طور پر چند اشعار حاضر ہیں خوب و زشت کے فیصلہ پر آپ قادر ہیں۔

بہت نازک ہیں آدابِ محبت — نظر سے کام لیتا ہوں جبیں کا
تم نے پیمانِ محبت تو کیا تھا لیکن — اپنا عہد یاد نہیں تو مجھے شکوا بھی نہیں
سوچتا ہوں تو وہ جان سے بھی زیادہ ہیں عزیز — دیکھتا ہوں تو نظر آتے ہیں بیگانے سے
چاہتا ہے نظم محفل اک مکمل انقلاب — چند شمعوں کے بھڑکنے سے سحر ہوتی نہیں
تیرا اندازِ تغافل ہے جنوں میرا آج کل — چاک کر لیتا ہوں دامن اور خبر ہوتی نہیں
سنا رہا ہوں فسانہ غم مگر توجہ کہاں ہے تیری — میں تجھ سے باتیں بھی کر رہا ہوں مجھے ترا انتظار بھی ہے
ان کی تجلیوں کا تعلق تو دل سے ہے — کرتے ہیں لوگ چاک گریباں نہ جانے کیوں

پہٹ کر دور ہی منزل سے غم میں رو لئے اکثر — غبارِ کارواں ہیں ہم غبارِ کارواں ہم سے
ترے سکوت نے پہونچا دیا کہاں مجھکو — زباں بہکنے لگی حالِ دل سنانے میں
ہمارا کیا ہمیں تو ڈوبنا ہے ڈوب جائینگے — مگر اے موج تو پہونچی لبِ ساحل تو کیا ہوگا
ابھی تو راہبر و گرمِ سفر ہیں شوقِ منزل میں — مگر جب سامنے آجائیگی منزل تو کیا ہوگا
خود اس کی زندگی اب اس پہ برہم ہوتی جاتی ہے — تمہیں ہوگا کبھی پاسِ خاطرِ قاتل تو کیا ہوگا
اک غمِ خانماں خراب کے بعد — کوئی قابل کا یہاں نہ ہوا
شرابِ شوق سے آنکھ تو بیخودی ہو جاتے — وہ ابھی جائیں تو ہم اپنا انتظار کریں
بھول جانے کا جیسے تم سے کیا تھا وعدہ — جانے کیوں مجھکو وہی بات بہت یاد آئی
آج ہی شکوہ پیدا دکا آیا تھا خیال — آج ہی تیری مدارات بہت یاد آئی
شمع پر جیسے رات بھاری ہے — میں نے یوں زندگی گذاری ہے
دل کی دھڑکن پہ اعتبار نہیں — ورنہ آواز تو تمہاری ہے
تلخئ روز و شب ارے توبہ — عمر گذری نہیں گذاری ہے
مجبور ہے شبنم رونے پر ہنسنے کا اسے مقدور نہیں — ہم اپنی خوشی سے روتے ہیں شبنم کی طرح مجبور نہیں
کیا سوچ چکے اہلِ ساحل نے پیمانِ محبت توڑ دیا — ساحل سے سفینہ دور سہی طوفان تو لیکن دور نہیں
ساغر چھوا بھی ہو تو مرے ہاتھ ٹوٹ جائیں — ناصح میں کیا کروں وہ نظر سے پلا گئے
اس طرح محوِ انتظار ہوں میں — جیسے اب مجھکو انتظار نہیں

قاصد — محمد اسمٰعیل خاں کرنالی

تخلص حضرت داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل ہے یکم نومبر ۱۸۸۶ء میں اپنے ننھیال بمقام موضع ڈیرکی نزد کونجپورہ ضلع کرنال میں پیدا ہوا ۱۹۰۵ء میں جناب داغ دہلوی کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔

محبت میں بشر مجبور ہے بیدار رہ نہیں سکتا — گوارا اس کا اگرچہ جانتا ہوں دوزاری ہے
آج فہرستِ عاشقاں دیکھی — نام مجنوں سے میرا اوّل ہے

قمرؔ انوار القدوس شمیمی کانپوری

میں نے جب ہوش سنبھالا تو خود کو انوار القدوس پایا۔ ابھی تک اس کی تحقیق نہیں کر سکا کہ یہ نام کس نے رکھا لیکن اس کے متعلق مختلف روایتیں خاندان میں مشہور رہیں۔ خیر آپ کو اس سے کیا؟

آپ یقین فرمائیے میرا نام انوار القدوس ہے اور تخلص قمرؔ شمیمی اس لئے کہ حضرت شمیمؔ کانپوری مدظلہ سے فنِ شاعری میں استفادہ کیا ہے۔ اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں کانپور میں پیدا ہوا۔ اب آپ تاریخ اور وقت پوچھیں گے تو اس کا بتانا بہت مشکل ہے۔ بہرحال میرا سنِ پیدائش یہی ہے۔ میری عمر کا اندازہ آپ بآسانی لگا سکتے ہیں۔ میری ابتدائی تعلیم حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے ہوئی پھر مسلم کالج کانپور میں داخلہ لے لیا اور میٹرک کرنے کے بعد چند مجبوریوں کی بنا پر سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیا۔ شعر و شاعری کا ذوق اس زمانہ میں عام ہے لیکن میرا ماحول کچھ ایسا تھا کہ شروع ہی سے مجھے شعر کہنے اور سننے کا ذوق پیدا ہو گیا اور یہ ذوق ترقی کرتے کرتے اِن منازل پر پہونچ گیا کہ مجھے اپنے کلام کو اغلاط سے پاک رکھنے کے لئے استاذی حضرت شمیمؔ کانپوری کے دامنِ فیض کا سہارا لینا پڑا۔ اگرچہ ابتدا میں چند غزلیں اپنے دادا مولوی حفیظ اللہ صاحب حفیظؔ کو بھی دکھلائیں۔ جب دادا مرحوم نے انتقال فرمایا تو سنہ ۱۹۴۲ء میں اپنے مخلص ترین دوست جناب جلیلؔ فتحپوری کے ذریعہ استاذی موصوف کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ان کی رہنمائی سے ہر طرح مطمئن ہوں۔

سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد میں پاکستان آگیا۔ اور لائلپور میں زندگی کے بقیہ دن گذار رہا ہوں۔ میں نے قدرتاً دردِ بھرا دل پایا ہے۔ آپ میرے کلام میں جگہ بہ جگہ سوز و الم کی چاشنی پائیں گے۔ میں ادب میں کسی ہنگامہ خیزی کا قائل نہیں ہوں اس کا اندازہ آپ کو میرے کلام سے ہو جائیگا۔

گو لاکھ بار اُن کا سامنا ہوا   اک بار بھی نہ حرفِ تمنّا ادا ہوا

مجھ سے قائم ہے رفتارِ نبضِ جہاں — میں جہاں رک گیا، رک گیا کارواں
تیری دلکش تجلّی سے معمور ہے — آرزوؤں کا نکھرا ہوا گلستاں
اسی سمت اہلِ دل کی ہیں لگی ہوئی نگاہیں — وہ جگہ حسین ہے اب تک کہ جہاں ملے تھے ہم تم

معاذ اللہ میرے غم کے اثر سے — حسیں آنکھوں میں تاباں ہیں گہر سے
ترے صدقے میں روشن تر ہے ساقی — مری شامِ الم نورِ سحر سے
کسے جل جل کے مرنا تھا گوارا — مگر اک ربط ہے برق و شرر سے
شکست اکثر ہوئی اہلِ چمن کو — خود اپنے اعتمادِ بال و پر سے

دونوں عالم کو درِ یار پہ قرباں کر دوں
دیر کیا چیز ہے کعبے کی حقیقت کیا ہے
دل میں ہے ذوق تو منزل پہ پہونچ جائینگے
جادۂ عشق میں رہبر کی ضرورت کیا ہے

رکے ہوئے تھے جو آنسو ہماری آنکھوں میں
چھلک پڑے جو انھیں آج مہرباں دیکھا

سحر بھولے سے بھی اک دن نہ آئی — قیامت بن گئی شامِ جدائی
تصور اس حسیں کا اللہ اللہ — میں یہ سمجھا نسیمِ صبح آئی

دکھلائیے جھلک نہ کرم کی عتاب میں — مجھکو سکوں پسند نہیں اضطراب میں
ساقی کی چشمِ مست میں جو پا رہے ہیں ہم — وہ کیف وہ سرور کہاں ہے شراب میں
محسوس ہو رہا ہے یہ مجھکو ترے بغیر — تاروں میں ہے چمک نہ ضیا آفتاب میں

جو رنج و غم سے کھیلے ہر قدم پر — اُسے حاصل نشاطِ زندگی ہے
کہاں میں اور کہاں وہ بزمِ رنگیں — سمجھتا ہوں فریبِ بیخودی ہے

قمر

عنایت اللہ خاں چوہان

میں ۱۴ جولائی ۱۹۳۱ء کو ضلع راولپنڈی کے ایک دورافتادہ گاؤں عثمان زادہ اوڈھرہ میں پیدا ہوا۔ یہ گاؤں تحصیل گوجرخان کے بنجر اور پتھریلے علاقہ میں واقع ہے جو پھوٹو ہار کے نام سے مشہور ہے۔ اس علاقہ میں مسلمان راجپوت خاندان کثرت سے آباد ہیں۔ آپس کے لڑائی جھگڑے ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ راجپوتوں کی سی سج دھج خودداری اور شجاعت اُن میں اب بھی باقی ہے ان کی رگوں میں اب بھی راجپوتی خون دوڑ رہا ہے ان میں سے ایک قبیلہ چوہان کا ہے راقم الحروف اسی گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ والدین کے تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے میں نے اچھی تربیت حاصل کی اور یہی وجہ ہے کہ بچپن سے مجھے شعر کہنے کا شوق تھا میری ہمشیرہ نے میرے ذوق کو اُجاگر کرنے میں کافی حصّہ لیا اور قمر کا تخلص مجھے اپنی بہن شاہ بیگم کی طرف سے تحفتہً ملا۔ والدصاحب مسلم لیگ کے جاں نثاروں میں سے تھے ان کے نظریات کا مجھ پر بھی اثر پڑا اور بعض وقت قائداعظم مرحوم کی شان میں کچھ اشعار کہے۔ ایک شعر ملاحظہ فرمایئے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مجھے خود بابائے ملت سے کتنی عقیدت تھی۔

واحد ہے اپنی قوم کا لیڈر یہی قمر
بے تاج بادشاہ ہے محمد علی جناح

میں نے اسلامیہ ہائی اسکول گوجرانوالہ سے میٹرک کیا اور شعر کہنے کی ابتداء نہم جماعت ہی سے ہوگئی جب نویں جماعت نے سابقہ رواج کے مطابق دسویں جماعت کے فارغ ہونے والے طلبہ کو الوداعی پارٹی دی۔ تو سپرنٹنڈنٹ بورڈنگ ہاؤس نے مجھے چند الوداعی اشعار پڑھنے پر مجبور کیا جب میں نے جلسہ میں حکم کی تعمیل کی تو حاضرین نے میری ہمت افزائی کی اور یہ شعر خاص طور پر بہت پسند کیا گیا۔

چھوڑ کر جاتے ہیں تجھکو کیا کریں ؟ مجبور ہیں
مادر علم و ادب! لاچار ہیں معذور ہیں

ستمبر ۴۸ء میں گورنمنٹ انجنیرنگ اسکول میں داخلہ کے لئے مقابلہ کا امتحان دے رہا تھا صرف ایک پرچہ باقی تھا کہ حضرت قائداعظم مرحوم کی جانکاہ موت کی خبر سنی پیروں کے

نیچے سے زمین نکل گئی اور بے ساختہ آنسو نکل پڑے۔ اس عالم میں بے اختیار قلم نے ایک مصرعہ جاذب پر لکھ دیا۔

رو رہا ہے قوم کا ہر ہر نفس تیرے لئے

آخر میں میرا رنگ بدل گیا اور میرے اشعار میں سوز و گداز کا رنگ جھلکنے لگا۔ میں نے ہر صنف میں کچھ نہ کچھ کہا ہے لیکن اس وقت میں اپنی منظومات کے ایک دو بند آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں اس سے زیادہ کا خود کو اہل نہیں سمجھتا۔

آج کل بحیثیت اوورسیر فتح جنگ ضلع اٹک میں کام کر رہا ہوں مستقبل کی خبر اللہ جانے

یادِ رفتہ

وہ پُرکیف منظر وہ راتیں سہانی	ہوئی چاند کی جب مکمل جوانی
وہ تجھے ساتھ کیا شادمانی	دلاؤ نہ اب یاد بھولی کہانی
خدا کے لئے اب نہ تم یاد آؤ

دل آویز و دلکش وہ نازک اشارے	وہ پُرلطف و پُرکیف رنگیں نظارے
وہ زلفوں پہ افشاں کے روشن ستارے	مگر اب نہ عہدِ گذشتہ پکارے
خدا کے لئے اب نہ تم یاد آؤ

وہی کالی گھٹائیں ہیں وہی فصلِ بہاراں ہے
وہی ٹھنڈی ہوائیں ہیں۔ وہی صحنِ گلستاں ہے
وہی مہکی فضائیں ہیں وہی ماہِ درخشاں ہے
مجھے ہر شے میں لیکن اک کمی معلوم ہوتی ہے

وہی رنگیں نظارے ہیں وہی پُرکیف موسم ہے
وہی گلہائے خنداں ہیں وہی نشیلی شبنم ہے
وہی سُرخی شفق کی ہے وہی گنگا کا سنگم ہے
مجھے ہر شے میں لیکن اک کمی معلوم ہوتی ہے

قمر

عبدالحمید ریئی

نام عبدالحمید اور تخلص قمرؔ ہے ۱۳۴۳ھ کی پیدائش ہے ۱۹۳۹ء سے شاعری کا شوق ہوا۔ ۲۶۔ مارچ ۱۹۴۶ء کو نوحؔ ناروی کی شاگردی اختیار کی۔ آج کل ماہنامہ "نیرنگ خیال" کا سب ایڈیٹر ہوں۔ موجودہ دور کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

میری بلند نگاہی کی داد دے صیّاد
سمجھ لیا ہے قفس ہی کو آشیاں میں نے

یہ حادثہ گو زمانہ گزرا نظر میں ہے ایک ایک منظر
یہاں لٹے تھے۔ یہاں رکے تھے۔ یہاں پہ ٹھیرے یہاں سے گزرے

لوگوں کی نظر کہیں نہ لگ جائے
لوگوں کی نظر ہے آشیاں پر

مسکراتا بھی نہیں اب ہیں قمرؔ اس ڈر سے
مسکراہٹ نہ کہیں آہ و فغاں تک پہنچے

لو بجھ وہ مریض غم نے پھیرا
وہ شمع بجھی ہوا سویرا

گھٹتی رہیں تابشیں جنوں کی
بڑھتا رہا عقل کا اندھیرا

قیصر

قیصر حسنی

سن پیدائش ۱۹۲۶ء وطن مالوف بریلی (یو۔ پی)

منزل اسی کا نام ہے دم توڑ دیں جہاں
قدموں سے نقش راہ گذاروں کے حوصلے

دینے لگے خزاؤں کو تعلیم رنگ و بو
کتنے نکھر گئے ہیں بہاروں کے حوصلے

قیصر اختر حسین نظامی

زیادہ تر لوگ مجھے اختر حسین کے نام سے جانتے ہیں ویسے ادبی حلقوں میں قیصر نظامی کے نام سے معروف ہوں۔

میرے والد محمد یحییٰ صاحب نظامی اٹاوہ کے باحیثیت اور مشہور تاجروں میں سے تھے اور اب کراچی میں مقیم ہیں۔

شاعری کی ابتدا اوائل عمری سے ہوئی اور اب جیسا کہتا ہوں وہ آپ کے سامنے ہے۔

ہے گلستاں میں کون یہ محوِ خرامِ ناز — موتی بکھرے ہیں دامنِ فصلِ بہار میں

دیا ہو جس نے مجھے ہنس کے لاکھ بار فریب
اب اُس کے اشکوں کا کس طرح اعتبار آئے

لحد میں آرزو جاگی کہ زندگی مل جائے
مرے مزار پہ وہ ایسے بے قرار آئے

قیصر افتخار حسین صدیقی

عمر ۳۳ سال۔ وطن۔ قصبہ بلہور ضلع کانپور۔ تلمیذ حضرت دل شاہجہانپوری

اک کشتِ اضطراب ہی اک سمت حسین ہیں — وہ جانِ زندگی مجھے ٹھہرا گیا کہاں
آنسو بھی زندگی کی طرح ختم ہو چلے — قیصر ہوا ہے قرضِ محبت ادا کہاں
اُن کو خود اپنے حُسن کا احساس بھی نہ تھا — لیکن مری نگاہ نے پہونچا دیا کہاں
یہ شوقِ چاکِ گریباں سے رسمِ فرسودہ — نئے قواعدِ وحشت بنا رہا ہوں میں

کسریؔ
غلام حسن منہاس

نام غلام حسن تخلص کسریؔ والد ماجد کا نام میاں برخوردار خان منہاس میں ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو بمقام "سید" ضلع راولپنڈی پیدا ہوا۔ سید مشہدی سادات کی ایک قدیم اور مردم خیز بستی ہے جہاں سے بڑے بڑے فقیہہ قرآن خواں، ادیب و شاعر پیدا ہوئے۔ میرے جد امجد تقریباً چار سو سال قبل مسلمان ہوئے اور ریاست جموں و کشمیر سے چکوال ضلع جہلم کے مضافات میں آکر سکونت اختیار کی۔ اور اب سے قریباً دو سو سال پہلے خانگی تنازعات کی بنا پر سید میں آکر آباد ہوئے۔

ابتدائی تعلیم ڈسٹرکٹ بورڈ اسکول میں ہوئی ۱۹۲۹ء میں خالصہ نیشنل ہائی اسکول (جو اب کاظمیہ ہائی اسکول ہے) سے سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ عربی و فارسی کی تعلیم اپنے عم بزرگوار میاں فضل الدین قرآن خواں سے حاصل کی۔

میری طبیعت انتہائی رواداری حساس واقع ہوئی ہے۔ حقہ نوشی، سگریٹ اور دوسری منشیات سے نفرت ہے۔ صوم صلوٰۃ کا پابند ہوں جناب کی خدمت کرنا میرا محبوب مشغلہ اور مطالعہ زندگی کا بہترین شغل ہے۔ میں نے ہزاروں کتابیں خود خریدیں۔ قدیم مطبوعات اور قلمی مخطوطات سیکڑوں روپے صرف کر کے مختلف مقامات سے حاصل کیے ہیں۔ اب بھی تقریباً نصف آمدنی اچھی کتابوں کے حصول میں صرف ہو جاتی ہے۔

میں فوج میں گیارہ سال سے ملازم ہوں۔ فوج میں ہوتے ہوئے بھی تحقیق و جستجو اور علم و فن کا مطالعہ برابر جاری ہے۔ جہاں اور جس طرح سے کوئی کتاب ملے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ فن تاریخ گوئی جو مشکل ترین صنف سخن ہے میرے لئے شعر گوئی سے زیادہ توجہ کش ہے۔ میں نے اس فن کی تحقیق و جستجو۔ اور مختلف اختلافی مسائل کے متعلق کافی مضمون ملک کے متعدد رسائل میں لکھے ہیں۔ حضرت لسان القوم مولانا صفی لکھنوی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی ذات ستودہ صفات سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ فن تاریخ کے مشکل اور نازک ترین مسائل میں نے ان سے حل کیے ہیں۔ اکثر مضامین جو میں نے لکھے ہیں ان میں ان کے خطوط کے حوالے دیے ہیں ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء

تک رسالہ "ساربان" لاہور کے حصۂ نظم کا ایڈیٹر رہا ہوں۔ اور حصۂ نظم کو خاص طور سے میں نے ترقی دی تھی۔

منشی محمد حیات بخش فرحت مرحوم کی صحبت میں طبیعت خود بخود شاعری کی طرف مائل ہوئی ابتدا میں خواجہ عشرت لکھنوی مرحوم کی شاعری کی کتب سے استفادہ کیا پھر حضرت عشرت ہی سے کلام کی اصلاح کے لئے استدعا کی۔ انہوں نے پیرانہ سالی کا عذر فرما کر حضرت جلیل القدر امام الفن حضرت جلیل مانکپوری مرحوم سے رجوع کرنے کو لکھا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں حضرت جلیل کے تلامذہ میں شامل ہو گیا قبلہ مرحوم کیونکہ عدیم الفرصت رہتے تھے۔ اس لئے اصلاح کلام میں بہت دیر ہوتی تھی اس لئے میں نے ۱۹۳۴ء میں خاندانِ امیر مینائی ہی کے ایک دوسرے صاحبِ فن بزرگ اعتبار الملک لسان الدہر حکیم الشعراء حضرت دل شاہجہاں پوری سے بھی رجوع کیا۔ اب میں کسی سے اصلاح نہیں لیتا۔

تصانیف میں فن تاریخ گوئی کی ایک بے مثال کتاب زیر تصنیف ہے۔ مختلف تاریخی اور ادبی مضامین کا ایک مجموعہ بھی تیار ہے جو ہنوز طبع نہیں ہوا مختصر سا ایک دیوان بھی ہے جو مختلف اصنافِ سخن پر مشتمل طباعت کے انتظار میں ہے۔ اس سے زیادہ میرے حالاتِ زندگی اور کچھ نہیں۔

انتخابِ کلام

مقصودِ دو جہاں ہے محبت حسینؑ کی — محبوبِ انس و جاں ہے محبت حسینؑ کی
اُس پر فضائے خلد کی تابانیاں نثار — جس دل میں ضوفشاں ہے محبت حسینؑ کی
جس کا کنارہ ایک ازل دوسرا ابد — وہ بحرِ بیکراں ہے محبت حسینؑ کی
قطرہ ہے اس کے فیض کا کوثر ہے جس کا نام — وہ چشمۂ رواں ہے محبت حسینؑ کی

رہبر کوئی اپنا ہے نہ منزل ہے نظر میں — ہم صورتِ پرکار ہمیشہ ہیں سفر میں
کیوں چارہ گرِ عشق اسے چھیڑ رہا ہے — مشکل سے جگہ درد نے پائی ہے جگر میں

ابھی نظر میں ہے وہ حسنِ لاجواب ترا — کہ تھا گلِ چمنِ آرزو شباب ترا
ادا ادا پہ مسرت نثار ہوتی تھی — قدم قدم پہ مچلتا تھا جب شباب ترا
وہ مثلِ بید لرزتا ہوا سوال مرا — وہ مثلِ تیر کھٹکتا ہوا جواب ترا
وہ جبیں پہ چاند کی کرنیں پھسل پھسل جائیں — اسی جبیں پہ وہ عالم دمِ عتاب ترا
فضائے خلد کے نظارے تھم تھم لئے ہوئے — حسین چہرے سے اٹھا ہوا نقاب ترا

وہ عشقِ جنونِ مطلق ہے جس کو ہو نہ پاسِ خود داری
جو مہر و وفا سے بے حس ہو اظہارِ سرِ محفل کر دے

ہے کشتیِ دل منجدھار میں اب اور پاس اثرِ امید نہیں
اک ڈوبنے والے کو یا رب ساحل میں لپٹا حل کر دے

یوں راہِ وفا میں مر مٹنا گر لے آرزوئے دل کیا ہوگا؟
جینے کا نتیجہ تو دیکھا مرنے سے حاصل کیا ہوگا!

اے بحرِ حوادث کے طوفاں کیا خوف جو ہیں منجدھار میں ہوں
وہ کھیلے جو اٹھتی موجوں سے شرمندۂ ساحل کیا ہوگا؟

محرومِ نظر مایوس اثر یہ عالم ہے ناکامی کا
اس دردِ مسلسل کا انجام اے بیکسیٔ دل کیا ہوگا؟

جلوۂ امید سے جو جگمگا سکتا نہیں — یاس کی ظلمت میں وہ اک ذرۂ برباد ہوں
مثلِ گلِ خنداں بھی ہوں اور ہے گریباں چاک بھی — جس کو عالم شادماں سمجھا ہے وہ ناشاد ہوں

گریہ کا اثر شام و سحر ڈھونڈ رہا ہوں — اٹھتی ہوئی موجوں میں گہر ڈھونڈ رہا ہوں
ہے حسن کی فطرت سے وفا کی مجھے امید — شعلوں کی لپک میں گلِ تر ڈھونڈ رہا ہوں

تجکو لے بے خبر ہو گیا ہے — کھو کے عالم سے ڈھونڈتا کیا ہے
مٹ کے دیکھو رہِ محبت میں — دل کی افتادگی میں مزا کیا ہے
پھر امیدوں کا دل سے گہوارہ — ہائے نیرنگیٔ وفا کیا ہے

میری افسانہ ہستی کا ساماں ہو گئیں — خون کی جو چند بوندیں زیبِ مژگاں ہو گئیں
کیا کہوں میری تمناؤں کو آیا کیا خیال — پھر گرفتارِ فریبِ عہد و پیماں ہو گئیں

غنیمت ہے وہ شب ہے مری ناکامیِ دل پہ
کہ بڑھ جاتی ہے ظلمت اور بھی اس کی سحر ہو کر

عشق میں بھی حسن کا انداز ہونا چاہیئے — کچھ نہ کچھ ربطِ نیاز و ناز ہونا چاہیئے
چاک دامانی سے پہلے حسن تھا کیسے حجاب — دل کو اندازِ جنوں پرناز ہونا چاہیئے

کہیں بھی خبر نہیں اپنے آشیانے کی — یہ کہہ رہی ہے پریشاں ہوا زمانے کی
جو رہ ہیں چھپیں سختیاں زمانے کی — تلاش ان کو بھی ہے اب مرے فسانے کی

ذرا میں عمرِ گزشتہ سے پوچھ لوں تو کہوں — مجھے تو یاد نہیں تلخیاں زمانے کی
تغیراتِ جہاں سے یہی ہے اندیشہ — کہ مٹ نہ جائیں کہیں تلخیاں زمانے کی
بتا نہ دو انھیں کسری کہ یہ زبان نہیں
سند جو ڈھونڈھتے پھرتے ہیں نغمہ گانے کی

نیازِ بے اثر کی نازبرداری پہ روتا ہوں — وہ برہم ہیں میں انجامِ پرستاری پہ روتا ہوں
ہوئے ہیں خشک آنسو شدتِ جوشِ محبت سے — وفائے عشق میں آنکھوں کی ناداری پہ روتا ہوں
ابھی اک جلوۂ دلکش نگاہوں کے مقابل تھا — کھلی جب آنکھ تو میں اپنی بیداری پہ روتا ہوں

خاک ہونا دلیلِ ہستی ہے — کس بلندی پر اپنی پستی ہے
کاوشِ عشق دل کی ہستی ہے — جان دے کر ملے تو سستی ہے
میری ہستی بھی کوئی ہستی ہے — زندگی موت کو ترستی ہے

منزل کی کچھ خبر نہیں گھبرا رہا ہوں میں — پھر بھی یہ حال ہے کہ چلا جا رہا ہوں میں
کچھ حسن کی ہے فطرتِ خاموش کا خیال — کچھ ضبط سے بھی کام لئے جا رہا ہوں میں
میں کہہ رہا ہوں اور سنے جا رہے ہیں وہ — وہ کہہ رہے ہیں اور سنے جا رہا ہوں میں
کیا یہ بھی انقلابِ زمانہ کا ہے اثر
کل میں کہاں تھا آج کہاں جا رہا ہوں میں

تڑپتے دل کا بیاں نہ سمجھا اُن آنسوؤں کی زباں نہ سمجھا
مرے غمِ زندگی کی وسعت کو آج تک رازداں نہ سمجھا
جو پایا بلبل نے بھید یہ کچھ تو زندگی کو فغاں بنا کر
خموش پھولوں کا اور کوئی جہاں میں حسنِ بیاں نہ سمجھا
جو کہہ چکا ہوں وہ التفاتِ نگاہِ اوّل کی داستاں تھی
جہاں سے آغازِ ماجرا ہے وہاں سے کچھ رازداں نہ سمجھا
میں جان پر کھیل کر بھی ناصح ہوا ہوں نا آشنائے منزل
مری نظر کس مقام پر ہے مجھے تو سود و زیاں نہ سمجھا

کلیم

محمد موسیٰ پالن پوری

محمد موسیٰ نام کلیم تخلص پالن پور وطن۔ آپ پڑھیے موسیٰ کلیم پالن پوری۔ چنانچہ میں اپنے حلقۂ احباب میں اسی نام سے مشہور ہوں۔ اپنی عمر کی اڑتیسویں منزل طے کر رہا ہوں۔
اردو اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد مرحوم حاجی خدا بخش صاحب اور والدہ صاحبہ سے حاصل کی میری بدقسمتی کہ والدہ ماجدہ نے اوائل عمری ہی میں داغ مفارقت دیا۔ اور مجھے سوگوار بنا کر عالم بالا کو سدھار گئیں والد صاحب قبلہ نے جن کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ میری تعلیم و تربیت فرمائی پھر مجھے اپنی ہمشیرہ کے ساتھ بغرض حصولِ تعلیم بمبئی جانا پڑا۔ جہاں میں نے تعلیمی زندگی کے ساتھ عملی زندگی میں بھی قدم رکھا۔ اور تجارتی معاملات میں حصہ لینے لگا۔ کیونکہ میرے بہنوئی بمبئی کے سرکردہ تاجروں میں سے تھے۔

لکھنؤ اور دہلی کی طرح بمبئی ادبی مرکز تو نہیں لیکن اس کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا بمبئی میں مجھے چند شعراء اور ادباء کی صحبت میں باریاب ہونے کا موقعہ ملا۔ اور حقیقت میں میرے ادبی و شعری ذوق نے یہیں سے۔ جلا پائی۔ پھر اس ذوقِ لطیف نے یہاں تک ترقی کی کہ مجبوراً مجھے فکرِ سخن کی طرف آمادہ ہونا پڑا۔

اس عرصہ میں سمندِ ناز پر ایک اور تازیانہ پڑا۔

اور مجھے کچھ تجارتی اغراض کی بنا پر پونا جانا پڑا وہاں سائل علوی جیسے جید عالم سے میری ملاقات ہوئی۔ اور میں ان سے اس درجہ متاثر ہوا کہ میں اپنے کلام کو انھیں دکھانے لگا۔ بعد میں حضرت شاد پونوی (مرحوم) اور حضرت سلیم پونوی۔ جیسے مشاہیر سخن سے اصلاح لی۔ اکثر و بیشتر مواقع پر انھیں حضرات کے ساتھ پونا اور بمبئی کے مشاعروں میں حصہ لیا۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں خلعتِ مہاجرت عطا ہوئی اور اب کراچی میرا مسکن ہے۔

ترے غم کے سہارے کٹ رہی ہے زندگی اپنی
نہ پوری ہو سکی اب تک تمنا کے دلی اپنی

کہاں جائیں کدھر جائیں، زمانہ ہم پہ ہنستا ہے
جہاں جاتے ہیں ہم دنیا اڑاتی ہے ہنسی اپنی

کہیں چل کر محبت کی نئی دنیا بسا لیں گے
اسی پُر کیف عالم میں کٹے گی زندگی اپنی

مر مر کے اے کلیم جئے جا رہا ہوں میں
خونِ غمِ فراق پئے جا رہا ہوں میں

مشقِ جفائے دوست پہ ظلم و جور پہ
دل سے مگر دعائیں دئیے جا رہا ہوں میں

دل بھی الم سے چور گریباں بھی چاک چاک
یوں زندگی خراب کئے جا رہا ہوں میں

ہو جائے گی کبھی تو نمازِ وفا ادا
سجدے جو تیرے در پہ کئے جا رہا ہوں میں

مجھکو کلیم فکر نہیں روزِ حشر کی
آنکھوں میں اک حجاب لئے جا رہا ہوں میں

کلیم

کلیم عثمانی

سن پیدائش سنہ ۱۹۲۶ء وطن دیوبند (یو-پی)

مجھے سب قبول فلک مگر غمِ دوست مجھ سے طلب نہ کر
اسے دل سے کیسے جدا کروں مری عمر بھر کی تلاش ہے

نگاہِ شوق نے کیں ان سے عمر بھر باتیں
زبانِ شوق مگر ہمکلام ہو نہ سکی

کمال

محبوب حسین اکبرآبادی

میری سوانح کچھ نہیں۔ محبوب حسین نام تخلص کمال ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوا۔ اس لئے خود کو اکبرآبادی لکھتا ہوں۔

جوشِ جنوں کا اپنے یہ عالم ہے آج کل
دامن نہیں ہے جیب نہیں آستاں نہیں

ذوقِ تپش سے ہو گیا گلشن تو اس کا غم نہ کر
بازوئے ہمت کو بس پرواز کے قابل بنا

دنیا ہے تو ہمت پہ اور تو رہی
بادِ صرصر کی یہ عنایت ہے

کوکب

محمد نیاز خاں سونی پتی

محمد نیاز خاں نام کوکب تخلص اور سونی پت وطن مالوف ہے تاریخ پیدائش یاد نہیں اور میں اسے کچھ ضروری بھی نہیں سمجھتا -

بس میں یہی جانتا ہوں جو ہوتا ہے اضطراب — آتا ہے جب خیال تمہارا کبھی کبھی
اُن کی تو اچھے اُن کے یہ دیوار و در ہی ہیں — دیدیں جو ناتواں کو سہارا کبھی کبھی
کوکب ہمارا حوصلۂ عزم دیکھکر — موجیں بھی بن گئی ہیں کنارا کبھی کبھی

کیفی

کبیر احمد شمیمی

میرے والد نے میرا نام کبیر احمد رکھا اور میں نے اس کے آگے کیفی کا اضافہ کر لیا یہ اضافہ دراصل میری زندگی میں اضافہ تھا اور اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں نے شعر کہنا شروع کئے - یہ تو یاد نہیں کہ پہلا شعر کب معرض وجود میں آیا اور نہ یہ بتا سکتا ہوں کہ شاعری کا سبب کیا تھا ؟ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ جب کتب بینی کا شوق حد سے زیادہ بڑھا تو یہی شوق میری شاعری کا رہنما بن گیا - چنانچہ سنہ ۱۹۴۲ء میں جب میں رفاہ عام بزم ادب کانپور کا سکریٹری تھا تو میری متجسس نگاہوں نے استاذی حضرت شمیم کانپوری کا انتخاب کیا اور اپنے تشنۂ ذوق کی تکمیل موصوف سے شروع کی - استاذی مدظلہٗ کی بے پایاں کرم فرمائیوں نے مجھے اس قابل بنا دیا کہ آج میں اپنا منتخبہ کلام آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں -

میں ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۲۲ء کو سلطان پور (اودھ) میں پیدا ہوا - رائے بریلی میں ایک قصبہ بچھاؤن ہے - میرے آبا و اجداد وہیں کے رہنے والے تھے سنہ ۱۹۳۰ء میرے لئے بہت منحوس ثابت ہوا اسی سال میرے والد صاحب نے داغ مفارقت دیا اور اللہ کو پیارے ہو گئے - والد مرحوم کی وفات میری تعلیم پر بہت بڑی حد تک اثر انداز ہوئی مجبوراً مجھے اپنی تعلیم میٹرک تک محدود کرنی پڑی - کاش میرے والد میرا ساتھ اتنی جلد نہ چھوڑتے اور میری تعلیم ادھوری نہ رہتی خیر اب اس کا ماتم کہاں تک کیا جائے -

قدرت کی یہ ستم ظریفیاں میری ذات تک ہی محدود نہیں بلکہ میری طرح ہزاروں نفوس ان حالات کا شکار ہیں یہی خیالات میری تسکین کا باعث ہو جاتے ہیں ۱۹۴۷ء سے قبل میں انصار تھا اور اب مہاجر ہوں۔ پہلے رائے بریلی میرا وطن تھا اور اب لائل پور۔ خدا کا شکر ہے کہ کچھ نہیں مگر پاکستانی ہوں۔

نمونہ کلام

نوید مسرت پیام محبت ‏ ‏ ‏ ‏ وہ روئے منور نگاہوں کی جنت
جدھر دیکھتا ہوں برستی ہے رحمت ‏ ‏ ‏ ‏ یہ پیر مغاں میکدہ ہے کہ جنت
محبت کی ہے حاصلی کے تصدق ‏ ‏ ‏ ‏ خدا کی قسم عین حاصل یہی ہے
وہ اپنی تمنا بھی اب مجھ سے ہے بس ‏ ‏ ‏ ‏ اگر واقعی غم کا حاصل یہی ہے

خوشا نصیب تری یاد میں فنا ہونا ‏ ‏ ‏ ‏ کہ ہے دلیل مسرت غم آشنا ہونا

دہرا دے کوئی پھر سے مرا قصۂ حیات ‏ ‏ ‏ ‏ افسردہ پا رہا ہوں بہت بزم کائنات
دردِ فراق ہے کہ ہے سرچشمۂ حیات ‏ ‏ ‏ ‏ صد عیش و صد نشاط ترے غم کی ایک رات
جب سامنا ہوا نہ سلامت رہے حواس ‏ ‏ ‏ ‏ میرے لئے تو قہر ہوئی چشم التفات

اللہ رے کشش مرے حسن خیال کی ‏ ‏ ‏ ‏ تصویر بن گیا ہوں تمہارے جمال کی

کون ہے خوش ادا یہ جلوہ طراز ‏ ‏ ‏ ‏ ذرہ ذرہ ہے آج جنت ساز
حسن کافر ہے الامان انداز ‏ ‏ ‏ ‏ جو ادا ہے وہ ہی قیامت ساز
خود کو دیکھو جو دیکھنا ہے اسے ‏ ‏ ‏ ‏ آئینے میں ہے آئینے کا راز
کیوں نہ کہلائے دیر وجہ حرم ‏ ‏ ‏ ‏ ہے شناسا حقیقتوں سے مجاز
نور تاروں میں رنگ پھولوں میں ‏ ‏ ‏ ‏ جلوہ فرما ہے تو بہر انداز
لے کے انگڑائی روح جاگ اٹھی ‏ ‏ ‏ ‏ جب ازل میں سنی تری آواز
حسن و الفت کا اک کرشمہ ہے ‏ ‏ ‏ ‏ کوئی محمود ہے نہ کوئی ایاز
تو ہی اک منتظر نہیں شب غم ‏ ‏ ‏ ‏ دیکھو کیفی ہے چشم انجم باز

گلزار حسین



سنہ ۱۹۲۵ء میں ضلع جہلم تحصیل چکوال کے قصبہ خانپور میں پیدا ہوا۔ وہیں مڈل تک تعلیم حاصل کی اس کے بعد فیروز پور سے ہائی اسکول کیا کیونکہ میرے والد بسلسلۂ ملازمت وہیں مقیم تھے جہاں تک شعر و شاعری کے ذوق کا تعلق ہے وہ تو ابتدائی زمانۂ تعلیم ہی سے پیدا ہو گیا تھا۔ ذہنی نشو نما کے ساتھ ساتھ میرے افکار بھی جوان ہوتے گئے۔ اور میں اپنے محسوسات کو تخلیقی رنگ دیتا گیا۔

میٹرک کے بعد میں نے سرکاری ملازمت کر لی اپنے ادبی ذوق کی تکمیل کے لئے "ادیب عالم" کیا۔ لیکن سنہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم نے ذہن اور افکار کو اس درجہ متاثر کیا۔ کہ نہ وہ شوق باقی رہا۔ اور نہ وہ ادبی محفلیں۔ اب دل سوگوار ہے اور یادِ ماضی بہ ہر کیف زندگی کسی نہ کسی طرح گذر رہی ہے۔

میرا پہلا افسانہ "کتے" سنہ ۱۹۴۶ء میں لاہور کے کسی ماہنامے میں شائع ہوا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن کہ پھر اس قسم کی جرات نہ ہو سکی۔

میرا پورا نام گلزار حسین ہے۔ تخلص گلزار کرتا ہوں ـــــ اور بس کوئی ایسی خاص بات نہیں جس کا اضافہ کر سکوں۔

میرا کلام کیا ہے۔ اور کیا کہتا ہوں۔ اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ سمجھنے والے سمجھ ہی لیں گے۔ ہاں ادب میں غلط نظریات کا قائل نہیں ہوں"

انتخاب کلام

فصلِ گل معلوم ہوتی ہے خزاں تیرے بغیر ۔۔۔ حسن کی رعنائیاں ہیں رائیگاں تیرے بغیر
روٹھ جانے سے ترے روٹھی ہوئی ہے کائنات
بن گئی ہے زندگی بارِ گراں تیرے بغیر

ان کی نظروں کا مرے دل پر نشاں بنتا گیا
رفتہ رفتہ یہ نشاں برقِ تپاں بنتا گیا

بے حجابانہ وہ میرے سامنے آتے مگر
اُف وہ لمحہ ہی حجابِ درمیاں بنتا گیا

رات تیرے ہجر کا ہم نے کیا اس طرح
دل پہ ہر تارے کی نوک کا اک نشاں بنتا گیا

زندگی میں کوئی لمحہ سازگار آیا نہیں — تیری الفت میں کسی پہلو قرار آیا نہیں
نیم بسمل کی طرح دل کو تڑپتا دیکھکر — خود بتاؤ کس کو رونا زار زار آیا نہیں
تیری فرقت میں گذاریں ہم نے راتیں اس طرح — رات بھر تڑپا کئے لیکن قرار آیا نہیں
خود پکارا ہے کسی نے خود بلایا ہے مجھے — ان کے کوچے میں یونہی بے اختیار آیا نہیں
مدتوں تک دل کے آئینے میں رکھا ہے تمہیں — کیوں یہ کہتے ہو کسی کو تم پہ پیار آیا نہیں

آج محفل میں اسے گلزار ملتی ہے جگہ
زندگی بھر جس کو محفل کا شعار آیا نہیں

محبت کے مارے چکائے گئے ہیں ! — کہ ہم بے دفا پھر بنائے گئے ہیں۔
مرا جرم پوچھو تو بتاؤ خدارا — نگاہوں سے تیری گرائے گئے ہیں
کوئی حد بھی ہے تیرے جور و ستم کی — ہزاروں ستم ہم پہ ڈھائے گئے ہیں

دم نزع بالیں پہ میری نہ آئیں
کہیں ایسے صدمے اٹھائے گئے ہیں

گوہر

سیّد مظفر حسین

میرا اصل نام مظفر حسین ہے گوہر تخلص کرتا ہوں۔ شاید اسی وجہ سے لوگ مجھے مظفر حسین گوہر کے نام سے جانتے ہیں۔ میں ۸ ستمبر ۱۹۱۸ء کو ضلع لاہور کے ایک معمولی سے دیہات وان، رادھا رام میں پیدا ہوا۔ میرے والد ماجد کا اسم گرامی سیّد اشتیاق احمد ہے۔ میرے آبا و اجداد گنگوہ شریف ضلع سہارنپور۔ یو۔پی کے رہنے والے تھے۔ میرا ننہال موضع آدم کے تحصیل ڈسکہ ضلع سیالکوٹ ہے۔ میں نسلاً بخاری سیّد ہوں۔ اتفاق سے میرا کوئی اور حقیقی بھائی یا بہن نہیں ہے۔ اس لئے والدین کا اکلوتا نورِ نظر ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں اپنے والدین کی نظروں میں بہت عزیز ہوں۔ میری دو بہنیں بچپن ہی میں میرا ساتھ چھوڑ کر اپنے ربِّ حقیقی سے جا ملیں۔ صحیح طور سے اپنی عمر کا اندازہ میں خود نہیں لگا سکتا لیکن کچھ کچھ گمان ضرور ہے کہ میں زندگی کی بتیسویں منزل میں ہوں۔

ابتدائی زندگی و تعلیم:۔ میری ابتدائی تعلیم وان رادھا رام کے پرائمری اسکول میں درجہ پنجم تک ہوئی۔ میرے والد نے میری تعلیمی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے۔ مجھے کچھ عرصہ کیلئے ۱۹۳۱ء میں شملہ اپنی خالہ کے یہاں بھیج دیا۔ میرے خالو مرزا عبدالحق صاحب اس وقت محکمہ۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں اوورسیر تھے۔ میرے خالہ زاد بھائیوں کے ادبی مباحثے میری جودتِ طبع کو ابھارنے میں بہت مددی۔ شملہ میں میں نے ایک سال کے مختصر عرصہ میں بڑی دلچسپی اور باقاعدگی کے ساتھ تعلیم حاصل کی۔ جو میرے مستقبل کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ اگرچہ طبیعت میں شعری ذوق شروع ہی سے موجود تھا لیکن شملہ کے علمی ماحول نے اس کو اور جلا دی۔

سچ پوچھئے تو میرا ادبی ذوق شملہ ہی میں پروان چڑھا اگرچہ اُس وقت شعر کہنا اور شعر کا سمجھنا میرے فہم و ادراک کی دسترس سے باہر تھا۔ لیکن شعر سننے اور پڑھنے سے میرے ذہن کو ایک گونہ لذّت محسوس ہوتی تھی۔

ایک سال شملہ رہنے کے بعد میں گھر واپس چلا آیا۔ والد صاحب نے مجھے پھر دیہاتی اسکول میں داخل کرا دیا۔ لیکن میری طبیعت کو دیہاتی ماحول راس نہ آیا اور مجبوراً تعلیمی سلسلہ منقطع کر دینا پڑا۔ لیکن میں نے اپنے ادبی

ذوق کو زندہ رکھنے کے لئے شعراء کے دواوین اور ادبیات کی بہترین کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ میرا ادبی ذوق جنون کی حد تک پہونچ چکا تھا۔ میرے والد نے اس سے باز رکھنے کے لئے مجھے زمیندارانہ اور تجارتی ماحول میں ڈھالنا چاہا۔ لیکن محض والد ماجد کی خوشنودی مزاج کے لئے ان کا تھوڑا بہت ہاتھ بٹایا۔ ورنہ سچ پوچھئے تو اس زندگی میں بے کیفی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

ازدواجی زندگی :- اسی دوران میں والد نے اکتوبر ۱۹۳۵ء میں میری شادی دہلی کے ایک معزز گھرانے میں کر دی۔ میری بیوی محمودہ بیگم جو دہلی کے محلہ چوڑیوالان کے پیرزادہ ظہیرالدین صاحب پانی پتی ٹیکس سپرنٹنڈنٹ کی صاحبزادی ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میری ازدواجی زندگی بڑی کامیاب ہے۔ میری بیوی میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک مشرقی خاتون کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں۔ خدا کے فضل سے اس وقت میں پانچ لڑکوں اور دو لڑکیوں کا مستقل طور پر باپ بن چکا ہوں۔ اور آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

شاعری کی ابتدا :- جہاں تک مجھے یاد ہے میری شاعری کی ابتدا ۱۹۳۳ء کے اوائل میں باقاعدہ طور پر ہوئی۔ ابتداء میں میں نے قبلہ حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی رحمتہ اللہ علیہ سے رجوع کیا۔ اور انہیں کے فیض بے پایاں کی بدولت اپنی منزل پر پہونچ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ حضرت اعجاز صدیقی ایڈیٹر رسالہ شاعر آگرہ حال بمبئی حضرت جوش ملسیانی حضرت نوح ناروی کے گرانقدر مشوروں سے منازل شاعری طے کر رہا ہوں۔ آگرہ اسکول قصرالادب کی طرف سے مجھے ہمدرد ادب اور مفکر ادب کے خطابات سے بھی نوازا گیا ہے۔ مشاعروں کی کثرت سے گریز کرتا ہوں مجھے یاد ہے کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں ہارڈنگ لائبریری کے زیر اہتمام ٹاؤن ہال دہلی میں ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا جس کی صدارت اعلیٰ حضرت ہز ہائی نس نواب آف رامپور نے فرمائی تھی۔ میں اسی دوران میں کسی ضرورت سے دہلی گیا ہوا تھا۔ کہ وہاں کچھ حضرات کے شدید اصرار کی وجہ سے میں بھی مذکورہ بالا مشاعرے میں شریک ہوا۔ اور نواب رامپور کی طرف سے مجھے ایک سند بھی عطا ہوئی جس کا ترجمہ ذیل میں درج کرتا ہوں۔

> میں یہ چند سطریں سید مظفر حسین گوہر کی بابت نہایت مسرت کے ساتھ تحریر کر رہا ہوں۔ مجھے آپ کا کلام دہلی کے آل انڈیا مشاعرے میں سننے کا اتفاق ہوا آپ کا کلام بلحاظ شاعری نہایت بہترین ہے اور آپ کے کلام میں وہ عنصر شاعری

خصوصیت موجود ہیں جو ایک عمدہ کلام میں ہونے چاہئیں آپ کے خیالات دلکش اور بلند پایہ ہیں میں انھیں ان شاعروں میں سمجھتا ہوں جن کا مستقبل نہایت درخشاں ہے۔ لہٰذا میں آپ کو اپنی طرف سے پرخلوص مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

آپ کا

ہز ہائی نس نواب آف دی رامپور

معرفت سکریٹری بزم ادب بارڈنگ

لائبریری دھلی ۸ مارچ ۱۹۴۰ء

تاثرات:- اردو شاعری کے اکثر مشاہیر میرے پسندیدہ شاعروں میں سے ہیں جو اگر اچھا شعر میری نظر سے گذرتا ہے میں اسے پڑھ کر آبدیدہ ہو جاتا ہوں۔ میرے اشعار میرے زخمی دل کی غمازی کرتے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ میرا مسلک ایمان خلوص اور محبت پر مبنی ہے۔ میں کسی چیز کو سطحی اور وقتی طور پر دیکھنے کا عادی نہیں۔ موسیقی، سیر و سیاحت اور مطالعہ کا بیحد شائق ہوں۔ موسیقی میرے جذبات میں تلاطم پیدا کر دیتی ہے میں نے اپنی اکثر غزلیں اسی جذبہ کے ماتحت کہی ہیں۔ طبیعتاً بے حد شوخ ہوں مزاح و ظرافت میری طبیعت میں رچی ہوئی ہے۔ میری شاعری زیادہ تر حسن و عشق سے متاثر ہے۔ میرا سب سے پسندیدہ شعر وہی ہے جو سوز و ساز اور جذبات کا حامل ہو۔ اور سنتے ہی نشتر کی طرح دل میں اتر جائے نظمیں بہت کم کہتا ہوں۔ البتہ غزل میری جزو روح ہے۔ اکثر اپنا کلام تحت اللفظ پڑھتا ہوں اگرچہ نثر مجھے زیادہ پسند نہیں۔ لیکن ایسے افسانوں کو شوق سے پڑھتا ہوں جو مزاحیہ ہوں یا پھر غم و الم کی چاشنی لئے ہوئے ہوں۔ ہند و پاک کے اکثر رسائل میں میرا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ میرا مجموعہ کلام "سوز دروں" کے نام سے بہت جلد منظر عام پر آنے والا ہے شاعری اور دوستی میری زندگی کا جز ہیں خصوصاً دوستوں سے والہانہ محبت تو مجھے ورثہ میں ملی ہے جو مجھ سے ملا میں اس کے لئے عمر بھر کا روگ بن گیا۔ ہر وقت مسکراتے رہنا میری زندگی کا اصول ہے۔ خدا کا شکر ہے میں نے آج تک بڑی سے بڑی مصیبت کا مستقل مزاجی سے مقابلہ کیا۔ مجھے اپنی کم علمی اور کم مائگی کا اعتراف ضرور ہے لیکن اپنے دل کی آواز کو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہوں۔

خاندانی حالات ۔ میرے دادا سید فیض الحسن گنگوہ شریف ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے مرحوم اپنے خاندان میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور اپنے خاندان اور عوام میں بڑی عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ دادا مرحوم نواب ابراہیم علی خاں ریاست کنج پورہ ضلع کرنال کے والد بزرگوار کے یہاں معتمد خاص تھے اور بہ سلسلہ ملازمت دادا مرحوم کا انتقال بھی وہیں ہوا ۔ دادا مرحوم کا سایۂ عاطفت اٹھ جانے کے بعد قبلہ والد صاحب نے سہارنپور میں کچھ عرصہ تک پولیس کی ملازمت کی لیکن یہ ملازمت جلد ہی چھوڑ دی اور لاہور جا پہنچے وہاں اپنے ایک دوست کی وساطت سے پنجاب کے ایک متمول گھرانے میں جائداد کی دیکھ بھال پر ملازم ہو گئے۔ جاگیر وان رادھا رام (جو لاہور سے ساٹھ میل دور ہے) میں تھی اس لئے والد صاحب کو وہیں پہنچا دیا گیا۔ اور یہ سلسلہ ملازمت ابھی تک قائم ہے ۔ دوران ملازمت میں والد صاحب نے نہایت ایمانداری سے کام کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مستقل طور سے جنرل منیجر مقرر کر دیئے گئے۔ دوران ملازمت میں والد صاحب قبلہ نے اپنے ذاتی کاروبار کو بھی فروغ دیا۔ عوام میں ہر دل عزیز ہونے کے علاوہ والد صاحب قبلہ افسران علاقہ اور رؤسا میں بھی بے حد احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ۸ / نومبر ۱۹۴۴ء میں حکومت پنجاب کی طرف سے سرکاری طور پر ڈسٹرکٹ بورڈ ضلع لاہور کے ممبر نامزد ہوئے اور تین سال تک برابر اسی عہدے پر فائز رہے ۔ والد صاحب نے پیسہ کو کبھی جمع کرنے کی کوشش نہیں کی ان کی فیاضی اور سیر چشمی نے روپیہ کو مفید کاموں پر خرچ کرایا ۔ اس وقت والد صاحب ۷۴ برس کے ہیں۔ اگرچہ چھ سات سال کے عرصہ سے ان کی صحت کا توازن ٹھیک نہیں رہا ۔ اس کے باوجود ان کی ہمت کا وہی عالم ہے ۔ اور وہ شب و روز اپنی سرکاری و غیر سرکاری مصروفیتوں میں محو ہیں ۔

میرے خالہ زاد بھائی عبدالعزیز مرزا ایم ۔ اے ۔ ایل۔ ایل ۔ بی رجسٹرار فیڈرل کورٹ آف پاکستان لاہور میں ہیں ان سے چھوٹے بھائی مرزا عبداللطیف ملیر کینٹ کراچی میں کیپٹن ہیں ۔ میرے دوسرے خالو محمد نعیم بٹ سینٹرل گورنمنٹ کراچی میں آل پاکستان روڈز یعنی سڑکوں کی اسکیموں کی انجینیر ہیں ۔ میرے تایا سید لیاقت حسین صاحب (مرحوم) نواب حمید اللہ خاں فرمان روا ئے بھوپال کی والدہ ماجدہ بیگم شاہجہاں صاحبہ کے پرسنل اسسٹنٹ اور پولیٹیکل سکریٹری کے عہدے پر ریاست بھوپال میں عرصہ دراز

تک فائز رہے۔ ہز ہائی نس بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد خالو صاحب اپنے عہدے سے سبکدوش ہو کر دہلی آ گئے۔ بعد میں ان کا انتقال بھی دہلی میں ہوا بیگم صاحبہ بھوپال نے تایا صاحب مرحوم کا تین پشت تک وظیفہ مقرر فرما دیا تھا۔ تایا صاحب مرحوم کے صاحبزادے سید توکل حسین (پی۔ ایس۔ سی) اس وقت مردان شوگر ملز میں شوگر ٹیکنولجسٹ اینڈ کیمیکل انجینیر کے عہدے پر فائز ہیں۔

انتخاب کلام

وحشت ہے یا تصرفِ جوشِ بہار ہے — کچھ تو ہے وجہ خاص جو دل بیقرار ہے
دنیا کہیں ہر گز یار کے ہرگز رہیں نہ آپ — کل عالم چمن میں خزاں در بہار ہے
پیدا افضائے زیست میں ہو کیف اک نیا — جو غم مجھے ملا ہے غم خوشگوار ہے
اتنی کہاں بہار میں حسن شگفتگی — جلوہ تمہارا کوئی لیں رنگ بہار ہے
مجھ کو فریب دے نہ زمانے میں آگہی — وحشی ہوں میں تو کون یہاں ہوشیار ہے
یہ زندگی ہے یا کہ فریب حیات ہے — ہر سانس وقف گردش لیل ونہار ہے
مانا کہ ہیں درست تمہاری تسلیاں — دو دن کی زندگی کا کسے اعتبار ہے
سنتے تھے اشتیاق سے تم داستان دل — اب کیا ہوا کہ عرض تمنا بھی بار ہے
چھائی ہوئی ہے تیرگی شام غم ہنوز — وقت سحر ہے پھر بھی وہی انتظار ہے

کس سے پڑا ہے گوہر مضطر کا سابقہ
جو دیکھنے میں پھول حقیقت میں خار ہے

آئے تو عقل و ہوش سے بیگانہ کر گئے — جب وہ گئے تو لے گئے صبر و قرار بھی

کیا جانے کس نگاہ سے دیکھا ہے آپ نے
جاتا رہا ہے ساتھ ہی دل کے قرار بھی

مرغوب میرے دل کو ہو کیا گلستاں کی سیر — کچھ گل خوں سے اب مجھے دلبستگی نہیں

ہر چند ان کی مجھ پہ ہیں گو تر نوازشیں
پہلی سی ان میں بات مگر اب رہی نہیں

اس درجہ تیری یاد میں دیوانگی رہی — وارفتگیٔ شوق تماشا بنی رہی!
میں جلوہ گاہ حسن کے حالات کیا کہوں — جب تک رہے وہ سامنے اک بیخودی رہی

سیراب ہو سکے نہ کبھی تشنگانِ دید   بعدِ فنا بھی ان کو وہی تشنگی رہی
کیا کیا دکھائے رنگ ترے سوزِ عشق نے   سو بار اک چراغ جلا یا بجھا دیا
ذرہ جو اڑ کے آیا کوئی کوئے یار سے   دستِ طلب اسی کی طلب میں بڑھا دیا

قیدِ قفس میں فکر مجھے آشیاں کی ہے   میں سن رہا ہوں اس پہ نظر باغباں کی ہے
دنیا کی کوئی چیز نہیں ہے ثبات پر   وابستہ بے ثبات ہر ایک شے جہاں کی ہے
گو ہر غم و الم کی شکایت فضول ہے   بدلی ہوئی ہوا ہی جو سارے جہاں کی ہے

مری وحشت کی گو وقعت نہیں دنیا کی نظروں میں
مگر گوشہ یہ کیا کم ہے کہ رونق ہوں بیاباں کی

کس فکر میں نسیمِ گلستاں ہے آجکل   ہر پھول میرا چاک گریباں ہے آجکل
کس درجہ عام جلوۂ جاناں ہے آجکل   ہر ذرہ آفتاب درخشاں ہے آجکل
جسے میں چرخ کے ہے ستاروں کی انجمن   اپنے نصیب میں شبِ ہجراں ہے آجکل

آپ کی بزمِ ناز سے جا کر   دیر و کعبہ میں کیا کریں گے ہم

تیری محفل میں کیا نہیں ہوتا   ذکر بس اک مرا نہیں ہوتا!
جان جاتی ہے دل کے آنے پر   تیری الفت میں کیا نہیں ہوتا
وقتِ آخر ہے وہ چلے آتے   پوچھ لینا برا نہیں ہوتا
میں نے اپنا سمجھ لیا اس کو!   جو مرا آشنا نہیں ہوتا

جینا فضول جی سے گزرنا بھی ہے فضول   ہم مقصدِ حیات سے گر آشنا نہ ہوں
اے دل بیانِ شوق سے پہلے یہ سوچ لے   اظہارِ آرزو پہ کہیں وہ خفا نہ ہوں
آتے لگا ہے لطف مجھے انتظار میں   اللہ حشر تک بھی وعدے وفا نہ ہوں

ہاں یاد ہے مجھے بھی الفت کا وہ زمانہ   مرنے کی آرزو تھی جینے کا تھا بہانہ
جب سے الجھ گئی ہے اس زلفِ منتشر سے   گردش میں آ گئی ہے خود گردشِ زمانہ
ڈوبا ہوا مسلسل ایک کیفِ سرمدی میں   وہ حسن کا تبسم وہ عشق کا ترانہ
تاروں کی روشنی میں وہ داستانِ پُرغم   پلکوں کے سلسلے میں وہ دل کا مرے فسانہ
وہ چاندنی میں ان کے چہرے کا عکسِ تاباں   ہے دل کی دھڑکنوں کا اک آخری فسانہ
پھر ایک بار ہمسر کر سب ظلمتیں مٹا دو   اپنی جبیں سے روشن کر دو چراغِ خانہ

مجموعۂ صفات کہوں گا اسے ضرور
یہ اور بات ہے کہ مروّت سے دور ہے
میں اور شکوۂ غمِ فرقت زبان پر
یہ مشربِ وفا کی عقیدت سے دور ہے

دل کی حسرت کا مدعا تم ہو!
اپنی حسرت کسی سے کیا کہیے
کوئی ہمدم نہ کوئی مونس ہے
ایسی غربت کسی سے کیا کہیے
دل پہ گوہر کے جو گذرتی ہے
یہ حکایت کسی سے کیا کہیے

دنیا سے تیرے درد کے مارے چلے گئے
تھی جن پہ زندگی وہ سہارے چلے گئے
وہ تھے کہ ان کو ظلم و ستم ہی سے کام تھا
ہم تھے کہ اپنی جان کو وارے چلے گئے
اے نا خدا سفینۂ دل آگیا کہاں!
حدِ نظر سے دور کنارے چلے گئے
کیسی ہوا چلی یہ کہ دل بجھ کے رہ گیا
وہ ولولے وہ شوق ہمارے چلے گئے
سونی ہے بزم چاند ستارے بھی ہیں اداس
وہ کیا گئے کہ شب کے نظارے چلے گئے
گوہر سنا کسی کو نہ دردِ دلِ حزیں
دردآشنا تو کب کے ہمارے چلے گئے

یہ کس کے جلوے جہاں میں ہر سو بہار اپنی دکھا رہے ہیں!
وہ لاکھ پردوں میں چھپ گئے ہیں مگر نگاہوں پہ چھا رہے ہیں
وہ دردِ دل سے ہیں میرے واقف وہ دل کو دل سے لا رہے ہیں
میں ان کو اپنا بنا رہا ہوں وہ مجھکو اپنا بنا رہے ہیں
میں ان پہ دل سے مٹا ہوا ہوں یہ جانتا ہوں مرے نہ ہونگے
وہ آشنا ہوں گے مجھ سے کیونکر جو مجھ سے نا آشنا رہے ہیں
چمن چمن ان کی نکہتیں ہیں روش روش ان کی تازگی ہے
وہ خود سراپا بہار بن کر بہار اپنی دکھا رہے ہیں
بنے ہوئے ہیں وہ صبح جنت جتا رہے ہیں جو اپنی الفت
نظر سے بھر بھر کے جامِ الفت وہ پی رہے ہیں پلا رہے ہیں
جہاں میں ہر سو ظہور تیرا ہے ذرے ذرے میں نور تیرا
دلوں میں روشن ہے طور تیرا یہ تیرے جلوے بتا رہے ہیں
فغاں بہ لب بلبلیں ہیں سن کر ہیں مضطرب پھول اور کلیاں
دکھا ہوا تیرا دل ہے گوہر غزل کے تیور بتا رہے ہیں

لاؔل
محمد لال خاں کاشمیری

میں ریاست جموں وکشمیر ضلع میرپور کے ایک نامی گاؤں سیپٹہ میں بتاریخ ۱۷ جون ۱۹۲۲ء میں ظہور پذیر ہوا پرائمری تعلیم گاؤں ہی کے اسکول میں پوری کی اور پھر مڈل اسکول سری پرتاپ سنگھ پورہ میں داخل ہوگیا۔ تعلیم کا شوق تھا روزانہ چار میل مارچ کرتے ہوئے اسکول جاتا۔ مگر ..... یکایک تعلیم سے دل اچاٹ ہوگیا۔ بٹیر، تیتر اور مرغ بازی کا شوق ہوا جو بڑھتے بڑھتے تعلیم پر غالب آگیا۔ قبلہ وکعبہ بمبئی میں تجارت کرتے تھے میری گمراہی کی خبر پاکر گھر آئے اور آتے ہی اپنے لخت جگر پر ہاتھ صاف کیا ہم اس ہاتھ کی صفائی کی تاب نہ لا سکے اور اپنے لنگوٹیا کو ساتھ لے کر کلکتہ جا پہونچے (میرا دوست خیراتی جو آجکل یورپ میں چودھری خیرات علی کہلاتا ہے) کلکتہ پہونچ کر فلمی دنیا میں داخل ہونے کا شوق چرایا۔ نیو تھیٹرز اور رادھا فلم کمپنی میں کام کرنے لگے۔ ایک قریبی رشتہ دار کو خبر ہوئی اور مجھے پھر بمبئی بھیج دیا گیا۔ والد صاحب وہاں موجود تھے ہی لہٰذا اس پرندہ آزاد کو پھر شعبہ درسگاہ میں مقید کر دیا گیا۔ مگر ہم بھی ایک کائیاں تھے کتابیں مغل ہوٹل میں اور ہم محبوب پروڈکشنز میں ۱۹۳۹ء میں لڑائی کے نعرے بلند ہوئے اور ہم بھی نعروں سے لطف اندوز ہونے کے لئے رائل انڈین نیوی میں بھرتی ہوگئے۔ شعر گوئی کا شوق قلم دیا ہی میں پیدا ہوگیا تھا۔ نیوی میں پہونچے تو حضرت نیر سیمابی کی معیت نے اس شوق کو ہوا دی اور محمد لال خاں میں لاؔل کاشمیری کا اضافہ ہوگیا۔ آج کل رائل پاکستان ایمونیشن ڈپو میں ہوں قبلہ استاد کا ساتھ ہے اور سرکاری اوقات کے بعد فکر سخن کر لیتے ہیں۔ نمونہ کلام حاضر خدمت ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم اور شاعر تاج حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم کے کلام سے بہت استفادہ حاصل کیا ہے اور انہی دو بزرگوں سے زیادہ متاثر ہوا ہوں

انتخاب کلام

لا سکوں میں تاب ان نظروں کی یہ ممکن نہیں
دیکھتا ہوں ان کی نظروں سے چھپا کر ان کو میں

صبح دم ہوتے ہی سارے یک بیک رخصت ہوئے
چاند تاروں کو بھی اپنا ہم سفر سمجھا تھا میں
وسعتِ ارض و سما کے پار بھی تھا ضو فشاں
حسن کے جلووں کو تا حد نظر سمجھا تھا میں

کڑکتی بجلیوں سے ہی منور آشیاں کر لے
جو ممکن ہو تو فطرت کو بھی اپنا ہمزباں کر لے
جہاں بیں تنگ دل رہ کر بھی جینا کوئی جینا ہے
حریمِ دل کو پھیلا کر حریفِ دو جہاں کر لے
اگر یہ چاہتا ہے بے نقاب آئیں وہ محشر میں
تو پہلے طور پر جا کر نظر کا امتحاں کر لے

پھر معرضِ وجود میں ہے ایک سومنات
پھر احتیاجِ غزنوی بت شکن ہے آج
قسمت کو بدل دے جو بیک جنبشِ نظر
اس مردِ قلندر کی نظر ڈھونڈ رہا ہوں

لطیف آذر

مجھے لطیف آذر کہتے ہیں۔ تاریخ پیدائش کا علم نہیں۔ میری زندگی میں کوئی خاص بات نہیں — لیجیے چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

انتخابِ کلام

جھک ہی جائے گی ترے قدموں پہ ساری کائنات
پہلے تو اپنی نگاہوں میں وقارِ دل بڑھا
جوشِ طوفاں سے ملی ہر اک حیاتِ نو مجھے
ڈوب کر بحرِ وفا میں جانبِ ساحل بڑھا
ڈوبنے والے تری خوش قسمتی کو کیا کہوں
تیرے استقبال کو موجیں اٹھیں ساحل بڑھا
دیکھیے جذبِ محبت اس کو کہتے ہیں لطیف
انتہائے شوق میں خود دل کی جانب دل بڑھا

ماہر
منظور حسین قادری

ماہنامہ پرچم کے شاعر نمبر کی تیاریاں بڑی دھوم دھام سے ہو رہی ہیں۔ اس کے لئے مجھ سے بھی فرمائش نہیں بلکہ اصرار کیا گیا ہے کہ میں اپنے حالات خود اپنے قلم سے لکھوں یہ بڑا دشوار کام ہے حیران ہوں کہ کیا ظاہر کروں کیا چھپاؤں ؟ پھر یہ بھی خوف لگا ہوا ہے کہ کسی واقعہ کے اظہار میں کہیں "خودستائی" کا رنگ پیدا نہ ہو جائے۔ عزیزی مظہر صدیقی صاحب نے ایک عجب کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایک شاعر اور انشا پرداز کے قلم پر سب سے زیادہ سخت وقت شاید یہی ہوتا ہے ـــــ بہرحال جو کچھ لکھ سکا ہوں وہ حاضر ہے۔

میرا نام ہے منظور حسین جس کے تاریخی ۱۹۰۶ / ۱۳۲۴ھ ہوتے ہیں۔ اور یہی میرا سنہ پیدائش ہے۔ والد کا نام محمد معشوق علی جو ظریف تخلص کرتے تھے۔ مگر انھوں نے ایک شعر بھی ظریفانہ انداز میں نہیں کہا۔ شروع میں عاشقانہ غزلیں کہیں اور آخری عمر میں صرف حمد و نعت کہتے تھے۔

میرا وطن کسیر کلاں ضلع بلند شہر ہے۔ یہ میرا آبائی وطن ہی نہیں مولد و منشا بھی ہے اس زمانہ میں جب پی۔ ایچ۔ ڈی (P. H. D) ہونا بھی کوئی خاص فخر و امتیاز کی بات نہیں ہے۔ کسی کا یہ کہنا کہ میں نے میٹرک میں کامیابی حاصل کی ہے ـــــ ایک مضحکہ خیز سی بات ہے۔ میری فکر و نظر کی تربیت نشو و نما بلکہ یوں سمجھئے کہ اس کی تشکیل کا دار و مدار مطالعہ پر ہے۔ ساری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گذری ہے۔ ہر فن کی کتابیں پڑھی ہیں۔ اور ہزاروں راتیں چراغ کے سہارے گذاری ہیں۔ "مولانا" میں کسی صورت سے بھی نہیں ہوں۔ لیکن یار لوگوں نے مجھے مولانا بنا دیا ہے۔ یا تو لوگوں نے یہ میرے ساتھ مذاق کیا ہے۔ یا وہ بیچارے میری شخصیت اور ذات کے بارے میں شدید غلط فہمی کا شکار رہیں۔

حیدرآباد دکن میں میرا تقریباً پندرہ سولہ سال قیام رہا ہے۔ میری زندگی کا

بہترین زمانہ دکن میں گذرا ہے۔ مہاراجہ سرکشن بہادر یمین السلطنت صدراعظم دولت آصفیہ کی ذات وہاں میرے لیے قیام کا سبب تھی مہاراجہ سرکشن پرشاد بڑے علم دوست اور شاعر نواز تھے۔ چھوٹے پیمانے پر وہ برمکی وزرا کی یادگار تھے۔ دکن میں سرکاری ملازمت سے بھی میرا تعلق رہا ہے۔

میں نے ۱۹۳۳ء میں عراق کا سفر کیا اور وہاں کے عمائد علما اور مشاہیر کے علاوہ ہز مجسٹی غازی الاول شاہ سے بھی ملاقات کی ــــ حیدرآباد دکن تقریباً ۱۹۴۳ء میں چھوڑ دیا۔ اور دہلی کو اقامت گاہ بنایا۔ اسی دوران میں مشاعروں کے سلسلے میں بمبئی آنا جانا رہا اور وہاں چند دن فلمی دنیا سے بھی تعلق پیدا ہوگیا۔ فلمی دنیا میں میرے لئے شہرت اور جلب منفعت کے بہت زریں مواقع حاصل تھے۔ مگر اللہ کا بڑا فضل ہوا کہ میں اس دلدل سے بہت جلد نکل گیا۔ اس چند روزہ فلم تعلق پر آج تک متاسف ہوں۔

تقسیم ہند کے بعد دہلی ہی میں مقیم تھا۔ مگر جب دہلی میں ہنگامہ ہوا تو ان دنوں اپنے وطن کیسر کلاں میں تھا۔ لیکن اس قیامت کا سامنا کرنا مقدر میں لکھا تھا۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۴۷ء کو چالیس ہزار مسلح ہندوؤں نے خود ہمارے گاؤں پر حملہ کر دیا۔ میں عین محاذ پر تھا اللہ کے فضل و کرم سے میں آخر وقت تک مورچے پر جما رہا اور ہر قسم کی گزند سے محفوظ رہا۔ یوں سمجھئے کہ موت کا قافلہ میرے قریب سے بلکہ یوں کہئے کہ مجھے چھوتے ہوئے گذر گیا۔

کراچی یکم نومبر ۱۹۴۷ء کو پہنچا۔ میرٹھ سے اسپیشل ٹرین کے ذریعہ آنا ہوا۔ اور راستہ میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ چند ماہ ملتان میں بھی رہنا ہوگیا۔ مگر مستقر کراچی ہی رہا۔ تین سال سے رسالہ "فاران" نکال رہا ہوں۔ "فاران" کے ذریعہ جو کچھ تھوڑی بہت علم و ادب اور اخلاق و اسلام کی خدمت انجام دے رہا ہوں وہ اہل نظر کے سامنے ہے اپنی زبان سے کیا کہوں۔

میری نظم و نثر کی تقریباً بیس کتابیں اب تک چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں افسانوں کا ایک مجموعہ (میخانے) جو چھپ چکا تھا اور جلد نیدی ہو رہی تھی دہلی کے آشوب کی نظر ہوگیا۔ اس کا مسودہ بھی میرے پاس نہیں ہے۔

مشاعرے اتنے پڑھے ہیں کہ کم شاعروں نے پڑھے ہوں گے۔ بعض اوقات ایک ایک ماہ کا سلسلۂ سفر رہا ہے۔ تمام مدراس میں ہوئی تو چوتھی صبح سوادِ نبگاں میں طلوع ہوئی تمام مشاہیرِ شعرا کے ساتھ ملاقاتیں اور صحبتیں رہی ہیں۔

تجربہ نے بتایا ہے کہ شاعری کی جو اسلام نے حوصلہ افزائی نہیں کی اس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہے کہ شاعر کی جوانی رنگینیوں سے بچ نہیں سکتی۔ اس سمندر میں کوئی ڈوبے گا نہیں تو تردامن ضرور ہو جائے گا۔ شعر و ادب کی شہرت اپنی جگہ خود ایک فتنۂ عظیم ہے۔

نغمۂ شعر و جوانی کا وہ عالم تو یہ۔!!
میری آنکھوں میں قصیدہ ترے ہونٹوں پہ غزل

اس انداز کے شعر اس دور کی یادگار ہیں۔

شاعری میں کسی سے مجھے تلمذ نہیں ہے مجھ سے بیسیوں نے مشورہ شعر و سخن کیا ہے مگر میں اپنا کسی کو شاگرد نہیں سمجھتا اور شعر و سخن میں شاگردی اور استادی کا بھی زیادہ قائل نہیں ہوں۔ شاعر کی طبیعت اور فطرت خود اس کی راہنمائی کرتی ہے۔

شاعروں کی کثرت کو میں قوم ملک بلکہ معاشرہ کے لئے زوال و نقصان کا سبب سمجھتا ہوں۔ ہر کنکر ہیرا بن جائے تو ہیروں کو کون پوچھے۔

نام نہاد "ترقی پسندی" کا میں شروع سے ہی مخالف رہا ہوں۔ برسوں سے اس کے خلاف زبان و قلم سے پیچ رہے جہاد کر رہا ہوں۔ میں "ترقی پسندی" کی طرف ذرا بھی مائل ہو جاتا تو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ مگر میں نے حق کی خاطر اپنی شہرت کا نقصان گوارا کر لیا۔ "ترقی پسند" تنقید نگار مجھ سے بہت ناخوش ہیں اور ان کو میرا ذکر کرنا کسی صورت سے بھی گوارا نہیں۔

اسلام کے سوا میں کسی اور "ازم" ISM پر عقیدہ نہیں رکھتا۔ میرے نزدیک اسلام اور صرف اسلام ہی مکمل ترین دستورِ حیات ہے اور جہاں جہاں اسلام سے دوری اور بیگانگی پائی جاتی ہے۔ وہاں بگاڑ پایا جاتا ہے۔ تمنا یہ ہے کہ ایک بار ان آنکھوں سے اللہ کے دین کو پورے کا پورا برپا اور قائم دیکھ لوں اسی جد و جہد کو عملی طور پر مقصدِ حیات بنا رہا ہوں۔

یہ ہے میری سرگذشت اور داستان حیات یہ کچھ بے ترتیب لکیریں ہیں۔ مگر ان سے خاکہ بہرحال بن سکتا ہے۔

رُباعی

سینہ مہ و کہکشاں کا شق ہو جائے
سورج کی جبیں عرق عرق ہو جائے
انسان کا علم اگر کہیں ظاہر ہو
تنظیم جہاں ورق ورق ہو جائے

قطعہ

خانقاہوں میں جو قالین سجا رکھے ہیں !!!
دام ہم رنگ زمیں ہیں کہ بچھا رکھے ہیں
شیخ خود بھی ہیں بہت وضع کے پابند مگر
کچھ مریدوں کو بھی آداب بتا رکھے ہیں

مدرسوں میں ہے وہی بحثِ کلام و منطق
اور قرآن کے اسرار چھپا رکھے ہیں
زہدِ خاموش سے ہنگامہ رندی اچھا
میکدے والوں نے فتنے تو اٹھا رکھے ہیں

دوشیزہ

یہ کمسنی کا زمانہ یہ ابتدائے شباب
یہ شوخیوں کے افق سے طلوعِ مہرِ حجاب
جھکی جھکی سی نگاہیں کہ نیم وا غنچے
رکا رکا سا تبسم کہ نا شگفتہ گلاب
ز فرق تا بقدم سحر و نغمہ و مستی
نظر نظر میں فسانہ نفس نفس میں رباب
جو دیکھئے تو ہر اک پر نظر توجہ کی
جو سوچیئے تو کسی سے نہیں ہے کوئی خطاب

خدا کرے یہ نگاہ جہاں سے دور رہے!
کہ اس زمانے میں ہے عصمتِ نظر نایاب

نہیں رہے

اب جوشِ اضطراب کے ساماں نہیں رہے ساحل کو ہے گلہ کہ وہ طوفاں نہیں رہے
خونِ جگر سے کھیلنے والے کہاں گئے قطرے لہو کے زینتِ داماں نہیں رہے
جن کے جنوں پہ ناز تھا فصلِ بہار کو وہ عاشقانِ چاکِ گریباں نہیں رہے
تیغوں کے زخم دب گئے اچھائیوں ہی سے سجدوں کے داغ بھی تو نمایاں نہیں رہے
جن کے حضور سطوتِ کسریٰ تھی سجدہ ریز وہ بوریا نشین سلیماں نہیں رہے
جن کی "نشید" نغمۂ بیدار بن گئی وہ کاروانِ دل کے حُدی خواں نہیں رہے
تھی جن کی فکر حاصلِ پروازِ جبرئیل وہ حاملانِ معنئ قرآں نہیں رہے

جن کے لیے تھی انتم الاعلون کی نوید
اللہ کیا ہوا وہ مسلماں نہیں رہے

محبت عرش و گردوں ساز بھی ہے محبت فرش پا انداز بھی ہے !!
خموشی پردہ دارِ راز بھی ہے یہی ظالم مگر غماز بھی ہے !
ادب اے جوششِ غم جوششِ تمنّا حریمِ دل حریمِ ناز بھی ہے
قفس کیا اور قفس کی تیلیاں کیا کسی میں جرأتِ پرواز بھی ہے
یہی انجام کا مارا ہوا دل ہلاکِ عشرتِ آغاز بھی ہے

سکوتِ لالہ و گل پہ نہ جانا
اسی میں شعلۂ آواز بھی ہے

کیسی موجیں کیا منجدھار اب کے کشتی آر کہ پار !
جتنے دیکھے دنیا دار تن چنگا اور من بیمار
عشق کہاں تک رد کرے گا حُسن کے اوچھے اوچھے وار
امیدوں کے تاج محل ارمانوں کے شالا مار
ایک نہیں دو چار نہیں لاکھوں نظریں ان پہ ادھار

یہ بھی زمانہ دیکھ لیا
چور بنے ہیں چوکیدار

ماہر

ماہر افغانی

نہیں شعور جب انساں کو ذات کا اپنی
تو پھر خدا تو خدا ہے خدا کی بات نہ کر

مبارک

مشتاق حسین

نام مشتاق حسین تخلص مبارک تاریخ پیدائش ۱۰ جون ۱۹۲۰ء ضلع ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) کے قصبہ میانی افغانان کا رہنے والا ہوں ۱۹۳۹ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول ٹانڈہ اڑمڑ سے میٹرک کیا۔ دوران تعلیم میں شعر و شاعری سے کافی شغف رہا۔ اردو و فارسی کی تعلیم جناب محمد حسین کفیل اور جناب عزیز الدین رعنائی سے حاصل کی ۱۹۴۰ء میں تلاش معاش کے لیے دہلی کا رخ کیا دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا قسمت نے یاوری کی ۲ ردسمبر ۱۹۴۰ء میں محکمہ امور خارجہ نیو دہلی میں ایک کلرک کی حیثیت سے ملازم ہو گیا مئی ۱۹۴۲ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک حکومت ہند کے شعبہ مطبوعات متحدہ میں ملازم رہا اور اس عرصہ میں آغا محمد یعقوب دواسی سابق مدیر "آجکل" دہلی سید وقار عظیم ایم اے سابق مدیر ماہ نو کراچی و ماہنامہ آجکل دہلی مدیر "نقوش" لاہور، معین احسن جذبی فضل حق قریشی دہلوی جیسے حضرات کی رفاقت نصیب

ہوئی اپنے ذوق کی تسکین کے لئے دورِ حاضرہ کے اساتذہ کے کلام اور موجودہ ادبی رجحانات کے متعلق تنقیدی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس دور میں صرف ایک غزل کہی اور ایک مقالہ بعنوان "ایرانی صحافت" لکھا جو آجکل دہلی کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ یہی میری ادبی زندگی کی ابتدا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی کی ادبی سرگرمیوں اور پے در پے ہنگامی مشاعروں نے "قسمت آزمائی" پر مجبور کر دیا۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں اپنے بعض دوستوں کے اصرار پر شعر کہنے شروع کئے۔ اور مشاعروں میں شرکت کی۔ سب سے پہلی غزل جناب سید ذوالفقار علی بخاری کے دولت کدہ پر سنائی جسے سب حضرات نے پسند کیا۔ اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ کچھ دنوں یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا۔ اور بالآخر نہال سیوہاروی مرحوم کی خدمت میں بغرضِ تلمذ حاضر ہوا۔ اور موصوف نے اسے قبول فرمایا۔ آج بھی مرحوم کے روحانی فیض سے فیضیاب ہو رہا ہوں۔"

متفرق اشعار

وہ تیرے آتشیں عارض پہ سرمگیں آنچل　　رخِ شفق پہ ہو جیسے خفیف سا بادل
چمن میں کس گلِ رعنا کی آمد آمد ہے　　کہ رعبِ حسن سے تھرا رہی ہے ہر کونپل
ہزار سعیِ مسلسل کے باوجود اے دوست　　نہ محو دل سے ہوئے تم نہ آنکھ سے اوجھل

نگاہِ ناز کی شوخی حجاب کا عالم
جھکی جھکی سی نظر دل کے پار ہو کے رہی

کلی کلی سے عیاں ہے بہارِ حسنِ چمن　　مچل رہا ہے گلوں پر بہار کا دامن
خود ملتفت نگاہ سے دیکھا کئے مجھے　　میری نظر ملی تو انھیں آگیا حجاب

نہ جانے کونسی منزل تھی کیا تھا اور کہاں ہم تھے
فقط جلوے ہی جلوے تھے نگاہوں میں جہاں ہم تھے

اس عالمِ کیف و مستی میں یہ پند و نصیحت کیا معنی
بیکار ہے اب پرہیز کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

میری محبت بھی حادثہ ہے تری جوانی بھی حادثہ ہے
انھیں حوادث میں زندگی کے حسین لمحات بہ رہے ہیں

اب محفلِ نشاط ہے بیگانۂ سرور　　وہ اہتمامِ فصلِ بہاراں نہیں رہا

لذتِ غم کی قدر کیا جانیں   جو نہیں ہیں امینِ سوز و گداز

یہ جنوں کا ہے تقاضہ کوئی وضع تو تراشو!
کہ ہے رسمِ چاکِ داماں وہی بات اک پرانی

خرد تراش رہی ہے نئے نئے اصنام   مگر جنوں کی نظر میں یہ آذری کیا ہے

انسان ہے کہ پھر بھی تغیر پسند ہے   گو لاکھ انقلاب کے طوفاں گزر گئے

یاد ہیں وہ چاندنی راتیں کہ میرے دوش پر!
عنبریں زلفوں کے سائے منتشر ہوتے رہے

ابھی کمی ہے کوئی اور کیا جفاؤں میں   یہ کیوں نگاہِ کرم بار بار ہوتی ہے

حقیقتِ خلشِ غم کسی کو کیا معلوم   عجیب نعمتِ پروردگار ہوتی ہے

فضائے رنگِ عالم دیکھ کر محسوس ہوتا ہے
کوئی پھر انقلاب آنے کو ہے شاید زمانے میں

رہتا نہیں جنون و خرد میں کچھ امتیاز   آتا ہے راہِ عشق میں ایسا مقام بھی

الجھو نہ شرحِ گردشِ لیل و نہار میں   یہ سلسلہ تمام بھی ہے ناتمام بھی

آدابِ بزمِ ناز کا احساس ہے مگر
ایسا بھی کیا کہ لے نہ سکوں تیرا نام بھی

اتفاقاً ملتفت ہے وہ نگاہِ فتنہ ساز   احتیاطاً گردشِ ایام کی باتیں کرو

خاطر میں لائے وہ کیا زمانے کے انقلاب
دیکھے ہیں جس نے تیری نظر کے تغیرات

آخر سمٹ کے ایک ہی مرکز پہ آ گئے!
ان کا غرورِ حسن مری عاجزی کی بات

الٰہی کونسی منزل میں ہے احساسِ نظارہ!
نگاہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں کس کو بزمِ امکاں میں

یہی ہیں محرمِ اسرارِ ہستی   نظر جو آ رہے ہیں بے خبر سے
ادائے غمِ دل چاہتا ہوں   یہی دو چار جملے مختصر سے
نگاہِ گرم کیا ہے اس سے پوچھو   نگاہِ لطف کو جو شخص ترسے

مجید لاہوری

مظہر بھائی!۔

"تذکرہ" کے سلسلہ میں گذارش ہے کہ میں پیدا ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ اگر پیدا نہ ہوتا۔ تو موجود نہ ہوتا میری موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ نہ تو میں آسمان سے گرا اور نہ زمین سے اگا اسی طرح پیدا ہوا جیسے حضرت آدم سے لیکر اب تک لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح مر جاؤں گا جیسے لوگ مرتے چلے آئے ہیں۔ اس جینے اور مرنے کے درمیان کیا ہے؟ اس کو میں ابتک خود بھی نہیں سمجھ سکا۔ اور جب سمجھوں گا تو شاید سمجھا نہ سکوں۔ زندگی میں اور کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے سوائے اس کے کہ ایک دور میں آرزو تھی کہ سرکاری ملازمت مل جائے۔ اور اب یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آزادی کی موت دے ضمیر بہت مجروح ہو چکا ہے۔ اور اب تو وہ قابل عزت بھی نہیں رہا شاعری میں نے اخبار کی خالی جگہ کو پر کرنے کے لئے کی تھی۔ خبروں میں جہاں جگہ بچ جاتی تھی۔ وہاں شعر لکھ دیا کرتا تھا۔ اب یہ گلے کا ہار ہو گئی ہے۔ صبح اٹھتا ہوں تو غریب اسکے بچوں کی طرح کالم منہ پھاڑے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کا پیٹ بھرتا ہوں۔ اور اس سے میرا پیٹ بھرتا ہے۔ دفتری نظام یہی ہے کہ تم نسل کا پیٹ بھرو مسل تمہارا پیٹ بھرے گی۔ اوّل اوّل سنجیدہ شعر کہتا تھا۔

"یہ جب کی بات ہے کہ جب آتش جوان تھا"

اس کے بعد "سیفٹی قوانین" کی عنایت سے اظہار خیال کے لئے طنز و مزاح کو اپنایا "سیفٹی آرڈیننس" کی کوئی لاکھ مخالفت کرے۔ لیکن میں تو اسے رحمت خداوندی سمجھتا ہوں "سیفٹی آرڈیننس" کا یہ احسان کیا کم ہے کہ اس نے مجھے مزاح نگار بنا دیا۔ اکبر کو اپنا پیر و مرشد اور نظیر کو اپنا رہنما مانتا ہوں۔ نظیر اکبر آبادی سب سے بڑا عوامی شاعر تھا صرف یہی ایک مسئلہ ہے جس میں مسلم لیگ اور عوامی لیگ دونوں متفق ہیں اور اکبر اپنے مقام پہ تنہا کھڑا ہے۔ الہ آباد اور اکبر آباد کے دوراہے پر امید ہم لے آئی ہے۔ دعا کیجئے

کر" دسر دھرم نہیں تو گھر کا راستہ مل جائے۔ جب سنجیدہ شعر کہتا تھا تو مولانا عبدالمجید سالک سے اصلاح لیتا تھا مزاح میں میرے استاد مولانا انعام الحق قدوسی گنگوہی ہیں جنہیں لسان العصر اکبر الہ آبادی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ مولانا عبدالباری آسی لکھنوی مرحوم نے مولانا انعام الحق کا ذکر تذکرہ خندۂ گل میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

پہلا دور۔

غزل

آغاز کی جو بات تھی انجام ہو گئی
آئی ادھر سحر تو ادھر شام ہو گئی

کیا پوچھتے ہیں آپ جوانی کا ماجرا
کمبخت چند روز میں بدنام ہو گئی

وہ اک حسین خلش وہ مری جان زندگی
جب مٹ گئی تو موت کا پیغام ہو گئی

تیری بہار زیست ہی جوانی تری نظر
ساغر میں آکے بادۂ گلفام ہو گئی

دل میں سلگ رہی تھی جو اک سرد سر آگ
ہونٹوں پہ آ گئی ہوس خام ہو گئی

تیرے بس اک نگاہ اٹھانے کی دیر تھی
ہر اک کلی کھنکتا ہوا جام ہو گئی!

باہر تھی میکدے سے تو کتنی اداس تھی
اب میکدے میں کتنی حسیں شام ہو گئی

یہ مست مست رت یہ خنک چاندنی مجیدؔ
سکھر کی سرزمیں بھی پہلگام ہو گئی

نظم

کسک

آرزوؤں نے بنائے تھے بہت تاج محل
چاندنی رات کی پھیلی ہوئی تنویروں میں!
آہ بے درد زمانے نے مٹا ڈالے ہیں
رنگ جلنے بھی نظر آتے تھے تصویروں میں!

چاندنی رات ترے غم میں سیہ پوش ہوئی
آرزوؤں کا ہر اک تاج محل خواب ہوا
دور آکاش پہ تاروں نے جلائی قندیل
اور رونے کے لئے دل مرا بے تاب ہوا

اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

(نظیر اکبرآبادی کی ایک نظم بتصرف)

چوروں کا یہ بازار ہے تو جنس یاں کی ساتھ لے ۔ "نمبو" کھلا میوہ ملے "ڈالی" چڑھا پھل پات لے
اک کار کا اپنا رکرا دے کارخانہ جات لے ۔ "پگڑی" جو دے تو اک مکاں کیا بلڈنگیں چھ سات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

جو چاہے پھل اس کھڑی سب جنس یاں تیار ہے ۔ "پرمٹ" پہ بنگلہ ہے زمیں "پگڑی" پہ "بازار" ہے
مانا کہ "رفیوجی" نہیں مانا کہ تو انصار ہے ۔ لیکن جو حق ان کا ادا کر دے وہی حقدار ہے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

جتنی خوشامد کر سکے کر تا کہ تجھ کو "بریانی" ملے ۔ عہدے ملیں منصب ملے اور "قصرِ سلطانی" ملے
"پبلس" میں دے "ٹی پارٹی" "ٹھیکہ" بآسانی ملے ۔ روٹی کھلا روٹی ملے پانی پلا پانی ملے!
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

"فکر الیکشن" میں نہ گھُس پھل دے کر تو پھل پائیگا ۔ ہاں نوٹ دیکر ووٹ لے مشکل نہ ہو کل پائیگا
اس راہ میں جو مشکلیں ہیں سب کا تو حل پائیگا ۔ گیہوں سے گیہوں جو سے جو چانول سے چانول پائیگا
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

اپنی تجوری کے لئے اوروں کا تو نقصان کر ۔ سیدھا ہوا تو کس طرح اس بات پر بس دھیان کر
گر مفت کی تجھ کو ملے پی شیر مادر جان کر ۔ جلسے میں اک تقریر کر چندے کا ساتھ اعلان کر
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

چلتا ہے الٹا کس طرح قسمت کا چکر دیکھ لے ۔ نیکی کو ٹھوکر دیکھ لے موذی کو شکر دیکھ لے
پتھر یہاں ہیرے بنے ہیرے کو پتھر دیکھ لے ۔ گر تجھ کو ہے باور نہیں تو بن کے لیڈر دیکھ لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

میں ایک منسٹر ہوں

ہر عنواں پہ بھی میں کر سکتا ہوں اظہار خیال ۔ اور سائنس پہ بھی ہوں محفل میں سرگرم مقال
ریس کے گھوڑوں پہ بھی تقریر کر سکتا ہوں میں ۔ اکبر و اقبال کی تفسیر کر سکتا ہوں میں!

ہومیوپیتھک ہو یا دندان سازی کا کمال باغبانی ہو کہ ہو روئی درازی کا کمال
بات پھولوں کی ہو یا قومی ترانے کا بیاں چاٹ ہو بارہ مسالے کی کہ ہو اردو زباں
بوعلی سینا کی حکمت بات افلاطون کی اگریکلچر ہو یا شق ہو کوئی قانون کی
داغ کا دیوان ہو یا ہو وہ ایٹم بم کا باز باہی گیری ہو کہ ربط وضبط محمود و ایاز
مسئلہ تاریخ کا ہو یا ہو بحث علم کا فلسفہ گلکنڈ کا ہو یا ہو قصہ فلم کا
گوشتہ فولاد ہو یا شربت دینار ہو!! ہے ضروری سب پہ میری رائے کا اظہار ہو
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا شوق ہے دل میں مگر قرآن کی تفسیر کا

جتنے بھی شعبے ہیں ان سب پر ہوں میں چھایا ہوا
ہوں منسٹر مستند ہے میرا فرمایا ہوا!

(علامہ اقبال کی ایک نظم تصرف)

فرمانِ ابلیس

(اپنی ذریت سے)

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو مٹا دو کاخ امرا کے در و دیوار سجا دو
گرماؤ امیروں کا لہو دولت زر سے کنجشک فرومایہ سے شاہیں کو لڑا دو
سلطانیٔ فغفور کا آتا ہے زمانہ جو نقش نیا تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر ہوئی روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
حائل رہیں پھر خالق و مخلوق میں پردے پیران کلیسا کو کلیسا میں بٹھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مٹی کے حرم سے
میرے لئے مرمر کا محل اور بنا دو

مجازؔ
حافظ محمد عبدالنعیم خاں لودھی اکبرآبادی

اس ذکر کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ میرے بزرگ کون تھے اور کہاں سے آئے؟ ہاں یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ وہ عمائدین اکبرآباد سمجھے جاتے تھے۔ تقریباً میری دادھیال تمام کی تمام زمیندار رہی تھی اور ہے۔

میرے والد مولوی محمد عبدالحکیم خاں صاحب کو بھی ذوقِ سخن گوئی بدرجہ اتم تھا وہ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ میرے تایا مولوی محمد عبدالعزیز خاں صاحب عزیزؔ فتح آبادی حضرت داغؔ دہلوی کے تلامذہ میں سے تھے۔ ان دونوں حضرات کا کلام اشاعت کا مرہونِ منت نہ ہو سکا میرے اصرار کے باوجود والد مرحوم نے اپنے کلام کو محفوظ نہ کیا۔ اور آخر اپنے کلام کا بڑا حصہ اپنے ہی دماغ میں محفوظ لے گئے۔ جو کلام میں اب تک جمع کر سکا ہوں وہ میرے پاس محفوظ ہے انشاء اللہ کسی مناسب موقع پر پیش کروں گا۔

میری عمر تقریباً بتیس سال ہے بحمد اللہ صاحب اولاد ہوں۔ آگرہ اور شکوہ آباد میں میٹرک تک تعلیم پائی اس کے علاوہ اپنے محترم استاد پروفیسر بشارت علی خاں ارمان صاحب آفریدی اکبرآبادی کے اصرار پر منشی کا امتحان بھی پاس کیا میں نے ۱۹۳۳ء میں باقاعدہ شعر کہنا شروع کیا ۱۹۳۴ء میں علامہ سیمابؔ کا شاگرد ہو گیا۔ میرا بیشتر فرصت کا وقت قصرالادب میں گذرتا تھا۔ اور استاد مرحوم کی صحبت میں جہاں ہر وقت شعراء اور ادباء کا جمگھٹا رہتا تھا استفادہ حاصل کرتا رہا۔ میں پہلے حافظ تخلص کرتا تھا۔ مگر بعد میں استاد مرحوم نے تخلص بدل دیا اور مجاز تجویز فرمایا۔

علامہ مرحوم کے قیام کراچی میں بھی میں استفادہ حاصل کرتا رہا حتیٰ کہ وفات سے کچھ یوم قبل جب مولانا کو کچھ افاقہ ہوا اور زبان سے بھی کچھ الفاظ صاف ادا ہونے لگے۔ تو ایک روز مجھ سے فرمایا کہ کوئی نئی غزل کہی ہو تو سناؤ میں نے کہے بعد دیگرے تازہ دو غزلیں سنائیں اس وقت محترمی حسن امام صاحب امام وارثی تیا دی مزاج پرسی کے لئے تشریف لائے ہوئے

تھے۔ غرض میں غزل سناتا رہا اور حضرت مولانا نے جہاں ضرورت سمجھی بلا تکلف اور بلا تاخیر اصلاح فرماتے گئے۔ میں ہی نہیں وہ تمام حضرات جو اس وقت مولانا کی مزاج پرسی کے لئے آئے ہوئے تھے تلامذہ کی اسقدر باخبری دیکھکر حیران رہ گئے۔

یہ میرے استاد ہی کا تصرف تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں جتنے فی البدیہہ مشاعرے پڑھے کم ازکم وقت کے باوجود کبھی سات شعروں سے کم کی غزل نہیں پڑھی۔

شعر کہنا کبھی وجہِ دلچسپی تھا۔ اور اب ضرورت کے وقت ہی شعر کہتا ہوں پہلے ایک نشست میں بغیر کسی اہتمام کے دو دو غزلیں مکمل کرلینا آسان تھا۔ اور اب ایک غزل کی تکمیل ایک ایک اور دو دو شعروں کی صورت میں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ میرے متعلقین اور احباب جانتے ہیں۔ پہلے میں آزاد تھا۔ اور میرا مقصد حیات ہی آزادی تھا لیکن جب صحیح معنوں میں آزادی ملی تو پاکستان آکر میرے والد محترم اللہ کے پیارے ہوگئے۔ اور میں پھر گھڑا کر رہ گیا۔ پہلے میں ملازمت کے باوجود ذمہ داریوں سے بے نیاز تھا۔ لیکن والد صاحب کی وفات کے بعد یہ آزادی ختم ہوگئی۔ آجکل وزارت دفاع حکومت پاکستان کے شعبہ آرڈیننس سے وابستہ ہوں۔

آجکل میرا رنگ تغزل بدل چکا ہے۔ وقت کی ضرورت اور ماحول کے تقاضے ہی نظم کرنا اب اچھا معلوم ہوتا ہے۔ تقریباً چار سو غزلیں اور نظموں کا ذخیرہ سرمایہ حیات ہے طرحی مشاعروں میں اگر یاد کیا جاؤں تو شرکت ضرور کرتا ہوں اور خدا کے فضل سے اتنے ہی منٹ میں غزل ہو جاتی ہے جتنے شعر کہنے ہوں۔ طرحی مشاعروں میں طرحی غزل کے بغیر شرکت کرنا انتہائی معیوب سمجھتا ہوں اور غزل نہ کہنے کے تمام عذر لغو خیال کرتا ہوں اور یہی میرے استاد کا مشرب تھا۔ چند غزلوں کے منتخب اشعار ملاحظہ فرمایئے

خندۂ بے دلی نہ دیکھ گریۂ بیکسی نہ دیکھ
تو کبھی نہ روا تھے کہیں روتی ہوئی ہنسی نہ دیکھ

ایک رگ بہار میں سینکڑوں خار ہیں نہاں
پھول کے دل کے زخم دیکھ پھول کی پنکھڑی نہ دیکھ

میرے طریق عشق میں ہوش خودی کا نام ہے
دیدۂ ہوش سے مرا عالم بے خودی نہ دیکھ

تیرے تصورات سے اس کو ذرا سجا تو لوں
دل کو میں دل بنا تو لوں دل کی طرف ابھی نہ دیکھ

دل کا وضو ہے اشکِ خوں دل کی نماز ہے نیاز
بندگیٔ مجاز دیکھ مسلکِ بندگی نہ دیکھ

میں آوارۂ راہِ ہست و عدم ہوں   کہاں تک مرا ساتھ دے گا زمانہ

تمہیں بتاؤ کہ کیا ہو مآلِ عشق اگر   تمہیں نظر پہ مجھے دل پہ اختیار رہے
قفس نہیں تو مرے ساتھ دفن ہو زنجیر   کوئی تو عہدِ اسیری کی یادگار رہے

ہمارے منہ سے بس اک بار آہ نکلی تھی
تمام عمر مجاز ان سے شرمسار رہے

مبادا انقلاب آ جائے تاریخِ محبت میں
وہ کیوں اپنی زباں سے کہہ رہے ہیں داستاں میری

اب اٹھانی ہی پڑے گی زحمتِ صبر و قرار
یہ تری مرضی اسے ہنس کر اٹھا رو کر اٹھا

تیرے در تک کوئی قوت تھی جو لے کر آ گئی
ورنہ میں تو راہ میں اکثر گرا اکثر اٹھا!

جا رہا ہوں اپنی نامعلوم منزل کی طرف   ہر نفس ہے ایک آوازِ درا میرے لئے

بزمِ ہستی میں مسلسل کارفرما ہے جنوں   ختم اک دن قیدِ جیب و آستیں ہو جائے گی
اس کے کوچے سے نکل کر اب تعین کیا مجاز   زندگی کو ہے بسر ہونا کہیں ہو جائے گی

الجھ کے ٹوٹ نہ جائیں ربابِ حسن و شباب   نوا پہ نغموں کی لے سے مری فغاں نہ ملا!

قفس کے سامنے رکھ دو جلی ہوئی شاخیں   کوئی تو ربط مجھے آشیاں کے ساتھ رہے

نہ طعنہ دے یادِ ماسوا کے جو تو نے دیکھا نظر جھکا کے
تو گوشے گوشے میں میرے دل کے تری تمنا چھپی ملے گی

جنوں کی ضد میں خرد نے اب تک خدا سے بندوں کو دور رکھا
خرد کا کوسوں پتہ نہ ہو گا، جنوں کو جب آگہی ملے گی

مذاقِ سوزِ طلب سلامت لگی ہوئی بھی کہیں بجھی ہے
جو طور پر سرد ہو چکی ہے وہ آگ دل میں دبی ملے گی

مجید

عبدالمجید

وطن ڈیرہ اسمٰعیل خاں والد کا نام عبدالعزیز خاں عمر ۲۳ سال ۱۵ ستمبر ۱۹۲۸ء میں بمقام ایبٹ آباد پیدا ہوا ۱۹۴۲ء میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ایر فورس میں ملازمت کر لی۔ پہلی غزل ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ یوں تو شاعری کی ابتدا پانچویں جماعت سے ہو گئی تھی

میں جو روتا ہوں لوگ ہنستے ہیں — جانے کیا ہو گیا زمانے کو
انھیں ہے صرف بھروسہ تری نوازش کا — جو دو جہان کو محبت میں ہار بیٹھے ہیں
سسکیاں ہوتی رہیں گی یونہی ہر روز بلند — عصمتیں سینکڑوں لٹ جاتی ہیں ایوانوں میں

محشر

فاروق احمد بدایونی

میری پیدائش کا سنہ ۱۹۲۲ء ہے تاریخ ولادت کا مجھے علم نہیں۔ گھر والے اب بھی مجھے فاروق کے نام سے پکارتے ہیں۔ والد کا نام مولوی حسین احمد اور میرا فاروق احمد ہے میں نے اپنے تخلص میں نام کو شامل رکھا ہے۔ ارباب سخن میں فاروق محشر بدایونی کے نام سے یاد کیا جاتا ہوں۔ ۱۹۳۲ء تک گھر میں اردو فارسی کی تعلیم پاتا رہا۔ اور بعد ازاں گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں میں چھٹی جماعت میں داخل کر دیا گیا۔ دسویں جماعت کی سند حاصل کر کے بریلی کالج بریلی میں میرا داخلہ ہوا۔ کچھ نامساعد حالات کی بنا پر انٹرمیڈیٹ سے مجھے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دینا پڑا۔

شاعری میرا خاندانی ورثہ ہے۔ باپ چچا۔ پھوپا۔ اور بھائی سب ہی شاعر ہیں۔ شعر گوئی کا شوق جب میں آٹھویں جماعت میں تھا۔ اسی وقت سے دامنگیر ہو چکا تھا اور اس دوران میں اپنے پھوپا حضرت عیش بدایونی شاگرد حضرت امیر مینائی کو کلام دکھاتا رہا جب شعور پختہ ہوا تو فکر و نظر میں بلندی پیدا ہوئی اور حال کے تقاضوں کو سوچنے سمجھنے کی

کوشش کی آخر یہی فیصلہ کیا کہ تقلید کی رسمی قید و بندش سے نکل کر آزاد روی سے اپنے لئے نئی راہیں تلاش کی جائیں۔ مطالعہ جاری رکھا۔ پڑھا زیادہ اور لکھا کم

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ شکیل بدایونی سے رشتۂ دوستی منسلک ہو گیا وہ شکیل کی شاعری کا اولین دور تھا۔ ہمہ وقت شعر و شاعری کی ہی باتیں ہونے لگیں۔ شکیل کی طبیعت غزل کی طرف مائل تھی۔ اور میرا رجحان نظم کی طرف۔ رومانی جذباتی' قومی اور اصلاحی بیشمار نظمیں میں نے بطور مشق کہیں۔ کبھی کبھی غزل بھی کہہ لیا کرتا تھا۔ سب سے پہلی غزل جو میں نے ایک مشاعرے میں پڑھی۔ وہ بہت چمکی اہل سخن کی ہمت افزائیوں نے مجھے بڑھنے کا اور موقع دیا۔ اس غزل کے دو شعر یہ ہیں۔

خوشی سے نہ رغم دل جیسی نعمت کی نہیں جاتی
محبت آپ ہوتی ہے محبت کی نہیں جاتی!!

تمہارے جور بے جا کی شکایت کر تو سکتا ہوں
مگر پاس محبت سے شکایت کی نہیں جاتی

رفتہ رفتہ غزل، نظم، قطعہ، رباعی۔ تاریخ اور گیت سبھی پر دسترس حاصل کر لی ۱۹۴۳ء میں شکیل کی دعوت پر دہلی پہونچا جب کہ وہ سپلائی کے محکمہ میں ملازم تھے میں بھی اسی محکمہ میں ملازم ہو گیا۔ اب شعر و ادب کی خدمت کا زیادہ موقع ملا۔ دن رات مشاعروں میں وقت گذرنے لگا۔ راز مراد آبادی شکیل اور میں ہم سب بیشتر مشاعروں میں ساتھ ساتھ شرکت کرتے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ ادبی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ رسالہ قانون مشرق" میں بحیثیت مدیر حصہ نظم کام کرتا رہا۔ کئی کتابیں بھی مرتب کر کے شائع کیں۔ لیکن اپنا مجموعۂ کلام اب تک منظر عام پر لانے کی جسارت نہیں ہوئی۔

ستمبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ گیا۔ اور اگست ۱۹۵۰ء میں محکمہ سپلائی سے منتقل ہو کر ریڈیو پاکستان میں آہنگ کے مدیر معاون کے عہدے پر فائز ہوا۔ اور اب بھی اسی جگہ ہوں۔

کراچی میں اپنے شعرا احباب اور علم دوست بزرگوں کے شاعرانہ وجدانی تاثر نے مجھے مسحور کیا۔ اور اپنی طرف کھینچا۔ یہاں میں غزل کے ماحول میں رہنے کے باعث غزل گوئی کی طرف زیادہ راغب ہوں۔

کچھ کلام پیش خدمت ہے۔

تاج محل

اللہ یہ میں تاج محل دیکھ رہا ہوں
یا پہلوئے جمنا میں کنول دیکھ رہا ہوں

افلاک سے یا کاہکشاں ٹوٹ پڑی ہے
یا کوئی حسینہ ہے کہ بے پردہ کھڑی ہے

آغوش تجلی میں نظر سوئی ہوئی ہے
یا شام کے زانو پہ سحر سوئی ہوئی ہے

اک خاک سے ابھری ہے زلیخا کی جوانی
یا چاہ سے نکلا ہے کوئی یوسف ثانی

ٹھہری ہوئی یا حسن کے مرکز پہ نظر ہے
یا وقت کے ہاتھوں میں گریبان سحر ہے

یا بر لب جمنا کوئی دوشیزہ نہا کر
بیٹھی ہے تکلف سے اداؤں کو چھپا کر

یا کوئی بط مست ہے جو تیر چکی ہے
آکر ابھی دریا کے کنارے پہ رکی ہے

یا نور کا ٹیکا کوئی ساحل کی جبیں پہ
یا عالم بالا اتر آیا ہے زمیں پہ

یا حسن کے اقبال کا چمکا ہے ستارا
نکھری ہوئی چاندنی ہے کہ ٹکڑا ہوا پارا

جو صحنوں کے غنچے لئے ہیں کہ بکھرے سے پڑے ہیں
پہرے پہ نگہبان ہیں یا سرو کھڑے ہیں

تصویر لئے لیتا ہے ہر حوض کا پانی
گویا کہ جوانی کے مقابل ہے جوانی

یہ تاج نہیں منظر عبرت ہے وطن میں
دو روزہ مسرت کا جنازہ ہے کفن میں

ہے تخت تو موجود سلیماں کی کمی ہے
جنت کا دریچہ تو ہے رضواں کی کمی ہے

یہ گلکدہ کہیئے جسے فردوس کا خاکا
ہے دفن یہیں خاک میں سرمایہ وفا کا

گوشہ میں اسی قصر کے دو دل ہیں ہم آغوش
شعلے ہیں مگر مصلحت وقت سے خاموش

نظروں میں ابھی تک وہی دلچسپ سماں ہے
آنکھوں میں مری خوابگۂ شاہجہاں ہے

متفرق اشعار

کچھ آپ سے ہے محبت کا نام کچھ ہم سے
یہ رسم ورنہ اب اٹھ سی گئی ہے عالم سے

پژمردگی گل پہ ہنسی جب کوئی کلی
آواز دی خزاں نے کہ تو بھی نظر میں ہے

جس منزل پہ پہنچا دے طلب وہ منزل گرد راہ سفر
منزل پہ پہنچ جانے سے کہیں منزل کا جنوں کم ہوتا ہے

قافلے ہی تھے گمراہ جو یقین کھو بیٹھے
منزلیں نہیں مٹتیں راہ بھول جانے سے

یاد رکھنا ہمیں اے غم کے گذرتے لمحو — ہم نے کس ضبط سے ہنس ہنس کے گذارا ہے تمہیں

ہے وفا کا اس طرح ماتم وفا کی بزم میں
جیسے میں باقی نہیں رہوں جیسے تو باقی نہیں

کسی عالم میں کسی راہ گذر سے گذرے — آدمی خالق منزل ہے جدھر سے گذرے

سبھی صحن چمن میں پھول چننے کو نہیں آتے
کچھ اپنے دامنوں میں خار الجھانے بھی آتے ہیں

اس کی خاطر جو نہ اپنا ہے نہ بیگانہ ہے — کبھی اپنوں کی سنی ہے کبھی بیگانوں کی

آ کے اس تماشے پر خلوتوں میں ہم ہنس لیں
تجھ سے میں گریزاں ہوں مجھ سے تو گریزاں ہے

طے ہوئی ہے نہ ہوگی رہ آرزو — اک سفر ختم ہے اک در پیش ہے

یہی ہوگا کہ ہوک اٹھے گی دل تڑپیگا رو لوگے — اسیرو! اور گلشن کا خیال آنے سے کیا ہوگا

بکھر گئے ہزار جلوے اک سوال دیدہ پہ — ہماری ہی نظر نے وقت پر جواب دے دیا

چٹک اے کلی لیکن آہستگی سے! — یہ آواز گوش خزاں تک نہ پہنچے

آنکھیں کھولو آنکھیں موندو آنکھوں کا ہے کھیل
دنیا تم چاہو تو حقیقت تم چاہو تو خواب!

دل آوارہ زلف آوارہ آواروں کی خیر
آواروں کو کون سکھائے مجلس کے آداب

نثار احمد رسول نگری

محشر

سنو تو امت مرحوم کے حدی خوانو!!!
سبھی کبھی یاد ہے اک نغمہ کارواں کے لئے

محسن ☆ شیخ محمد محسن بی اے

محسن ادب نباض فطرت جناب شیخ محمد محسن بی اے یقیناً اس تعریف اور توصیف کے ہر لحاظ سے مستحق ہیں جو ادارہ اپنے تذکرے میں ظاہر کر چکے ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں ہم باوجود کوشش کے نہیں سمجھ پاتے لیکن ایک وقت آتا ہے کہ وہی باتیں خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں۔ محسن صاحب کے کلام میں آپ اس خوبی کو بدرجہ اتم موجود پائیں گے۔ محسن صاحب کی طبیعت "نئی جدت" پسند ہے۔ اسی لئے وہ بحری قیود سے آزاد ہیں۔ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے پھر محسن صاحب اس سے کیوں محروم رہیں۔ محسن صاحب کا تذکرہ اور کلام اساتذہ فن کے لئے لمحۂ فکر ہے اور طالب علموں کے لئے ایک آسان طریقۂ شعر گوئی ہے۔ کلام محسن کی بے پناہ صفات سے متاثر ہو کر ادارہ اس پر نوٹ لکھنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ یقیناً آپ پڑھنے کے بعد ہماری اس مختصر رائے سے پورا پورا اتفاق فرمائیں گے۔ (ادارہ)

میری تاریخ پیدائش ۶ر اپریل سنہ ۱۹۱۷ء ہے۔ وطن مالوف لاہور۔ اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کا امتحان ۱۹۳۲ء میں پاس کیا۔ طالب علمی کے زمانے کا ریکارڈ شاندار رہا۔ چنانچہ میٹریکولیشن اعلیٰ فرسٹ ڈویژن میں حاصل کی۔ ایف ایس سی کے امتحان میں کالج بھر میں فرسٹ آیا۔ اور بی۔ اے میں ایک خاص وجہ سے صرف گیارہ نمبر کی کمی سے فرسٹ ڈویژن رہ گئی۔ کالج چھوڑنے کے بعد ریلوے کی ملازمت اختیار کی۔ ریلوے میں مختلف عہدوں پر مامور رہا۔ مثلاً ٹریفک کینوسیر، اسسٹنٹ کنٹرولر اور ٹریفک انسپکٹر۔ آجکل لاہور ڈویژن میں مؤخر الذکر عہدے پر کام کر رہا ہوں۔ چند سال ریلوے کی طرف سے ملٹری میں بھی رہ چکا ہوں۔

شاعری کا شوق مجھے کالج کے زمانے سے تھا۔ شروع میں انگریزی Blank Verse لکھا کرتا تھا مگر ملازمت میں آنے سے اور خانگی حالات کی ناسازی اور بے حد الجھنوں کی وجہ سے یہ شوق جاتا رہا۔ لاہور ڈویژن میں آنے سے پہلے میں کوئٹہ ڈویژن

میں تھا اور غالباً ماحول کا اثر اور احباب کے ذوقِ سخن کا نتیجہ تھا کہ پرانا شوق عود کر آیا اور چند غزلیں اس وقت کہیں جب میں بلوچستان میں تعینات تھا جنہیں ارباب ذوق نے سراہا چند ایک مشاعروں میں خوب داد ملی اور یہ سلسلہ بدستور جاری رہا۔ لاہور میں خواجہ دل محمد صاحب سابق پرنسپل اسلامیہ کالج کے یہاں پنجاب کے بہترین شعراء کی ایک نشست ہوئی وہاں جب میں نے ایک طرحی غزل پڑھی تو سامعین عش عش کر اٹھے۔ اور ایک اور غزل سنانے پر مجبور کیا گیا قتیل شفائی ایڈیٹر ادا جالا نے میرے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد کرانے کی خواہش ظاہر کی۔ کراچی میں ڈاکٹر یاور عباس صاحب یاور کے زیر اہتمام پیر الٰہی بخش کالونی میں ایک مشاعرہ ہوا اس میں پیر الٰہی بخش سابق وزیر اعلیٰ سندھ اور سندھ و پاکستان کے بہترین شعراء موجود تھے۔ حاضرین کے اصرار پر مشاعرہ کا افتتاح مجھ سے ہوا ایک ایک شعر پر نعرے لگے شعری بھوپالی جگر مراد آبادی احسان دانش نے بے پناہ داد دی، عدیم الفرصتی کی وجہ سے میں مشاعروں میں کم جاتا ہوں میں بحری قیود کا اتنا قائل نہیں بقول حافظ

من نہ دانم فاعلاتن فاعلات

شعر من بہ از آبِ حیات

منظر کشی، رفعتِ تخیل، ندرت پسندی انسانی فطرت کا تجزیہ میرے کلام کی خصوصیات ہیں۔ ایک دیوان صدائے محسن کے نام سے چھپنے والا ہے نمونۂ کلام ملاحظہ فرمایئے۔

نالہ جو رک جائے تو اچھل جاتا ہے ۔۔۔ فکرِ سخن بھی تو یونہی اُبل آتا ہے
یہ ارادہ تھا مصمم اس کام کو چھوڑ دوں ۔۔۔ خلشِ جگر میں پھر اک خلل آتا ہے
اور شاعر کی دنیا میں جو آتا ہے تزلزل ۔۔۔ روزِ محشر مان اس سے سہل آتا ہے
طلسمِ باطل کو جو وہ توڑ کے رکھ دیتا ہے ۔۔۔ بدکار کی دنیا میں اک خلل آتا ہے
کہہ جاتا ہے اور کہہ کر گذر جاتا ہے ۔۔۔ شورشِ زیست کا بن کے وہ حل آتا ہے
بیانِ سوز دردِ دل کو تو سمجھتا ہے تعیش ۔۔۔ مجھ کو نظریہ کا مضمحل آتا ہے
سوزشِ دل سے میری تابندہ ہے محفل ۔۔۔ زینت کو تیری آج اس سے خجل آتا ہے
تجلی ربطِ حسن و عشق دیکھ کر خود اس کو ۔۔۔ کس قدر خوفِ خدائے لم یزل آتا ہے
دلِ بسمل کے سودا کی پروازی تو دیکھ ۔۔۔ چشمِ جاناں ہیں وہ بن کے کنول آتا ہے
یہ مہرِ تاباں کی جلن یا سوزِ دروں کی تپش ۔۔۔ دیدۂ تر میں جو دریا سے ابل آتا ہے

فطرتِ انسانی کو کرتا ہے محسنؔ انتشار
گو نہ بحرِ رجز اس کو نہ بحرِ رمل آتا ہے

رنگِ فضا کرم پہ مائل نظر نہیں آتا — ہیں اتنی دور کہ ساحل نظر نہیں آتا
بادِ باراں بھی ہے اسیرِ گرداب بھی ہوں — حریمِ موج تو ہے ہم ساحل نظر نہیں آتا
فروغِ حسن بھی منت کشِ دلِ شاعر ہو — پر اس دل پہ جو ہو گھائل نظر نہیں آتا
شکوۂ دل سناتا ہوں تو ذرا لطف نہیں — ان کا شکوہ ہے کہ دل نظر نہیں آتا
یہ تو بتا یہ کا مخرج سوزِ عشق کا بند حسن — گو ان کا جو ہے حاصل نظر نہیں آتا
اور اس پہ اترانا اور یوں تسلیم دینا — مجھ کو تو تم سا جاہل نظر نہیں آتا
پر عشق کی دنیا سے یہ آتی ہے صدا — کہ تجھ سا رہبر کامل نظر نہیں آتا
عشق ہے بے پایاں سمندر پھر اس میں — تصور نا خدا ہے کہ ساحل نظر نہیں آتا
تیری سنہری نگاہ اور رسیلے تبسم سے — اثرِ آہ و فغاں زائل نظر نہیں آتا

محسنؔ کا عشق ہے عشقِ حقیقی کہ یہ ا
بن کے حسن کا سائل نظر نہیں آتا

آج میری بے خودی مائلِ پرواز ہے — نغمہ سنجی پہ نہیں نوائے سوز و ساز ہے
تو ہو تیرا دیدہ ہو کہاں نصیب مجھ — اک تصور میں جھکی فقط جبینِ نیاز ہے
تیرا دیدار نا خدا طور پہ بھی کوئی راز ہے — لن ترانی اسقدر کس قدر یہ ناز ہے
حسرت دیدار میری نغمہ سنج ہونے تو دو — یہ جہاں کیا شش جہت آواز ہی آواز ہے
تو سراپا حسن ہے میں سراپا سوز ہوں — اس پہ تم کو ناز ہے اس پہ مجھ کو ناز ہے
کسی ادا پہ مرمٹوں یہ ہے میری کائنات — ادائیں بے شمار ہیں ہر بات میں انداز ہے
شیخ کی تکمیلِ عبادت روزہ نماز ہے — حور کی امید ہے اور یہی چارہ ساز ہے
زندگی اک سوز ہے زندگی اک ساز ہے — زندگی کا در اصل عشق ہی آغاز ہے
میں تو اک کنہ گار ہوں کسی کا دیکھ شوقِ وصل — پھر نہ مکر جانا کہیں اصل میں مجاز ہے
آ کہ تجھ بن اس طرح بیزار ہوں بیکار ہوں — کہنے کو کہہ دوں دل پردہ دارِ راز ہے

کچھ بلا کا حسن ہے اور اس پہ میرا حسنِ ظن
پھر چشمِ نیم باز کیا ہر ادا ہی ناز ہے

محمود
شیخ محمود حسن سیتاپوری

نام :- شیخ محمود حسن

تخلص :- محمود

جائے پیدائش اور وطن :- سیتاپور یو۔پی۔

عمر :- تقریباً ستّر سال

تعلیم و تربیت لکھنؤ میں پائی۔ غالباً ۱۹۲۵ء سے میری ادبی خدمات کی ابتداء ہوئی اور اودھ پنچ کی حیات تک اسکا مدیر و معاون رہا۔ کچھ عرصے بعد ایک طرف تو میرے مضامین نے م۔ح سیتاپوری کے نام سے اخبار "اودھ پنچ" لکھنؤ کی ادبی خدمات کی مستقل شکل اختیار کر لی اور دوسری جانب میرے مذاق شاعری نے مختلف طرح کلام کے مشاعروں میں شریک ہو کر اپنے فرائض کی ادائیگی کی کوشش شروع کی جس کی آمیزش میں ۴۵ سال گذر گئے جب میری ان خدمات نے کچھ نمایاں ترقی حاصل کی تو مجھ پر خود اور دنیا کو یقین ہو گیا کہ میں ایک مفید زندگی گذارنے کی صلاحیت رکھتا ہوں اور میرے دماغ کے اندر کوئی ایسی صلاحیت موجود ہے جو ادبی خدمات بخوبی انجام دے سکتی ہے۔ جیسا اس تعریف کے مستحق تو وہی حضرات ہیں جنہوں نے میری زندگی کے مقصد کو شوق اور خوشی سے لیا۔ اور اپنی تقریروں اور تحریروں میں نہایت پرخلوص طریقوں سے میرے حوصلوں کو بڑھایا۔ در نہیں اس بات کا قائل ہوں کہ معمولی تعلیم و استعداد کی بنیاد پر کوئی عظیم الشان قصر تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ کروں۔ اور جانبداری کے تنگ و تاریک ماحول سے باہر آکر اپنے معاصرین کی خوبیوں کی تائید میں خوشگوار ذرائع فراہم کرنے کا انتظام کروں۔ میرے معاصرین قدیم میں منشی سجاد حسینؒ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار آنجہانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء میں پاکستان آگیا۔ اور اب کراچی میں مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی ہے

مری وفائیں نہیں انکو یاد آنے کی   ارادے جنہیں عادت ہو کہ بھول جانیکی
بنا رہے ہیں وہ اک اپنی بیعت کہ مری خاک   کہ تیر ناز کو پھر فکر ہے نشانے کی
خدا وہ دن تو کرے اور اعتماد بڑھے   وہ اور فکر کریں میرے آزمانے کی
تمہارے ایک تغافل کا کیا کروں شکوہ   جفائیں اور بھی لاکھوں ہیں جی جلانے کی

نقاب سوز ہے جو حسن برق رفتار تو پھر
کچھ اور ہوگی ادا ان کے منہ چھپانے کی

جو میرے دل ہی میں کبھی بہار ہو نہ سکا   چمن کھلا تھا مگر خوشگوار ہو نہ سکا
مقام شوق تھا جہاں تھا ہزار جلوے تھے   مگر نظر کو کہیں پر قرار ہو نہ سکا
ہر ایک جبر کی کلفت میں مبتلا ہی رہا   خود اپنے دل پہ جسے اختیار ہو نہ سکا
انھوں نے یاد کیا ہوگا جبر یوں ہی سہی   مگر ابھی تو ہمیں اعتبار ہو نہ سکا

اگرچہ جامۂ تمنا بہار ساماں تھا
طلوع نشہ کے قابل شمار ہو نہ سکا

دل میں اب کیا رہ گیا جب حسن کی محفل نہیں   آہ وہ جو پھر آ کے جس میں جلوے محمل نہیں !
بیقرار ہی ہے مری درد برق وش مائل نہیں   یہ تقاضا ہی مگر وجہ سکون دل نہیں
جب سلیقہ ہی نہیں کیوں کر اٹھاتے ہیں قدم   کیوں یہ شکوہ ہے نظر کے سامنے منزل نہیں
چارہ نہیں ہے درد کی لیکن مشکل آ پڑی   اب کسی اظہار کے قابل ہمارا دل نہیں

کیا سمجھ کر اب کریں عرض تمنا آپ سے
جب ہماری عاجزی بھی آپ کے قابل نہیں

نہ کچھ درد دل ہی وہ ٹھہرا گئے ہیں   نہ کچھ غم کے پہلو بدلوا گئے ہیں!
کرم جن کا لایا یہ مجبور لب تک   گل و شمع لے کر وہ خود آ گئے ہیں
ہوا کیا جو درد کم جب کہ دل ہی نہ تھا   نہ جانے وہ کس طرح سمجھا گئے ہیں
رہ عشق کو اپنی جب اک پر سبھی   جہاں تک مجھے ہوش پہنچا گئے ہیں

زمانے نے محمود دیکھے نہ سمجھے!
وہ جلوے جو اس دل کو تڑپا گئے ہیں

مضطرؔ
محمد عبداللہ خاں گجراتی

میرا پورا نام محمد عبداللہ خان اور تخلص مضطر ہے۔ آبا و اجداد موضع سوہل خورد ضلع گجرات (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ میری پیدائش سنہ ۱۹۱۳ء میں میرے ننہال موضع عالم گڑھ میں ہوئی ماں اور باپ دونوں واسطوں سے علم و ادب مجھے ورثے میں ملے ہیں میرے نانا میاں غلام حسین تاعین حیات گاؤں ہی میں درس قرآن و حدیث دیتے رہے بڑے بڑے علماء تک نے ان سے استفادہ کیا گجرات کے شمالی دیہات میں ان کا نام آج بھی احترام سے لیا جاتا ہے۔ میرے دادا میاں نور الدین مرحوم بھی ایسی ہی صفات سے متصف تھے وہ نائب تحصیلدار ہوئے تو شہر گجرات میں مستقل سکونت اختیار کر لی

دو سال کی عمر میں مجھے قدرت نے سایہ پدری سے محروم کر دیا۔ اس کے ایک سال کے بعد دادا جان نے بھی انتقال فرمایا۔ اپنے خاندان کی واحد یادگار رہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ جس نے ایسے اسباب مہیا فرمائے کہ مجھے بہت کم مرحلوں پر یتیمی کی چوٹ محسوس ہوئی۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد لاہور اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا اعلیٰ تعلیم کے مراحل طے کرنے کے بعد میں اکاؤنٹنٹ آفس میں ملازمت اختیار کی اور اب تک معاش کا ذریعہ یہی ہے

میرا شعار تو اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ اردو فارسی سے مجھے بچپن سے لگاؤ رہا ہے یہی جبلت تھا کہ شاعری کی ابتدا کی۔ مولانا ناطق گلاؤٹھوی میرے اولین استاد تھے۔ انھیں ایام میں میری نظمیں اور غزلیں گجرات کے مقامی رسائل وغیرہ میں نکلتی رہیں۔ ٹاؤن ہال گجرات میں وقتاً فوقتاً جتنے مشاعرے میرے زمانہ تعلیم میں ہوتے شعر سننے کے شوق کی بنا پر میں نے سب میں شرکت کی

مجھے مناظر فطرت سے بے حد شغف ہے میرے نزدیک جو شاعری محض نشاطی موضوعات کے گرد گھومتی ہو بے کار محض ہے میں سمجھتا ہوں کہ شاعر قوموں کی تعمیر و تخریب

میں سب سے موثر پارٹ ادا کر سکتا ہے۔ اس لئے انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنانے اور ظلمت کدۂ حیات کو منور کرنے کے لئے شاعر کے فکر و نظر میں ہم آہنگی اور توازن نہایت ضروری ہے۔ جن افکار میں زندگی کی عوامی اور دوامی قدروں کی جھلک نہیں پائی جاتی تاریخ ادب میں انھیں کوئی مقام نہیں ملے گا میں غزل سے زیادہ نظم نگاری کو پسند کرتا ہوں۔ میرے خیال میں ادب کے آنے والے ارتقائی دور میں یقیناً مختصر مگر مفکرانہ نظموں کو قبولِ عام کا درجہ عطا ہوگا۔

ابتدا سے شاعری میں حضرت جلیل مانک پوری سے اصلاح لی پھر غالباً ۱۹۲۶ء میں علامہ سیماب اکبر آبادی کے دامنِ فیض سے وابستہ ہوا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میری شاعری کا عروج و ارتقا کلیتہً استاد قبلہ سیماب رحمۃ اللہ علیہ کی پدرانہ شفقتوں کا مرہونِ منت ہے ایسے شفیق استاد بہت کم نصیب ہوتے ہیں۔ آگرہ اسکول مجھے ناظمین اردو میں سے شمار کرتا ہے۔ شعر و ادب میں میرا مقام جو کچھ ہے وہ ادب نواز ہستیوں کا حسنِ عطا ہے ورنہ من آنم کہ من دانم اس سے زیادہ کیا کہوں۔ بہت سی تصانیف تیار کر رکھی ہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ میری زندگی میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آئیں گی یا موت کے بعد۔ بہت سے مشاعروں کے نشیب و فراز دیکھ چکا ہوں۔ لیکن اب طبیعت ان ہنگاموں سے گھبراتی ہے۔ نمونۂ کلام کے طور پر ایک نظم اور ایک غزل پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

اشاراتِ مستقبل

لائی ہے پیغامِ نو صبحِ وطن میرے لئے
پھر سجا ڈالا سرِ نو انجمن میرے لئے

ہاتھ ہے میرے جنوں کا نبضِ مہر و ماہ پر
عہدِ مستقبل ہے موضوعِ سخن میرے لئے

حال کے نازک تیوروں سے تبسم ریز ہیں
عظمتِ ماضی کے آثارِ کہن میرے لئے

حلقۂ طوفانِ آتش میں ہے بیتابِ نمو
خلد زارِ نسترین و نسترن میرے لئے

دیکھ کر ناقابلِ تسخیر خودداری مری
موت نے سیکھے ہیں دلداری کے فن میرے لئے

شگفتگی و راحت مرے احساس کے دکھ بیل ہیں
دامنِ صحرا ابھی ہے صحنِ چمن میرے لئے

لاؤ میں خود ہی ادا کر دوں یہ فرضِ ناگزیر
کون بدلے گا زمانے کا چلن میرے لئے

لے رہے ہیں کروٹیں فتنے زمانے میں ابھی
کچھ افسانے اور ہوں گے اس فسانے میں ابھی

سینکڑوں پردے رخِ ظلمت پہ ڈالے جائیں گے
راستے مطلب برادری کے نکالے جائیں گے!

جھونپڑوں کو امن کی دے کر نوید پر فریب
ظلم کے گرتے ہوئے ایواں سنبھالے جائیں گے

بدلے جائیں گے بہم دیگر عناصر کے خواص
شبستانوں سے انگارے اچھالے جائیں گے

سینکڑوں آذر اٹھیں گے پردۂ تہذیب میں
کتنے بتخانے رہ کعبہ میں ڈالے جائیں گے

آندھیوں کے رحم پر ہوگا نظام رنگ و بو
گلستاں سے گلستاں والے نکالے جائیں گے

شیطنت ہوگی مزاج آدمیت میں دخیل
آستینوں میں ہزاروں سانپ پالے جائیں گے

یورشِ طوفاں سے کچھ محفوظ رہ جائیں گے وہ
جو سرِ طوفاں سفینوں کو بڑھالے جائیں گے

بجلیوں کی آتشیں تنظیم خار و خس میں ہو!
آنے والے دور کی تقدیر کس کے بس میں ہو

غزل

تیری جبیں سے عرش نمایاں ہوا کہاں
تو قابل سلام و پیام و وفا کہاں

دیر و حرم میں تجھکو ملے گا خدا کہاں
دنیا ہے خود پرست خدا آشنا کہاں

ان کا تو سجدہ نہیں نقش پا نہیں!
پھر یہ سرِ نیاز مرا جھک گیا کہاں

مجبور یاس جب دل ناکام تھا مرا
اس وقت انقلاب زمانہ کا تھا کہاں

اس آستاں سے سر نہ اٹھا آستاں اٹھا
ان کو بھی ثبوت محبت ملا کہاں

اک جست میں فلک کی حدیں ختم ہو گئیں
کیا جانے اب پڑے گا قدم دوسرا کہاں

کس کی صدا پہ گوش سراپا ہے کائنات
کہتے ہیں لوگ سازِ نفس ہیں صدا کہاں

منزل کی سرزمیں ہے نہ بانگِ درائے صبح
آخر یہ ہم نے رختِ سفر رکھ دیا کہاں

ہے عشق اک حریمِ حقیقت بجائے خود
پھر ہم کریں نمائشِ محبت ادا کہاں

آئے گا رفتہ رفتہ سمجھ میں یہ انقلاب
ان سے کہاں ملے تھے ہوئے تھے جدا کہاں

یہ ایک ہی تو کعبۂ سجدہ نواز تھا
گم ہو گیا نظر سے ترا نقشِ پا کہاں

غم بھی بڑی خوشی ہے مسلسل اگر ملے
ورنہ خوشی کا ذکر بقیدِ فنا کہاں

مضطر بہت ہیں شعر و سخن کے یہاں امام
لیکن جوابِ حضرتِ سیماب کا کہاں



مضطر اکبرآبادی

سنہ ۱۹۲۲ء میں وطن مالوف اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم تحصیل اعتماد پور ضلع آگرہ میں حاصل کی سنہ ۱۹۳۸ء میں آگرہ واپس آکر اردو اور فارسی کے امتحان الٰہ آباد یونیورسٹی سے پاس کئے۔

تعلیم سے فارغ ہو کر معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ مگر یہ پیشہ سازگار نہ آیا۔ چنانچہ معلمی کو خیرباد کہا۔ اور حالات کی نامساعدت سے تنگ آکر اکتوبر ۱۹۴۲ء میں آگرہ سے لاہور پہونچا۔

لاہور پہونچتے ہی معاشی الجھنوں میں پھنس گیا۔ اور ان کے سلجھانے کیلئے مختلف مقامی اخبارات و رسائل کے دفاتر کا طواف کیا۔ مگر کوئی معنی خیز نتیجہ برآمد نہیں ہوا ایک ہفتہ کی مسلسل تگ و دو کے بعد علامہ تاجور نجیب آبادی کی خدمت میں دیال سنگھ کالج پہونچا۔ مرحوم بڑی محبت سے پیش آئے۔ اور انھوں نے بچوں کے ہفت روزہ پرچہ ہمدم کے ادارہ میں مجھے شامل کر لیا۔

"پریم" ویکلی میں تقریباً ایک سال کام کرنے کے بعد ماہنامہ "شاہکار" لاہور سے متعلق ہوگیا۔ مگر حالات کی گردش پھر "پریم" کے ادارہ میں لے آئی اور یہ سلسلہ چھ ماہ تک جاری رہا۔ چھ ماہ کے بعد بعض اقتصادی امور کی بنا پر "پریم" سے قطع تعلق کرنا پڑا "پریم ویکلی" سے دوبارہ علیحدگی اختیار کرکے لاہور کی مشہور پبلشنگ فرم "فیروز سنز" کے ادارۂ تصنیف و تالیف سے وابستہ ہوگیا۔ مگر یہ وابستگی مالکان ادارہ کی شدید ادیب کش اور کاروباری ذہنیت کے پیش نظر محض چار ماہ رہ سکی۔

"فیروز سنز" سے علیحدہ ہوکر کافی عرصہ بیکاری کی زندگی گذاری۔ مگر جب یہ بیکاری نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تو پھر کسی مستقل ذریعہ معاش کے حصول کی فکر لاحق ہوئی اور یہ فکر کشاں کشاں اردو بک سٹال لاہور تک لے گئی جہاں ماہنامہ "کتاب" لاہور کے ادارۂ تحریر میں جگہ مل گئی اور زندگی کے دن مزے سے سکون سے گذرنے لگے۔

تقریباً ایک سال کا عرصہ سکون سے بسر ہوا تھا کہ پنجاب میں فسادات کے شعلے بھڑک اٹھے اور ان شعلوں نے قلیل عرصہ میں تمام ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جس کا نتیجہ تقسیم ملک کی صورت میں برآمد ہوا۔ تقسیم ملک کے فوراً بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں مجھے راولپنڈی آنا پڑا۔ راولپنڈی آکر میں ایک کتب خانے سے منسلک ہوگیا۔ اور ابھی تک بدستور وہی سلسلہ جاری ہے۔ مگر میری تنوع پسند طبیعت پھر کسی نئے انقلاب کی منتظر ہے اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انقلاب میری زندگی میں بہت جلد رونما ہونے والا ہے۔

یہ تھے میرے اب تک کے مختصر حالات۔ اب رہی شعر گوئی کی بات تو میری شاعری کا آغاز ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ شروع میں چار پانچ سال تک روایتی قسم کی چیزیں کہتا رہا جن کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن لاہور آنے کے بعد مجھے شعر کا صحیح شعور ہوا اور عام روش سے ہٹ کر شعر کہنا شروع کیا۔ غزل میری محبوب ترین صنف سخن ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اس تیرہ سال کے عرصہ میں جو کچھ کہا ہے اس میں غزلوں کی بہتات ہے۔

میں نظم کی افادیت کا معترف ہوں اور کبھی کبھی کسی خاص واقعہ سے متاثر ہوکر نظم بھی کہتا ہوں۔ مگر غزل کو غیر فانی صنف سخن تصور کرتا ہوں۔ اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جب تک انسان میں حسن لطیف اور جمالیاتی ذوق کی رمق موجود ہے غزل

ہرگز نہیں ہو سکتی۔

ذیل میں اپنی غزلوں کے متفرق اشعار کا انتخاب پیش کرتا ہوں جو غمِ جاناں کی لطافت "غمِ دوراں" کی تلخی اور طنز کی ملاحت کا آئینہ دار ہے۔

متفرق اشعار:۔

اپنوں کی نگاہ قہر نکلی   نہ تریاق کی بو نہ زہر نکلی

دل میں ترا پیار بس گیا ہے   پھر اجڑا ہوا دیار بس گیا ہے

ازل سے ابتک ہے ایک ہی رنگ زیست کے بحرِ بیکراں کا
وہی تلاطم وہی تموج وہی تھپیڑے وہی سفینہ

کچھ ہمت والے لوگوں کو ہے وسعتِ طوفاں ناکافی
کچھ بزدل انسانوں کے لئے محدود کنارا کافی ہے

دل سے یوں اٹھ رہی ہے آواز   جیسے تم نے مجھے پکارا ہے!

ہر صبح بدلتے رہتے ہیں ہر رات بدلتے رہتے ہیں
حالات کا شکوہ کیا کیجے حالات بدلتے رہتے ہیں

یوں بات بنے تو کیسے بنے یوں کام چلے تو کیسے چلے
میں بات پہ قائم رہتا ہوں وہ بات بدلتے رہتے ہیں

اب توجہ کی ضرورت تھی تو آنکھیں پھیر لیں   اور ہی دنیا آ کے ٹھکرا رہے دنیا نے کہاں

خیالِ امروز نہ فکرِ فردا غمِ محبت غمِ زمانہ
یہی مری مختصر حقیقت یہی مرا مختصر فسانہ

قفس کی محبوس زندگی کو چمن پہ ترجیح دینے والے
درست تیرا خیال لیکن ہے آشیانہ پھر آشیانہ

منظر دلیں منظر ہستی ہیں اے مضطر تمام   کیا مسرت کیا الم تکلیف کیا آرام کیا

کسی کی زلف نے یوں پیچ و خم قبول کیا   کہ بے ضرورت غم دل نے غم قبول کیا
یہ سوچ کر کہ کہیں تو خفا نہ ہو جائے   ترا ستم بھی بہ رنگِ کرم قبول کیا
بچھڑ کے تجھ سے جہاں میں کہیں پناہ جب نہ ملی   کسی نے دیکھ کسی نے ستم ہم قبول کیا

رات بھر تو ٹوٹ کر دیتے رہے اشکوں کا ساتھ
صبح ہوتے ہی ستارہ دل کو نہ جانے کیا ہوا

حقیقتِ غمِ دل در خورِ بیاں تھی کبھی
یہ داستاں بڑی دلچسپ داستاں تھی کبھی

تجلیاتِ محبت سے جگمگا اٹھی!
یہ کائنات دگر نہ دھواں دھواں تھی کبھی

نہ جانے صدیوں سے کس کی ہے منتظر دنیا
کہ آج تک اسی مرکز پہ ہے جہاں تھی کبھی

دنیا میں با وجودِ طلب کچھ نہ مل سکا
بے مانگے مل گیا غمِ دنیا کبھی کبھی

سمٹی تو حشر بن گئی پھیلی تو کائنات
لائی ہے رنگ یوں بھی تمنا کبھی کبھی

بہار آئے چمن میں تو آئے کس کے لئے
کہیں قفس میں بہاروں سے کھیلنے والے

خزاں بہار کی تمہید ہے مآل نہیں
خزاں سے کھیل بہاروں سے کھیلنے والے

ثابت ہوا ہے تجربۂ میکشی غلط
اب کیجئے علاجِ غمِ روزگار کا

اے بے خبرِ عشق ذرا دل سے خبر دار
دل زیبِ نگیں ہے تو جہاں زیرِ نگیں ہے

میں آپ کی خاطر کئے لیتا ہوں گوارا
ورنہ مجھے مطلوب نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

ملی نہ جب کوئی معقول شئے زمانہ میں
کشاکشِ غمِ ہستی خرید لی میں نے

بلندیوں کی حقیقت سے آشنا ہو کر
بڑے خلوص سے پستی خرید لی میں نے

گلہ کیا کیجئے حالات کی ناسازگاری کا!
یہ طوفاں کشتیٔ عمرِ رواں کے ساتھ رہتا ہے

تاریکیوں کے ایسے بھی دور آئے زیست میں
اکثر چراغ جلتے ہی بے نور ہو گئے!

معیارِ دیر و کعبہ کی پستی کو دیکھ کر
ہم خود کو سجدہ کرنے پہ مجبور ہو گئے

لینا پڑا کسی کی محبت کا آسرا
طے جادۂ حیات کو تنہا نہ کر سکے

زمانہ بھر کو غلط رو خیال کرتے ہیں
یہ اہلِ دیر و حرم بھی کمال کرتے ہیں

خرد وروں سے فنا دو جہاں رکھتے ہیں لوگ
بڑے انوکھے انوکھے سوال کرتے ہیں

شکستِ دل ہی تو ہے کوئی ایسی بات نہیں
حضور کس لئے اتنا ملال کرتے ہیں!

تکلیفِ ضبطِ آہ نہ کرتے تو ظلم تھا!
غم سے اگر نباہ نہ کرتے تو ظلم تھا

تھی دل کو احتیاج تمہاری نگاہ کی
تم زحمتِ نگاہ نہ کرتے تو ظلم تھا

ترے بغیر مرے غم کدے کی شمعوں کو
کبھی کبھی سی درخشاں ہنسیاں میسر ہیں

ترے جمالِ تغیر سرشت نے مجھ کو
قدم قدم پہ دیا ہے فریبِ نظارا

وہ جیتے جب کوئی بازی تکلفاً جیتے
میں ہارا جب بھی کوئی شرط عادتاً ہارا

دور میں جام آنے والا ہے
غم تہِ دام آنے والا ہے

دل سے اتنا گریز مت کیجے
دل بڑے کام آنے والا ہے

میں اتنا سست گام یقیناً کبھی نہ تھا
مجھ کو مرے شریکِ سفر نے ڈبو دیا

غرقابیٔ سفینۂ دل کچھ نہ پوچھیے
ہلکی سی ایک موجِ نظر نے ڈبو دیا

میں نے مضطر حادثاتِ نو بہ نو کے باوجود
زندگی کو نغمہ سنج و نغمہ خواں رہنے دیا

ہلکے سے اک تبسم صبحِ جمیل سے
پھیکی سی پڑ گئی ہے ستاروں کی داستاں

کٹ گئی اک نور و ظلمت کے تصادم میں حیات
گاہ شمعیں بجھ گئیں گاہے فروزاں ہو گئیں

آرزوئیں بھی ہیں مضطر کس قدر سادہ مزاج
فرطِ اطمینانِ خاطر سے پریشاں ہو گئیں

گویا غمِ حیات سے کچھ مل گئی نجات
چند اپنے ہم خیال جہاں مل گئے مجھے

میں اجنبی تھا محفلِ ہستی میں سربسر
اچھا ہوا کہ آپ یہاں مل گئے مجھے

دشمنوں کا تو خیر ذکر ہی کیا
دوست ہم سے گریز کرتے ہیں

کرتی ہے روز روز نئے رنگ اختیار
دنیا قدیم ہوتے ہوئے بھی جدید ہے

منزلیں جھک نہ گئیں قدموں پہ آکر جب تلک
راہ رو راہ گزاروں سے الجھتے ہی رہے

جنہیں منزل کی طلب تھی سرِ منزل پہنچے
جو تن آساں تھے سہاروں سے الجھتے ہی رہے

تیری نظروں نے حفاظت تو بہت کی لیکن!
حادثے درد کے ماروں سے الجھتے ہی رہے

اپنے ہی غم کا صرف نہیں ہوں میں آئینہ — شامل مرے غموں میں غمِ دیگراں بھی ہے
اے کم نظر چمن میں فقط دیکھنے کی چیز — حسنِ بہار ہی نہیں رنگِ خزاں بھی ہے

غم ہائے زندگی کی تواضع کے واسطے — توفیقِ جشنِ جم بھی میسر نہیں مجھے
کیا پوچھتے ہو میری تہی دامنی کا حال — آسودگیٔ غم بھی میسر نہیں مجھے

تلخ لمحات میں پینے کا مزا آتا ہے — ہجر کی رات میں پینے کا مزا آتا ہے
لطف یوں دیتی ہے اشکوں کی جھڑی میں تری یاد — جیسے برسات میں پینے کا مزا آتا ہے
ان سے دیرینہ ملاقات چلی آتی ہے — کچھ تو ہے بات جو یہ بات چلی آتی ہے

ایک مدت سے بدستور ہے کیفیتِ غم
جوں کی توں صورتِ حالات چلی آتی ہے

کسی حسین کی جانب نگاہ کر لینا — کوئی گناہ نہیں یہ گناہ کر لینا
بے ربط تسلسل سے عبارت ہے یہ دنیا — آغاز کسی کا ہے تو انجام کسی کا

حدودِ گردشِ ایام سے نکل کر بھی — خیالِ گردشِ ایام آ ہی جاتا ہے
جکڑ ہی لیتے ہیں اس زلف کے حسیں حلقے — بشر بشر ہے بہر دام آ ہی جاتا ہے

ستم ظریفیٔ فطرت کا بھی جواب نہیں — طلب کیا تھا تبسم فغاں ملی ہے مجھے
نکل کے آیا ہوں جس دن سے تیری محفل — نہ دیر میں نہ حرم میں اماں ملی ہے مجھے
نہ عرضِ غم کی جسارت نہ ضبطِ غم کی مجال — عجیب قسم کی تاب و تواں ملی ہے مجھے

جواں ہیں اسکے سبب زندگی کے ہنگامے — وہ جو گردشِ ایام بھی غنیمت ہے
سکونِ غم بڑی کم یاب جنس ہے مضطر — نصیب ہو تو یہ آرام بھی غنیمت ہے

خزاں ادھر سے کبھی بھول کر نہیں گذری — حضور جس روشِ گلستاں سے گذرے ہیں
رہِ حیات میں کھٹا گرچہ حادثوں کا ہجوم — گذر کے دائرۂ گردِ میاں سے گذرے ہیں

ملا ہے جن کی بدولت سکونِ دل مضطر
کبھی کبھی وہ ہمیں لئے گراں سے گذرے ہیں

مظہر الدین

میری پیدائش بٹکوہا ضلع گورداسپور میں ہوئی بچپن کا کچھ زمانہ وہیں گذرا اور ۱۹۲۵ء میں والد ماجد حضرت مولانا نواب الدین صاحب اپنے وطن قصبہ رامداس ضلع امرتسر میں تشریف لے آئے

قبلہ و کعبہ سلسلہ چشتیہ صابریہ کے مشہور شیخ طریقت تھے۔ جن کے لاکھوں مرید ہیں — میرا تاریخی نام مظہر الدین ہے۔

میں نے تصوف کے جس شعر ساماں ماحول میں آنکھ کھولی وہاں مغنی و شاعر نغمہ خواں تھے۔ اور صوفی وجد کناں۔

میں سن شعور سے شعر کہتا ہوں۔ شعر میری زندگی ہے اور زندگی شعر۔ ساڑھے گیارہ سال تک میں نے حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی سے اصلاح لی ہے۔ تفویض میں استاد محترم نے اپنے جن فارغ الاصلاح تلامذہ کی فہرست شائع فرمائی ہے ان میں میرا نام بھی ہے

تقسیم ملک سے پہلے میں غزل کہتا تھا۔ لیکن جب سے میرا مزاج حریف سنگ بنا ہے میں اس وقت سے نظم کہتا ہوں۔ میری نظموں کا مجموعہ "شمشیر و سناں" کے نام سے قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور نے شائع کیا ہے۔ اور دوسرا مجموعہ "حرب و ضرب" کے نام سے زیر ترتیب ہے۔

دمیدہ دانہ و بالیدہ آشیاں گم شد
در انتظار ہما دام چیدہ ام بنگر

چند نظموں کے اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

قم باذن اللہ

بتا بتا اسے رہا ہیں بہ بط وطاؤس — دیار غیر میں ہوں جس کی بیٹیاں محبوس
خبر کرو کسی جانباز مردِ غازی کو — بجا رہے ہیں مساجد میں برہمن ناقوس
یہی تو عہدِ رواں میں پیامِ فطرت ہے — سمجھ نہ میری اذاں کو صدائے نامانوس
جہاں کے لب پہ ہے پھر شورِ قم باذن اللہ — خدا کرے کہ یہ طوفاں تجھے بھی ہو محسوس
اسی کے شوق میں آنکھیں کھلی ہیں انجم کی — جلو میں لے کے جو نکلے گا قدسیوں کا جلوس
فغاں کہ بجھ گئے خوش رنگ مسجدوں کے چراغ — صنم کدوں میں فروزاں ہیں احمریں فانوس

نظر نظر اکہ ترے سامنے ہے فریادی
دیارِ ہند کے مسلم کی عزت و ناموس

جائزے

توہمات میں غلطاں ہیں بادہ خوار ابھی — مئے شبانہ کا اترا نہیں خمار ابھی
طلوع ہو گئی صبحِ جمیل و زرافشاں — فضا پہ چھایا ہوا ہے مگر غبار ابھی
مزاجِ لالہ و گل کی فسردگی کی قسم — نظر ہے منتظرِ جلوۂ بہار ابھی
ہیں جیب کچھ لبوں کی رنگینیوں کو کیا دیکھو — مری نظر میں ہے ہر شاخ سوگوار ابھی
جھکی جھکی ہوئی نظریں بجھے بجھے چہرے — سیاستِ غمِ دوراں کے ہیں شکار ابھی
وہی ہے حالِ فقیرانہ ہم غریبوں کا — نظر فروز ہے ملبوسِ شہریار ابھی
سنا رہا ہے فسانے دراز دستی کے — ہماری جیب و گریباں کا تار تار ابھی
ملا نہیں ابھی شاعر کو اذنِ گویائی — نظامِ جبر سے خائف ہے اختیار ابھی

ہنوز محفلِ خوابیدہ کو جگانا ہے
بلند و پست کی تفریق کو مٹانا ہے

منظر

شمشاد حسین صدیقی

اکبر آبادی

میرے لئے اس فرض کی ادائیگی بے حد دشوار ہے کہ میں اپنے حالات خود لکھوں۔ ہر چند کہ ابتدائے ہوش سے اس وقت تک ادب و شعر ہی میرا اوڑھنا بچھونا رہا ہے اور میں نے ایسے مخصوص ادبی ماحول میں پرورش پائی ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

اور جب یہ صورت ہے تو ظاہر ہے کہ میرے حالات دوسروں سے کچھ مختلف ہی ہوں گے اور کسی نہ کسی خصوصیت کے حامل بھی لیکن شاید ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے کہ میں ان خصوصیات کی وضاحت کروں۔ اس لئے صرف ایک فرض کی ادائیگی کے طور پر انتہائی بے ربطی کے ساتھ اپنے حالات کی بالکل نامکمل تصویر پیش کر رہا ہوں۔

چونکہ میں سنہ ۱۹۲۳ء سے باقاعدہ ذمہ دارانہ طور پر ادب و شعر کی خدمت کر رہا ہوں اس لئے ہند و پاک میں ایسے لوگ کم ہی ہوں گے جو یہ نہ جانتے ہوں کہ میں مولانا سیماب اکبر آبادی (مرحوم) کا خلف اکبر ہوں۔ اس نسبت خصوصی کو میں اپنے لئے جس قدر بھی باعث فخر سمجھوں کم ہے اور چونکہ میری زندگی کا بیشتر حصہ انھیں کے زیر سایہ بسر ہوا ہے۔ اس لئے شاید اس کی وضاحت کی بھی ضرورت نہیں کہ میں نے اُنھی کا تمام زمانہ کیسی کیسی اہم ادبی او شعری مصروفیتوں میں گذارا ہوگا۔

البتہ ان مصروفیتوں کا ایک اجمالی خاکہ اس طرح پیش کر سکتا ہوں کہ سنہ ۱۹۰۹ء میں کانپور میں پیدا ہوا۔ بچپن کا زمانہ اجمیر، ٹونڈلہ اور آگرہ میں گذرا اور یہیں ابتدائی تعلیم کی تکمیل کی اس کے بعد سلے وی ہائی اسکول ٹونڈلہ میں بھی کچھ دن تعلیم پائی۔ لیکن کئی سال کی طویل بیماری کی وجہ سے یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا۔ اس کے بعد جب قبلہ گرامی مستقلاً آگرہ تشریف لے آئے اور اگست سنہ ۱۹۲۳ء میں قصر الادب کا قیام اور "پیمانہ" کا اجرا کیا۔ تو میری ادبی زندگی کی بنیاد پڑ چکی تھی۔

سنہ ۱۹۲۳ء سے سنہ ... کے آخر تک "پیمانہ" اور ہفتہ وار "تاج" کے انتظامی امور میں

حصہ لینے کے علاوہ بے شمار رسائل اور اخبارات کی ادارت کر چکا ہوں جنہیں "ثریا" "شاعر" "کنول" "مشورہ" اور ہفتہ وار "ایشیا" بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ہفتہ وار "ایشیا" تقریباً چار سال جاری رہا۔

ادبی زندگی کے متعلق بھی صرف اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ ۱۹۳۱ء سے شعر کہنے کا شوق ہوا اور کانپور کے ایک مشاعرہ میں قبلۂ گرامی کی اجازت کے بعد باقاعدہ مشق شروع کر دی تھی جس کی تکمیل انہیں کے زیر سایہ ہوئی۔ یوں تو مجھے شاعری کی ہر صنف سے دلچسپی رہی ہے لیکن نظم کی طرف میرا رجحان بہت زیادہ رہا ہے۔ اور ایک زمانے میں تو سیاسی نظمیں لکھنے سے بے انتہا دلچسپی رہ چکی ہے جو میری انتہائی شہرت کا باعث ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ڈرامے اور بے شمار افسانے بھی لکھے ہیں۔ اور ادبی و سیاسی مضامین کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہے۔ دور حاضر میں سیاسی نظمیں بھی کئی سال تک مسلسل لکھتا رہا ہوں۔

نظموں غزلوں افسانوں اور ادبی مضامین کے کتنے ہی مجموعے بے ترتیب رکھے ہوئے ہیں مگر ابھی تک کوئی شائع نہیں ہو سکا ہے۔

قبلۂ گرامی مولانا سیماب اکبرآبادی کی وفات کے بعد فروری ۱۹۵۱ء کے آخر میں پاکستان آگیا ہوں خیال تھا کہ یہاں رہ کر اپنے افکار پریشاں کو یکسوئی کے ساتھ مرتب کر سکوں گا لیکن یہاں آئے ہوئے مجھے تقریباً ایک سال اور ۸ ماہ ہو چکے ہیں مگر ابھی تک کوئی ایسی صورت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ میں اپنی ادبی زندگی کی ابتدا کر سکوں اس عرصہ میں جن شدید مصائب اور روحانی اذیتوں سے گزرنا پڑا ہے وہ مجھے ذہنی اور دماغی طور پر مفلوج کر چکی ہیں اور میں ان دنوں نہایت بے کیف اور بے روح زندگی بسر کر رہا ہوں۔ پاکستان میں اہل وطن اور اہل کی قدر دانی و ناقدری کے ہولناک ترین تجربات ہوئے ہیں وہ مجھ جیسے باغی انسان کے لئے کسی طرح بھی قابل برداشت نہیں ہیں اور اسی لئے میں گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا ہوں

اپنے جذبات کے لئے بجز چند شعر پیش کرنے پر اکتفا کروں گا!

الفت رہے نہ آئینۂ حسن و عشق میں — اک حرف کا ہے فرق جمال و جلال میں

بالآخر ہم بھی اپنی زندگی کو مٹ چکے ہیں — یاد آئے گا اے دوست تجھ کو بے رخی اپنی

اٹھاؤں غم دل تجھ پہ [illegible] — [illegible] آدمی بنانے کو

[illegible] یاد [illegible] — [illegible] کا [illegible]

جدید ہے کوئی تصویر ذہن فطرت میں — بنا بنا کے ہیولے مٹائے جاتے ہیں

جس وقت تک جنوں کے قدم درمیاں رہے — معلوم خود ہمیں بھی نہیں ہم کہاں رہے

برباد کر کے دے نہ فریب التفات کے — اب ہم تری نگاہ کے قابل کہاں رہے

جب میں نہ تھا تو دل کا تعین محال تھا
جب دل نہ تھا تو آپ کے جلوے کہاں رہے

مرا دل مر گیا تو زندگی کو روئے گی دنیا — تماشا یا محفل ہستی عبارت ہو مرے دل سے

بیکار ہے جنوں سے بھی فرصت اگر ملے — اب اتنی دور لوٹ کے جائیں تو گھر ملے

دیکھئے کس نام سے ہو ذکر مرگ ناگہاں — نام میری بیخودی کا زندگی مشہور تھا

دل کے ٹکڑے آنسوؤں میں بہہ گئے
اب بتا اے حسن ہم کیا رہ گئے

علامہ سیماب اکبر آبادیؒ

کی زندگی کے آخری لمحات کی ایک زندہ جاوید یادگار

سیرۃ النبیؐ

علامہ کے قلم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کو
تمام حشو و زائد سے پاک کر کے ایک نئے
اسلوب کے ساتھ پیش کیا ہے

اس کی کتابت و طباعت کے لئے صرف یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ اسے تاج کمپنی لمیٹڈ نے
شائع کیا ہے

قیمت مجلد صرف تین روپیہ محصول ۸؍

مکتبۂ پرچم کراچی

۳۵۳

منظور

منظور احمد قریشی

تاریخ پیدائش ۴ مارچ سنہ ۱۹۱۵ء مولد لشکر (دار السلطنت ریاست گوالیار) شہر گوالیار میں تعلیم پائی ابھی بارہ سال کی عمر بھی نہ ہوئی تھی کہ یکے بعد دیگرے تمام سرپرست اس دار فانی کو خیرباد کہہ گئے۔ ۱۳ سال کی عمر ہی میں فکر معاش نے سلسلہ تعلیم سے محروم کر دیا۔ میرے والد علی محمد ان کے بڑے بھائی مولوی پیارے محمد مفتی ریاست گوالیار حضرت مولانا مقبول حسین صاحب کے خواجہ تاش بھائی تھے۔ میرا نام مفتی صاحب ہی نے منظور احمد تجویز کیا تھا مرحوم جب تک زندہ رہے میں ان سے فیضیاب ہوتا رہا۔ خدا نے ذوق شاعری عہد طفلی ہی میں میری فطرت کو بخش دیا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ سنہ ۱۹۳۲ء میں جناب شفا صاحب و حضرت مولانا معراج صاحب دھولپوری بی۔ اے کے مشورے پر ایک بزم قائم کی جس کا نام بقائے اردو تجویز کیا گیا انھیں دونوں حضرات نے باتفاق رائے مجھے بزم کا سکریٹری مقرر کر دیا حالانکہ میں اس بار گراں کے قابل نہ تھا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں اسی بزم کا نام جناب شفا صاحب نے سیماب لٹریری سوسائٹی جملہ اراکین کی اتفاق رائے سے تبدیل کر دیا اس وقت تک بزم میں شعراء کی تعداد تقریباً چالیس تھی اور میں بھی اپنا کام بحسن و خوبی انجام دے رہا تھا۔ ابھی تک تلمذ سے محروم تھا۔ بالآخر سنہ ۱۹۴۰ء میں جناب شفا صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل کیا مجھ سے قبل شفا صاحب کا کوئی شاگرد نہ تھا۔ اب تلمذ کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ اور بزم میں چار چاند لگ گئے۔

مگر انقلاب نے سب کو منتشر کر دیا میں بمبئی چلا گیا۔ مگر وہاں بھی پریشانیوں سے نجات نہ ملی بال بچے بھی ہمراہ تھے ایک سال بمبئی رہ کر بھوپال آ گیا تقریباً ساڑھے تین سال بھوپال رہ کر پاکستان آ گیا فی الحال وہاڑی ضلع ملتان میں ملازم ہوں آگے خدا حافظ

انتخاب کلام

دل مرا دل اور بت خانے کو کعبہ کر دیا ۔۔۔ قطرے کو دریا کیا ذرے کو صحرا کر دیا

پست کو بالا کیا ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا — تو نے نقطے کو وہ پھیلایا کہ دنیا کر دیا
اے نگاہ ناز جاناں اک تماشا کر دیا

سنبھالیں اپنی بزم ناز جس انداز سے چاہیں
مگر محسوس ہی کرتے رہیں گے وہ کمی میری

خمیدہ سر جھکی نظریں زباں ساکت قدم لرزاں
جب ان کے سامنے پہونچا تو یہ تصویر تھی میری

حسرت بھری دیکھ کے میری نگاہ سے — اٹھی گھٹا پیام بہاراں لئے ہوئے

شام فراق اشک نوازی نہ پوچھئے — سارے ستارے ٹوٹ کے داماں میں آگئے

بال بکھرے زرد چہرہ آنکھ پر نم دل ملول
ان کا دیوانہ ہے دیوانے کی یہ پہچان ہے

زمیں تنگ آسماں دشمن خفا تقدیر وہ برہم
نظر آتا ہے اب سارا جہاں نا مہرباں مجھ کو

یہ انتہائے تجسس ہے یا فریب نظر — کہ گلستاں میں نشیمن مرا نہیں ملتا

شب فراق سے لو دل میں ہے معاذ اللہ
ترس رہا ہوں اجالے میں روشنی کے لئے

یہ کس شہید وفا کا غم ہے یہ کون دنیا سے جا رہا ہے
کہ شمع محفل سسک رہی ہے ستارے آنسو بہا رہے ہیں

نہ جانے کونسا عالم ہے یہ محبت کا!! — کہ شاد ماں ہوں مگر مسکرا نہیں سکتا

دیجئے پھر دعوت جلوہ فراز طور پر — پھر نگاہ شوق کو محو تماشا کیجئے!!

جان جائے گی تو جائے گی کسی کے عشق میں
میرا مرنا بھی حیات جاوداں ہو جائیگا

یہ بھی خیال مجھ کو تغافل شعار ہے — منظور وقت کشمکش انتظار ہے

غم نے منظور غم نصیبوں کو — خوگر غم بنا کے لوٹ لیا

پریشاں ساز ہوتی ہے پریشاں کی پریشانی
پریشاں میں ہوں اور عالم پریشاں ہوتا جاتا ہے

منظر

گل محمد کلیمی

اگرچہ اب میں خود کو منظر کلیمی لکھتا ہوں لیکن میرا اصل نام گل محمد ہے اور منظر تخلص ہے۔ بستی کوٹلہ دیوان تحصیل جام پور ضلع ڈیرہ غازی خان کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا ابتدائی تعلیم مقامی اسکول سے حاصل کر کے کوٹلہ مغیلان کے ماڈل اسکول میں داخل ہوا مگر میں اپنی بدنصیبی کو کن الفاظ سے یاد کروں۔ ابھی ساتویں درجہ میں تھا کہ والد کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ اور تمام کنبہ کا بوجھ میرے کمزور شانوں پر آپڑا جوں توں کر کے ایک دو سال اور کوٹلہ مغیلان میں تعلیم حاصل کی۔ جے۔ وی اور ایس۔ وی کی سندات حاصل کیں۔ اور ڈیرہ غازی خاں کے بورڈ کے اسکول میں تقرر ہو گیا۔ تھوڑے عرصہ بعد منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور گورنمنٹ کی ملازمت میں آگیا۔ آجکل گورنمنٹ ہائی اسکول راجن پور میں اردو فارسی کا معلم ہوں۔ میری شاعری کی ابتدا اردو سے اور نہ کافیوں سے ہوئی جو کہ میں اپنی مادری زبان ملتانی میں کہتا تھا پھر اردو میں معمولی اشعار کہنے لگا شروع میں حضرت کیفی جام پوری (جو میرے استاد کے فارغ الاصلاح شاگرد ہیں) کو اپنا کلام دکھایا کرتا تھا اس کے بعد حضرت طالوت صاحب (جو ہمارے ضلع کے فاضل اور قادر الکلام شاعر ہیں) سے اصلاح لینے لگا۔ بعد میں حضرت طالوت صاحب کی ہدایت اور ان کے توسط سے سنہ ۱۹۴۱ء میں استاذی المکرم علامہ سیماب کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گیا۔ علامہ مرحوم کا طریقہ اصلاح کچھ ایسا پسند آیا کہ مرحوم سے آخر وقت تک استفادہ کرتا رہا۔

مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا علامہ مرحوم ہم سے جدا ہو گئے مسند شعر و ادب خالی ہو گئی۔ میں حیران تھا کہ اب میری رہبری کون کرے گا۔ لیکن جلد ہی مطلع سیمابیت کا ایک روشن ستارہ حضرت صبا متھراوی نظر آیا۔ چنانچہ اب استاذی حضرت صبا متھراوی میرے ذوق کی رہبری فرما رہے ہیں۔

ہیں علامہ سیمابؔ سے کبھی نہ مل سکا۔ مرحوم بذریعہ ڈاک اصلاح دیا کرتے تھے۔

تو ہی فسانۂ ہستی تو ہی حدیث حیات!!
تو ہی ہے میری محبت کی داستاں اے دوست

میں تیری یاد کے ہی آسرے پہ زندہ ہوں
وگرنہ زیست کی ہمت مجھے کہاں اے دوست

کہہ سکے کیا کوئی بہاروں سے — یہ ہنسی اور غم کے ماروں سے
ناخدا اب تو ڈوب جانے دے — تنگ ہیں ہم ترے سہاروں سے
نہ ملا جو حرم سے بندوں کو — مل گیا تیری رہگذاروں سے
دل کی دھڑکن نظر کی بے تابی — تنگ ہیں ہم تو غمگساروں سے

آج پھر میری طرف مست نگاہیں اٹھیں — بعد مدت کے در میکدہ پھر باز ہوا
اس کو صیاد نے بڑھ کر کہا پابند قفس — تول کر پر جو یہاں مائل پرواز ہوا
ہو گئی جرأت اظہار تمنا دل کو — غالباً آج کوئی گوش بر آواز ہوا

سمجھنا ہے مجھے دنیا کو اس لئے پیہم — نظر پہ، فکر پہ اور دل پہ غور کرتا ہوں
کبھی امید و تمنا کا سوچتا ہوں مآل — کبھی میں آرزوئے دل پہ غور کرتا ہوں
سوال اور یہ ایں نخوت و ناز شیخ و پیہم — ارے میں جرأت سائل پہ غور کرتا ہوں

لبوں پہ جان ہے باقی ہے انتظار ہنوز
کسی کے وعدے کا ہے مجھ کو اعتبار ہنوز

چمن کی راہ تو منظر ہیں کب کا بھول گیا
بہار کو ہے مگر میرا انتظار ہنوز

میرے تن سے جان نکلی حسن کی آنکھوں سے اشک
وائے حسرت ہو گئے یوں چاک پردے راز کے

واعظ مجھے تو سمجھا سکے عرشیوں نے بھی — لیکن نہ ہی نظر میں وہی کافری رہی

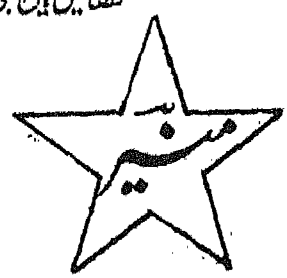
ہے مدت کا یقین نہ اب اعتبار زیست
تیرے بغیر زندگی اک وہم سی رہی!

میرے سجدوں کے لئے ہے آپ ہی دیر و حرم
پھر بھی اے کافر ترے قدموں پہ جھک جاتا ہوں میں

قلندر

قلندر تو زمانے کا بڑا انسان ہوتا ہے — قلندر کو زمانے کا بڑا عرفان ہوتا ہے
قلندر آفتوں میں منھ نہیں تکتا مشیت کا — قلندر پیکر خاموش ہوتا ہے محبت کا
قلندر ظاہری جاہ و حشم سے دور ہوتا ہے — قلندر بے نیاز قیصر و مغفور ہوتا ہے
قلندر آستاں پہ زر پرستوں کے نہیں جاتا — قلندر بادشاہوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا
قلندر کی زباں اپنی لطافت کھو نہیں سکتی — قلندر سے خدا کی بھی خوشامد ہو نہیں سکتی
قلندر شان استغنا قلندر روح خودداری — قلندر کو کہیں مجبور کر سکتی ہے ناداری
قلندر تو خودی کا پیکر خوددار ہوتا ہے — قلندر عین مجبوری میں بھی مختار ہوتا ہے
قلندر اک نمونہ ہے جہاں میں بے نیازی کا — کبوتر کو بھی دیتا ہے سبق وہ شاہبازی کا
قلندر سرکشوں کی سرکشی پر تھوکنے والا — قلندر ہم نشین قدسیان عالم بالا
قلندر کی نظر عرش بریں سے بھی بہت آگے — مقام اس کا ہے جبریل امیں سے بھی بہت آگے
قلندر کو کیا تفویض خالق نے ضمیر ایسا — جو لاکھوں ظلم سہہ سکتا ہے لیکن جھک نہیں سکتا

کبھی دیکھی تھیں منظر ہم نے استغنا کی شہراہیں
فضا میں ہیں ابھی گونجی ہوئی اقبال کی راہیں!



منیر گوالیاری

میری ابتدائی تعلیم والد ماجد قبلہ مولانا نصیر اکبرآبادی کے زیر نگرانی گھر ہی پر ہوئی اور اس کے بعد اسکول اور پھر کالج کے تعلیمی ماحول میں علمی منازل طے کیں شاعری کا شوق اوائل عمر ہی سے تھا حضرت شفا گوالیاری کا ممنون کرم ہوں کہ انھوں نے مجھے شاعر بنا دیا

بہا کافی دلچسپی لی اور انھیں کی توبہ آج بھی شامل حال ہے۔ کچھ عرصہ صبا متھرادی سے بھی استفادہ کیا۔

آپ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میرا وطن گوالیار رہے۔ اس سے پہلے متیر کا اور اضافہ کر لیجئے اب نام مکمل ہو جاتا ہے متیر گوالیاری۔

آج کل بی اے کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہوں اور ایک ادبی ماہنامہ روحی بھی کراچی سے نکال رہا ہوں۔

متفرق اشعار

اندھیرا کر سکے زائل نہ اک تاریک قسمت کا
ستاروں نے بہت چاہا بدلنا رنگ ظلمت کا

بدل دے گی کبھی تو جگمگا کر رنگ ظلمت کا
پکڑ رکھا ہے دامن ہم نے اپنی شام فرقت کا

کبھی راز شفق ہوں اور کبھی راز گل و شبنم
ازل سے لے رہا ہوں جائزہ میں اپنی فطرت کا

ابھی سے آپ کی آنکھیں ہیں پرنم دیکھ کر مجھکو!
ابھی چھیڑا کہاں ہے میں نے افسانہ محبت کا

محبت جس کو کہتے ہیں منیر آساں نہیں کوئی
زمانہ بوں تو دم بھرنے کو بھرتا ہے محبت کا!

فراق جوش مے میں جب بھی مستانہ مچلتا ہے!
صراحی کروٹیں لیتی ہے پیمانہ مچلتا ہے

وہ دل میں ہیں تو سب کچھ ہے مرے دل میں خدا رکھو!
حرم انگڑائیاں لیتا ہے بتخانہ مچلتا ہے!

کسی کی مست نظریں مجھ پہ شاید پڑنے والی ہیں
نہ جانے کیوں مری رگ رگ میں پیمانہ مچلتا ہے

بہاروں میں شفق میں چاند میں تاروں میں شبنم میں
جہاں دیکھو مری الفت کا افسانہ مچلتا ہے

گلوں کے دل دھڑکتے ہیں بہاریں کپکپاتی ہیں
لرزتا ہے چمن جب کوئی دیوانہ مچلتا ہے

زمانہ یاد آتا ہے منیر اپنی محبت کا
کبھی جب شمع کے قدموں میں پروانہ مچلتا ہے

اللہ اللہ ہیں کبھی شایان کرم سمجھا گیا — آپ کا حسن ظن ہے آپ کا احسان ہے
یہ تری سجدہ نوازی اے مرے سجدہ نواز — میرا سر اور آستاں تیرا خدا کی شان ہے

منحصر ہیں وسعت داماں پر رموز و آگہی
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا اسے عرفان ہے

جلوہ ارزانی سلامت تاب نظر ہو مگر
ان کی صورت دیکھنے کا ہر جگہ امکان ہے

کیسی الجھن میں پڑا ہے اک اسیر انقلاب
خود قفس میں دل نشیمن میں چمن میں جان ہے

یہ گلوں کی آڑ میں انگڑائیاں لیتا ہے کون
اب کبھی کہہ دو ہم نہیں ہیں یہ خدا کی شان ہے

عرش پر موجود کوئی اور کوئی محدود طور
اپنا اپنا حوصلہ ہے اپنی اپنی شان ہے

عرش والا بھی نکل آیا تھا اک دن طور پر
اے منیر انسان کا یہ مرتبہ یہ شان ہے

یہ دنیا ہے منیر اس میں ذرا محتاط ہی رہنا
بہت سے جان لیوا بھی چھپے ہیں جاں نثاروں میں

محبت کوہ راسخ ہے محبت کا سہارا لو
بلا کی استواری ہے محبت کے سہاروں میں

منیر ان کی نظروں سے سب پی چکے ہیں — جبھی تو یہ مخمور سارا جہاں ہے!

ہنسی وہ کیا ہنسی جو آنسوؤں میں ڈھلنے لگتی ہو
منیر آزردہ کر دیتی ہے دنیا کو خوشی میری

اگر ہے ناز انھیں اپنی بے وفائی پر — رہ وفا میں منیر استوار ہم بھی ہیں!

منشی غلام علی سلوئیوی

غلام علی نام منشی تخلص سلوئی ضلع جہلم وطن ہے ۱۰ رمارچ ۱۹۰۲ء کو عالم ظہور میں آیا اور ہنوز پچاس سال سے بقید حیات ہستی پر بصورت مدرس موجود ہوں چند اشعار ملاحظہ فرمایئے شاید پسند آئیں

شوخ چشمی سے ہو ہیدا ہیں ادائیں حسن کی
بے حجابی اوڑھے یہ گھٹائیں حسن کی
چاند سے مکھڑے پہ ہے نورانیت چھائی ہوئی
گلشن خوبی پہ ہے گویا بہار آئی ہوئی
ایک ہنگامہ بپا بس رونق محفل میں ہے
کوئی کیا جانے کہ آخر کیا ہمارے دل میں ہے

منتظر حفیظ اللہ خاں خورجوی

میرے والد کا نام احسان اللہ خاں صاحب ہے وطن عزیز تحصیل خورجہ ضلع بلند شہر یوپی کا ایک چھوٹا سا قصبہ عنبر کھیڑہ جائے پیدائش لاہور اور تاریخ پیدائش ۱۹۲۸ء ہے۔

کب تک ترے فراق میں تڑپا کروں گا میں
دوں کس طرح تسلیاں ذوق نظر کو میں
مجھکو گماں ہوتا ہے کبھی روز حشر کا
چپ چپ سا دیکھتا ہوں کبھی گھر کے گھر کو میں
منتظر چلی ہے زندگی بھی دل کے ساتھ ساتھ
کس طرح دیکھوں لٹتے ہوئے اپنے گھر کو میں

منظر

سیّد انصار احمد

سیّد انصار احمد نام "آغا" لقب "منظر انعام" تخلص والد ماجد کا نام سیّد انعام الحق آغا ہے۔ اس لئے تخلص کا جزو آخر "انعام" نام کی رعایت سے رکھا ہے۔

نسلی اعتبار سے عربی النسل ہوں۔ زمانۂ غدر میں وہاں سے ہجرت کی اور ہندوستان کے پایہ تخت دہلی میں آ گئے۔ سب سے پہلے قیام بستی حضرت نظام الدین میں ہمایوں کے مقبرے کے نزدیک عرب سرائے میں ہوا وہاں سے خاندان تین حصوں میں منقسم ہو گیا۔ کچھ لکھنؤ چلے گئے۔ کچھ نے سیرام (بہار) آباد کیا۔ اور کچھ دہلی ہی میں سکونت پذیر رہے۔ میں میرٹھ میں ۲۷ اپریل ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوا۔ بقول غالب

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

تمام مورثِ اعلیٰ فوجی خدمات میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ میرٹھ میں سرکاری عطیہ کے طور پر ایک سالم گاؤں جاگیر کی حیثیت سے عطا ہوا۔ جو میری پیدائش کی جگہ تھا۔

ابتدائی تعلیم اپنے حقیقی چچا مولوی سیّد نظام الحق آغا مرحوم کے زیر نگرانی پائی میری شاعرانہ صلاحیتوں کے ابھارنے اور ادبی مذاق کے سنوارنے میں انھوں نے معتد بہ حصّہ لیا بلکہ اگر میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ میرا ذوقِ شعری ایک تصویر سادہ تھا۔ جسے ان کی کاوشوں نے پُرکار بنا دیا۔ ابتدا میں انھیں سے استفادہ کرتا رہا وہ ہمیشہ بڑی شفقت سے میرے کلام پر تنک واصلاح فرماتے اور مزید مشق و مزاولت کی تاکید فرماتے رہتے تھے

پاکستان میں آنے کے بعد حضرت صفدر علی خاں صفدر سے حسنِ اتفاق سے ملاقات ہو گئی چنانچہ ان سے شرفِ تلمذ حاصل کر لیا۔ اور آجکل انھیں سے اکتسابِ فیض حاصل کر رہا ہوں۔ فی زمانہ غنیمت ہیں ایسی اہل فن ہستیاں جو آجکل دورِ قحط الرجال میں بے لوثی کے ساتھ طالبانِ علم و ادب کو شعری ادبی بدعتوں اور گمراہیوں سے آگاہ کرنا اپنا مدِّ تتمۂ حیات سمجھتی ہیں۔ آپ ایک کہنہ مشق شاعر ہی نہیں۔ بلکہ استادانہ صلاحیتوں کے

مالک ہیں شعر و ادب میں گہری اور بے پناہ بصیرت رکھتے ہیں۔

اپنی غزلوں کا مختصر انتخاب پیش کرتا ہوں۔

قبر پہ دشمن کو لائے ہیں ستانے کے لئے — شمع روشن کر کے آئے ہیں جلانے کے لئے
دل کو برمایا جگر کو چھید ڈالا مشقِ ناز — چاہیئے آخر کوئی شے تو نشانے کے لئے
حسرتیں روتی ہیں کیوں میرے دلِ مرحوم کو — کم ہیں کیا آنکھیں مری آنسو بہانے کے لئے

ان نوائے منظر کہاں یہ غنچوں کو دلکش نصیب
ورنہ غنچے کم نہ تھے کچھ مسکرانے کے لئے

دیکھنا ہنسنا بگڑنا بولنا — ان کے ہر انداز میں انداز ہے

تجھ میں جو محبت کی نظر ڈھونڈ رہا ہوں — میں اپنی وفاؤں کا ثمر ڈھونڈ رہا ہوں
پھر جلوۂ رخ کا متلاشی ہوں شبِ غم — پھر شام کے پہلو میں سحر ڈھونڈ رہا ہوں
اللہ رے مرا حوصلۂ ذوقِ تجسس — گو پا نہیں سکتا ہوں مگر ڈھونڈ رہا ہوں
بے چشمِ کرم مجھ کو حسینانِ جہاں سے — کانٹوں میں ادائے گلِ تر ڈھونڈ رہا ہوں

کیوں درپئے آزار ہیں منظر مرے احباب
میں خود ہی کوئی راہ خطر ڈھونڈ رہا ہوں

افسانۂ حیات یہ دہرا رہا ہے کون — پھر نامرادِ زیست کو تڑپا رہا ہے کون
اب اس کا کیا جواب ہو اے اضطرابِ شوق — وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تڑپا رہا ہے کون

ہنگامۂ نزع تو کبھی ذرا آ کے دیکھ لے
دنیا سے نامراد اٹھا جا رہا ہے کون

ہے آج سے یہ شغلِ مئے ناب نکل سے — تقدیر میں ہیں ساغر و مینا تو ازل سے
ہر وعدۂ امروز کو فردا پہ اٹھا کر — کس لطف سے کرتا ہے وہ ٹال آج کا کل سے

ناقدریٔ احبابِ سخن دیکھ کے منظر
بیزار ہوا جاتا ہے دل شوقِ غزل سے

بے زبان مظلوم صبر کا ارماں پیدا کریں — جیت خاموشی میں ہے خاموشیاں پیدا کریں
میں جو چاہوں عرضِ غم تو نطق ہی دے نہ جواب — وہ جو چاہیں داستاں سے داستاں پیدا کریں
پھر اٹھے پاؤں سوئے میخانہ — ساغر و مے کی یاد پھر آئی

مہر اکبرآبادی

میری زندگی کیا ہے؟ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تو زندگی کو خود زندگی کی جستجو ہے۔ زندگی کی برق رفتاری کو دیکھتے ہوئے اس کا پیچھا کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن سا نظر آتا ہے۔ جب حالات یہ ہوں تو سوائے نشانِ راہ اور سنگ میل گننے کے اور کیا چارہ ہے۔ اس منظر و پس منظر میں فی الحال اپنی زندگی کا خاکہ ہی پیش کر سکتا ہوں۔ اور بس۔ اب رہا فن تو ؎

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی

اس کے متعلق بھی صرف چند اشاروں پر اکتفا کروں گا۔

میں ۱۵ ستمبر ۱۹۱۶ء کو قصبہ غازی آباد میں جو دہلی سے دس میل پر ہے۔ پیدا ہوا۔ ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جہاں شعر و شاعری کا چرچا تھا اور ایسے گھرانے میں پرورش پائی۔ جو شعر و ادب کا سرچشمہ تھا۔ میرے والد منیر اکبرآبادی اور میرے ماموں حضرت نجم آفندی کی شخصیتیں محتاج تعارف نہیں۔ غرض مجھے علم و ادب کا شوق اور شعر و شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے اردگرد ایک ادبی فضا محسوس کی اور مجھے اپنی عمر کے اس ابتدائی دور میں ان مشاہیر شعراء سے متعارف ہونے اور فیضیاب ہونے کے مواقع بھی بکثرت ملے جن میں سے بعض میرے والد کے حلقۂ احباب میں تھے۔ اور بعض ان سالانہ مشاعروں میں شرکت کی غرض سے تشریف لاتے تھے۔ جو میرے والد نے اپنے زمانۂ قیام غازی آباد میں منعقد کئے۔ میں نے بہت کم عمری ہی میں شعر کہنے شروع کر دیئے تھے۔ مگر میری ابتدائی شاعری بیشتر روایتی تھی۔ لیکن میری حسّاس طبیعت کا پتہ ضرور دیتی تھی۔ یوں

تو میری ادبی زندگی کا آغاز تعلیم کے ساتھ ساتھ اسکول ہی میں ہو گیا تھا۔ لیکن کالج میں پہنچ کر میری ادبی صلاحیتوں نے بڑی جلا پائی میں نے ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے کیا۔ اور اسی زمانہ سے میری ادبی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میرا تنقیدی شعور بیدار ہونے لگا تھا۔ میں اپنے زمانۂ تعلیم میں شعر گوئی کے علاوہ مضامین بھی لکھتا رہا تھا جو کالج میگزین اور ایک دو ماہناموں میں شائع بھی ہو چکے تھے۔ لیکن میرا پہلا قابل ذکر انتقادی مضمون "نگار" لکھنؤ ۱۹۴۱ء کے مختلف شماروں میں "نگاہِ بازگشت" کے عنوان سے باقاعدہ شائع ہوا جس میں دورِ حاضر کے ان چالیس اکتالیس مشاہیر شعرا پر ایک بسیط تبصرہ تھا۔ جن کے اپنے سوانح حیات اور خود کردہ انتخاب کلام "نگار" ۱۹۴۰ء کے سالنامہ میں شائع ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ملک کے مختلف مقتدر رسائل میں میری منظومات کے ساتھ ساتھ میرے انتقادی مضامین شائع ہوتے رہے۔ اور جیسے جیسے انتقادی شعور بڑھتا گیا شعر گوئی کم ہوتی چلی گئی۔ اور اب بہت کم شعر کہتا ہوں۔ وقت نظر بڑھ گئی ہے مشکل ہی سے کوئی شعر پسند آتا ہے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد حالات کی نامساعدت کی بنا پر مجھے اپنی تعلیم ختم کر کے ملازمت کی فکر کرنا پڑی لیکن کوئی خاطر خواہ ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے مجبوراً ۱۹۴۲ء میں علیگڈھ سے بی۔ ٹی۔ کی سند ممتاز حیثیت سے حاصل کی اور پھر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ۱۹۴۷ء میں اپنے ذوق کی تشنگی سے مجبور ہو کر پرائیویٹ طور پر آگرہ یونیورسٹی سے اردو۔ ایم۔ اے کا امتحان دیا۔ اور تمام یونیورسٹی میں اوّل آیا۔ جولائی ۱۹۴۹ء میں پاکستان آیا۔ اور اب گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خاں میں اردو لکچرار ہوں۔ فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ میرا سب سے محبوب مشغلہ مطالعہ کتب ہے میرا حلقۂ احباب بہت مختصر ہے۔ اس لئے کہ دوست بنانے میں بہت محتاط ہوں۔

غزلوں کے چند متفرق اشعار پیش کرتا ہوں

متفرق اشعار

میرے جنوں نے حقیقت بنا دیا ان کو — تری نظر نے تراشے تھے جتنے افسانے

تمہاری پرسشِ غم اک کرم تھا مجھ پہ مگر
کچھ اشک آنکھوں میں کیوں آ گئے خدا جانے

تبسم میں یوں غم کو میں نے چھپایا — کسی نے میرے غم کو غم ہی نہ جانا

بدلنا پڑی حسن کو اپنی فطرت　　ذرا عشق نے پھیر لیں جب نگاہیں
مشکل تو نہیں ترک تمنا مجھے لیکن　　افسردہ نگاہی تری کیونکر ہو گوارا
ہنگامِ غم عشق کی معراج نہ پوچھو　　حد ہے کہ نگاہوں سے بھی انکو نہ پکارا
میرے جنونِ شوق کی بیتا بیاں تو دیکھ　　پاکر تجھے تجھی کو پکارا کبھی کبھی!!!

میری حالت کو ہمنشیں ہنس کر کبھی سے پوچھنے والے
یہ عنوان کرم کبھی گر بدل جائے تو اچھا تھا

مرے دل سے تصور بھی چمن کا مٹ چکا لیکن
بڑھا دیتا ہے دل کی دھڑکنیں نام بہاراں تک

پھر میری ہی جانب نگراں ہے وہ ان کی تبسم ریز نظر
شاید کے تراشے جائیں گے کچھ اور ابھی الزام نئے

پوچھنے والے مجھے اپنی ذرا صورت تو دیکھ　　تیرے رنگ رخ سے میرا غم نمایاں ہو گیا
کبھی جو خفا ہیں ہوا زندگی سے　　غم دوست نے ڈال دیں ہنس کے باہیں

وفائے حسن کے تیور بدل جائیں تو اچھا ہے
مری جانب نگاہیں اٹھ رہی ہیں اب زمانے کی

ابتک نہیں ٹھہری دلِ بیتاب کی دھڑکن　　اس طرح بچھڑے دوست مجھے یاد نہ کرنا
اے گردشِ دوراں اسی مرکز پہ ٹھہر جا!
میں غش میں ہوں وہ دیتے ہیں دامن کی ہوا میں

جب بہت دکھتا ہے دل تو مسکرا لیتا ہوں میں
اور کیا زندگی ہے وجہ شادمانی کچھ نہ پوچھ

بقدر شوق ستم کی وہ داد پا نہ سکے　　کچھ اشک ایسے بھی تھے ہم جنہیں بہا نہ سکے

جنونِ شوق میں ہے اضطراب دل کا یہ عالم
نکل جاتا ہوں جب منزل سے منزل یاد آتی ہے

بھلا دیں وہ لاکھ مگر مجھ کو یہ گلا ہے کبھی باہم
کہ بھلانے کی سعی میں بھی یاد کرتے تو ہوگے

میر صلاح الدین

میں ۱۴ ستمبر ۱۹۳۲ء کو گوجرانوالہ کے ایک معزز اور متمول خاندان میں پیدا ہوا۔ میرے والد قبلہ میر حسین بخش گوجرانوالہ کے ممتاز اور کامیاب وکلاء میں ہیں۔ اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ سے میٹرک کر نے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے (آنرز) کیا۔ اور پھر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (تاریخ) کا امتحان پاس کیا۔ دسمبر ۱۹۵۶ء سے آرڈیننس کور میں سویلین آرڈیننس آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ فارسی زبان سے بطور خاص لگاؤ ہے۔ کالج ہی کے زمانہ میں علامہ تاجور نجیب آبادی کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گیا تھا۔ شعر بہت کم کہتا ہوں، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں زیادہ تر عدیم الفرصت رہتا ہوں۔ شادی ہو چکی ہے اور چند اولاد بھی۔ آجکل صحت اپنے خیر میں قیام ہے اور سید ضمیر جعفری و تیر بھائی کی قربت با وجود اس قدر کام کے کبھی شعر کہلواتی ہے۔ اور کیا عرض کروں نمونۂ کلام حاضر ہے۔

کرتا ہوں میں گناہ کہ شاید کبھی ملے | پنہاں جو تیرے عفو میں لطف سرور ہو
لے حسن بے نیاز تری بے نیازیاں | جو منتظر نہیں انہیں شرفِ حضور ہو
ضبط کر رہا ہوں میں درد کے آنسو مگر | ان کے طوفاں یہ آنکھوں سے اُمڈ سکتے ہیں
ٹوٹ بھی جاتی ہے توبہ لیکن وہ ساقی ابھی | چشم میگوں جن کی جام شراب میکشاں
ان کی نظروں کے اشارے یاد آتے ہیں | دیکھتا ہوں جب ستاروں سے میں روشن آسماں
شاید پیغمبر مقدر فصل بہار ہو | میں دیکھتا ہوں جب مری تار تار ہے
پیروں میسر بھی ذرا دیکھو سرافیا | پیروں میسر کبھی کوئی یاد آ رہا ہے
شاید آئیں اگر تجھ کو وقت ملے ملنے | انتظار میں تمنا کھو تو چین دے
جنگل نظر ہی سے پنہاں ہیں آج میر | آتے ہیں جو ہے پوچھتے ہو مرکز کہاں
خود پہ گر بیٹھو ہی جنوں ہمکنار ہے | تلاش و انتہا سے طے مرحلہ ہے
فراز کب نصیب ہے پہنچ میں قرار | جس سامنے ہو تو میں کیا دیکھوں

نازش محمد خورشید حسن حیدری

تاریخی نام محمد خورشید حسن سنہ پیدائش سنہ ۱۳۳۱ھ وطن دہلی شاعری کا ذوق لطیف مجھے وراثتاً حاصل ہوا ہے جو وائل عمر سے ہی میری رگ و پے میں ایسا پیوست ہو گیا کہ اس کی جاذبیت اور سرعت رفتار نے میرے تعلیمی زمانے کو ایک سال پیچھے چھوڑ دیا۔ بہرحال اردو انگریزی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نہ جانے میرے پاؤں میں کہاں سے گردش پرکار سما گئی۔ ہندوستان کا دورہ ختم ہوا تو چند دن عراق میں گزار دئے اور پھر ایران و فلسطین کی سرحدیں چھوڑ کر دہلی واپس آیا۔ ارادہ تھا کہ مستقل طور پر وہیں زندگی گزار دوں مگر گردش روزگار آڑے آئی اور میں خالی ہاتھ نئے وطن (کراچی) کی طرف دھکیل دیا گیا۔ یہاں تک کہ سرمایہ کا وزن یعنی میرا مجموعۂ کلام بھی وہیں رہ گیا۔ اسے میں بجا طور پر کہہ سکتا ہوں

"دلّی میں کبھی چور کے مرا دیوان گیا تھا"

یہ وہ مجموعۂ کلام تھا۔ جسے میں نے اپنے دیگر اثاثہ پر فوقیت دی تھی اور جب بغداد سے میرے اہل و عیال جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے درمیان بذریعہ طیارہ ہندوستان آنے لگے تو صرف اپنی بیاض ان کے سپرد کر دی تاکہ میں اگر زندگی کی آخری منزل سے گزر جاؤں تو کم سے کم میری یادگار تو رہ جائے بہرحال زندگی کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کی شمع سینے میں آج بھی فروزاں ہے۔

سب سے پہلے میں نے حضرت مجید دہلوی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا تین سال بعد پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کی خدمت میں آ گیا۔ اور موصوف کی ہدایت پر فارسی میں شعر گوئی کی مشق کرتا رہا۔ ایک سال بعد میری ادبی زندگی کا نیا موڑ شروع ہوا۔ اور میں حضرت جگر دہلوی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گیا۔ اگست ۱۹۳۸ء میں انھوں نے بعد مشاعرہ وزیر مانکی دہلوی اور پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کی سفارش پر مجھے اجازت اصلاح

قرار دیا۔ یہ آخری چھ سال میری شاعرانہ زندگی میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ سرکاری ملازمت کو مدت ہوئی کنارہ کش ہو چکا ہوں اور اب اخباری صحافت برسوں سے۔ قدرت کے اشارہ سے مجھے رزق پہونچا رہا ہے۔ میرے پاس سینکڑوں سے زیادہ غزلوں کا ذخیرہ ہے۔ رباعی اور قطعات حسب ضرورت کہتا ہوں۔

قطعہ

اب فضا ہے سرد تیغ بستہ ہو خون انجمن | آگ نزاد آہ آتش بار سے ملتا ہوا
لے سنی با رشہ بہت دل طب کے دن گئے | کوئی نغمہ تیغ کی جھنکار سے ملتا ہوا

رباعی

کچھ پھول ہیں جو شعلہ فشاں ہوتے ہیں | کچھ ذرے ہیں جو برق تپاں ہوتے ہیں
تخلیق کے تبسم سے کچھ شہپارے | آغوش قیامت میں جواں ہوتے ہیں

متفرق اشعار

آ گیا حسن کبھی کیا عشق کی منزل کے قریب | ہر قدم آپ کا پڑتا ہے مرے دل کے قریب
مشکل سے ملے گی مجھے فرصت شاید | آج جی بھر کے تڑپ لوں تری محفل کے قریب

نگاہ سلے بڑھ کے چھیڑ کی ہے تمہاری طرف نقاب نے کیا
چھپا لیا گی یہ منظر بھی کیا بڑھ کے آفتاب نے کیا

مجھ پہ جو بے پناہ ترا التفات ہے | آج آرزوؤں کی زد میں چراغ حیات ہے

مری کائنات ہستی تھی خوشی کے چند لمحے | ترے غم سے جو بچا تھا اسے لے اڑا زمانہ
تو جو ٹھہر گیا کہیں نبض حیات رک گئی | تیرے قدم کے ساتھ ساتھ وجد میں کائنات ہے
مری قسمت میں یہ دلچسپ منظر شاید ہی نکلا | گرے جتنے مرے آنسو ستارہ بن کے ہی نکلے
وہیں تو زمانے کی بیگانگی کا نام ہوا | جہاں جہاں مرے جذبات کام کر نہ سکے

مری زندگی سلامت مجھے لاکھ غم ملیں گے
کوئی انقلاب ادھر کا کوئی انقلاب ادھر کا

جیسے بیزار ہو گیا ہے کوئی | آنکھ چپ چپ نظر اداس اداس

فرصتِ عمر کم ہوا ہے الم! — جیسے سامنے ہوں وقتِ شام دراز
پردے کی ہر شکن کہیں یہ دلنشیں نہ ہو — گہرے سے کچھ نشان نظر دیکھتا ہوں میں
زندگی جھوم اٹھی آپ جو حسرت گلدستے — لے گئے یاد دل سے کہ بے ساختہ بہک گئے

جو خوشی رہی تو خوشی رہی جو ملال ہے تو ملال ہو
مجھے اور کوئی آرزو ہے نہ احسن خیال ہو

منزلوں پر منزلیں ختم ہی رہیں گی راہیں — قافلوں پر قافلے وقتِ سفر ہو رہے ہیں
جو بیٹھے تھے جلیں سب ساحلوں پر — غرق کر دو انھیں کناروں پر

نقاب اٹھانے کی اتنی ضد ہی خودی کی توہین کر رہی ہیں
خودی کی توہین کر رہی ہیں نگاہِ بے خود نظر کی باتیں

یہ تیرے سامنے محو دشمن قرار کی بات — سنا رہا ہوں میں منزل کو رہ گذار کی بات

اب ان کی جنبشِ لب بے گمان کچھ اور ہوتا ہے
گئے وہ دن کہ دل کی دھڑکنیں تھیں [illegible]

اے نگاہِ جاناں دل کی ہنسی اڑا دیں — خورشید کی کرن سے شبنم کو گدگدائیں

سید انتظار رضا اکبر آبادی

[illegible] اکبر آبادی کے نام سے مشہور ہیں [illegible] والد سید وقار حسین [illegible] مرحوم اکبر آباد [illegible] تھے۔ اکبر آباد جس کی زمین نے میر، غالب اور سیماب جیسے [illegible] سادات کے مشہور [illegible] میں پیدا ہوئے [illegible] مالی مجبوریوں کی بنا پر [illegible] ترک کرنا پڑا [illegible] شاعری کا شوق [illegible] دوست [illegible] انھوں نے [illegible] سلیم جعفری کی رہنمائی [illegible]

میں نے اپنی ابتدائی تعلیم اردو اور فارسی سے مکمل کی۔ مشاہیر شعرا کے دواوین و کلام کا مطالعہ کیا۔ میرے انداز اور اسلوب بیان پر سیماب، اصغر اور جگر کا رنگ غالب ہے۔ اور یہی اساتذہ منزل شعر و سخن میں میرے لئے راہبر کا درجہ رکھتے ہیں۔ اپنی بے بضاعتی اور کم علمی کے باوجود میں نے تمام اصناف سخن میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ غزلیات کے علاوہ اب تک متعدد نظمیں، قصائد، سلام، قطعات اور رباعیات کہی ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

میری بساط اور کہاں تیری بندگی   بس اتنا جانتا ہوں کہ گردن جھکی رہی
ہے اوج منزل عرفاں نماز عاشقی اپنی   خدائی کی حدوں سے جا ملی ہے بندگی اپنی
کتنا سکوں فضا ہے مرا اضطراب دل   جب درد کم ہوا ہے تو چلا اٹھا ہوں میں
نیند آگئی ہے درد جو حد سے گذر گیا   دنیا سمجھ رہی ہے کہ بیمار مر گیا!
اب تو وہ اپنی زلف پریشاں سنوار لیں   شیرازۂ عناصر ہستی بکھر گیا!
چور ہو کے درد الفت میں مرا دل ہوا   اب یہ آئینہ جمال دوست کے قابل ہوا!
ان کو بھی ہوتا جاتا ہے سننے کا اشتیاق   ایسا نہ ہو کہ قصۂ غم بھول جائیں ہم !!!
سینہ پہ ہاتھ رکھ کے ذرا دیکھ لیجئے   اب درد پہ ہے ہستی دل کا گماں مجھے
سلجھا رہا ہوں عقدۂ دشواریٔ حیات   مرنا ہے اور موت کی فرصت کہاں مجھے
اب دیکھئے یہاں سے کدھر لے چلے جنوں   محشر تک آگیا ہوں تجھے ڈھونڈھتا ہوا
کیا پوچھتے ہو کیفیت درد محبت   لے جیئے دل کہ ہے تو آرام نہیں ہے
ہے کونسی منزل میں ہے دیوانۂ الفت   دھن جس کی تھی اب یاد وہی نام نہیں ہے
آراستہ ہے بزم خیالات ان دنوں   ہوتی ہے روز ان سے ملاقات ان دنوں

رک رک گئی ہیں قلب دو عالم کی دھڑکنیں
تھم تھم گئی ہے گردش دوراں ترے بغیر

اب چین دوراندیشی نظر آتا ہے دل   مسکراتا ہے اگر کوئی لرز جاتا ہے دل
ہم غم سے چور دیکھا کئے دل کا آئینہ   تم کاکل حیات سنوارے چلے گئے !
جن سے پائی ہے زندگی دل نے   موت بھی ہے انھیں لگا ہوں میں !
ہوگیا کامل شعور بندگی   میں نے اپنی ذات کو سجدہ کیا
برق بھی تھی گلستاں میں تبھی   ہم نے پھر دل سے دھواں اٹھا کیا

ناسق عبدالساتر خاں

آپ کے زبانی حکم کی تعمیل بذریعہ خط کر رہا ہوں اپنے حالات زندگی اور شجرۂ خاندان لکھنا اپنے منہ میاں مٹھو بننے کے مترادف ہوگا نیز ہر شخص کا ایک نظریہ ہوتا ہے۔ میں بھی ایک نظریہ اس سلسلے میں رکھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنے عالی خاندان ہونے پر زیادہ فخر کرنے سے پیشتر اپنی موجودہ حالت کو پیش نظر رکھے تو زیادہ بہتر ہے۔ میری نظروں سے اکثر و بیشتر ایسے تاریخی مضامین بھی گذرے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے اصحاب جو فی الحقیقت شاہی خاندان اور شاہی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر ان کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اب ان کے پاس جاہ و جلال دولت و حشمت نہیں بہت ایسے ہیں جنہوں نے اپنے افعال قبیحہ سے خود کو قعر مذلت میں گرادیا بہر نوع دولت ایک ایسی شے ہے جو ہر چیز پر غالب ہے۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ میں اپنا طویل شجرۂ خاندان وغیرہ لکھکر تضیع اوقات کروں مختصراً لکھ دینا کافی تصور کرتا ہوں۔ حالانکہ مجھے قطعی امید نہیں کہ میرے اس مختصر سے تعارف کو کوئی دلچسپی سے پڑھے گا اس لئے کہ یہ کوئی چاشنی لئے ہوئے نہیں

میرا نام عبدالساتر خاں۔ ہے۔ چونکہ تھوڑا بہت شاعری سے ذوق ہے تخلص ناسق ہے۔ میرے والد مرحوم و مغفور کا نام عبدالقادر خاں اور جد بزرگوار مرحوم کا اسم گرامی محمود خاں ہے۔ آبائی وطن قصبہ منڈاور ضلع بجنور رہا۔ مگر جد بزرگوار نے جو کہ انتہائی خود دار تھے اپنے بڑے بھائی عالم گیر خاں صاحب مرحوم سے کسی خانگی امور کے باعث اپنا تمام حق وراثت اپنے بھائی کے سپرد کرکے ترک وطن کیا۔ اور قصبہ شیرکوٹ ضلع بجنور میں سکونت اختیار کرلی۔

۱۹۱۸ء کو مقام ہلدوانی ضلع نینی تال (یو۔پی) عالم ارواح سے عالم اجسام میں آیا سن پیدائش سے لیکر ۱۹۲۶ء تک جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہونے کے باعث مجھے کسی اسکول وغیرہ میں داخل نہیں کرایا گیا البتہ ابتدائی تعلیم اردو فارسی وغیرہ

والد مرحوم نے دسی ۱۹۲۹ء میں بریلی بی بی ایم ای اسکول میں درجۂ چہارم میں داخل کرا دیا گیا۔ ابھی مشکل سے چھ مہینے ہی ہوئے تھے کہ والد کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ سال ختم کر کے مجبوراً بریلی کو خیرباد کہا۔ اور دھام پور کے ایک اسکول میں داخل ہوا۔ حالات نامساعد ہونے پر بلند وانی کے ایک ہائی اسکول میں داخل ہوا۔ کہ اچانک ۱۹۳۲ء اوائل میں نمونیہ کا حملہ ہوا اور مسلسل ۱۹۳۳ء تک بیمار رہا۔ اسکول سے مسلسل علالت کے باعث بڑے بھائی نے نام خارج کرا دیا تین وجوہ کے ماتحت بالآخر تعلیم ترک کرنی پڑی اول اقتصادی حالت انتہائی نازک دوسرے علالت تیسرے والد کے سایۂ عاطفت سے محرومی مگر قدرت کو جاہل مطلق رکھنا بھی منظور نہ تھا۔ اپنے ایک عزیز ترین عزیز کے مشورہ سے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۹۳۹ء میں ادیب کا امتحان دیکر کامیاب ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں میٹرک پاس کیا۔ یہ ہے میری تعلیمی قابلیت۔

میں شروع ہی سے یعنی اردو فارسی وغیرہ سمجھ لینے کے بعد سے اکثر مختلف ادبی ماہنامے پڑھا کرتا تھا اور غزلیں جو مجھے مرغوب ہوتیں از بر کر لیتا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں تعلیم ترک کر دینے کے بعد بھی اکثر باہر سہ دری میں رہتا اور رسائل وغیرہ دیکھتا رہتا۔ دسمبر ۱۹۳۸ء میں جبکہ میں ادیب کے امتحان کی تیاری قبلہ مولانا عبدالقیوم صاحب ارشق سے کر رہا تھا۔ میرے ماموں فیروز جنگ خان صاحب تقریباً ڈیڑھ ماہ کی رخصت پر مکان تشریف لائے وہ ہر سال گیارہویں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس دفعہ بھی انھوں نے اعلیٰ پیمانے پر انتظام کیا مجھ سے کہنے لگے کہ اس مرتبہ میں تمہارے لئے بالکل نئی کتاب لایا ہوں جس میں بہت اچھی نعتیں ہیں۔ وہ تمہیں پڑھنی ہوں گی۔ اس وقت اتفاقاً میری زبان سے یہ نکل گیا کہ اس مرتبہ میں خود اپنی لکھی ہوئی منقبت پڑھوں گا۔ میری زبان سے یہ سن کر ماموں جان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور مجھے بھی اپنے الفاظ کی پاسداری کرنی پڑی۔ چنانچہ ماموں جان کی ایک دی ہوئی نعتیہ نظم کا ایک مصرعہ بیکر محی الدین جیلانی میرے محبوب سبحانی ترنم سے پڑھتا رہا۔ اور تکبندی کرتا رہا۔ تین دن کے بعد میں نے ایک چوبیس شعر کا نعتیہ قصیدہ غوث پاک کی شان میں جن میں سے اکثر شعر عروض سے قطعی بے بہرہ تھے گڑھ کر اپنے استاد گرامی مولانا عبدالقیوم صاحب ارشق کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کئے۔ انھوں نے از راہ ہمدردی و عنایت اس کی اصلاح کی۔ اور کچھ شعر خود بھی لکھ دیئے

اور میری ہمت افزائی کی اور کہا کہ تمہارے اندر شاعری کا مادہ موجود ہے۔ اگر تم اس طرف توجہ دو تو خاصہ لکھنے لگو گے۔ اس طرح میں نے یہ قصیدہ لکھ کر گیارھویں کے موقع پر بزم سے پڑھا جو بہت پسند کیا گیا۔ پیچھے صاحب اب تو میں تمام گھر میں شیطان کی طرح شاعر مشہور ہو گیا مولانا ارشق زبردستی مشاعروں میں لیجانے لگے۔ اور میں بتدریج ترقی کرتا رہا۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ غزل چھوڑ کر نظمیں لکھا کرو ان کے مشورے سے میں نے نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ اس وقت مسلم لیگ اور کانگریس کا زبردست ہنگامہ تھا۔ میں نے مسلم لیگ کی حمایت میں ایک نظم بعنوان کانگریسی مسلمانوں کے نام ماہ صیام کا پیام "رمضان المبارک" میں مولانا مظہرالدین صاحب مرحوم ایڈیٹر و مالک اخبار الامان و "وحدت" دہلی تشریف لائے ہوئے تھے۔ انھوں نے نظم بہت پسند کی اور الامان میں شائع کی اس کے بعد تین چار اور نظمیں شائع کر کے میری ہمت افزائی فرمائی۔

مجھے حضرت مولانا سیماب سے تلمذ ہے میرے اولین استاد مولانا عبدالقیوم صاحب ارشق شہر کوٹی مجھے اکثر میری نظم پر اصلاح کرتے وقت یہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے افکار دنیا سے نجات نہیں ملتی۔ میں نے اب اصلاح دینی قطعی بند کر دی ہے بہتر ہے کہ تم کسی مشہور شاعر سے اصلاح لیا کرو۔ میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ دل میں خیال کرتا کہ بھلا مجھ ایسے کو کون سا مشہور شاعر ہے جو زمرۂ تلامذہ میں داخل کر لیگا۔ آخر میں نے علامہ سیماب صاحب کو ایک خط لکھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یکم ستمبر ۱۹۴۳ء کو ایک یا دو نظمیں بعنوان "اعتراف" اور "میرا دل" روانہ کیں۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب کہ میں نے اپنی نظم اصلاح شدہ اور ایک خط حضرت موصوف سے وصول پایا۔

قصر الادب آگرہ ۳ ستمبر ۱۹۴۳ء

محبی السلام علیکم

خط ملا میں بے انتہا مصروف رہتا ہوں۔ اور فہرست تلامذہ میں کسی اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن آپ کا کلام دیکھ کر اور یہ معلوم کر کے کہ اس میں زندگی و ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں مجبوراً آپ کا نام فہرست تلامذہ میں لکھوا دیا ہے۔ خدا کرے آپ کے ادبی ذوق کی تکمیل میرے ذریعہ ہو جائے۔ لیکن اس کا انحصار آپ کی استعداد اور توجہ پر ہے۔

چونکہ میرے ذمہ بے شمار تلامذہ کی تربیت و اصلاح ہے اس لئے میں بیک وقت صرف

ایک ہی غزل یا نظم پر اصلاح دے سکتا ہوں۔ بنابریں ایک نظم برائے اصلاح مرسل ہے۔

دعا گو

سیماب

اسی خط کے ہمراہ مجھے ایک کتاب دستور الاصلاح[1] بھی ملی۔ جو میرے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئی میں زود گو نہیں کم گو ہوں۔ ذریعۂ معاش ملازمت سرکار ہے۔ اس کے علاوہ اور دیگر پابندیاں سر پر ہیں اس لیے سکون حاصل نہیں۔ جب کبھی سکون میسر ہوتا ہے لکھ لیتا ہوں نظم "اعتراف" ملاحظہ فرمائیے۔

اعتراف

دماغ و قلب کی تفریق ہے اک لفظ بے معنی
وجود ان کا سمجھ لینا جدا ہے وہم لایعنی

انہیں کا اتحاد انسان کو انساں بناتا ہے
عناصر بن کے روح بزم ہستی میں سماتا ہے

غلط ہے یہ محبت صرف دل میں ہوتی ہے پیدا
دماغ اوّل اثر لیتا ہے اس کی سحر کاری کا

محبت اُف محبت نام کس شے کا محبت ہے
کہ یہ اک جزو ہیں جس کے بھری اتنی جلالت ہے

دماغ و ذہن کا ردعمل اور ان کا ٹکرانا !
محبت ان کی ترکیب مکمل سے ہوئی پیدا

ہوئی ردعمل سے نکلی ہیجان تصادم سے
یہیں جذبات وقتی اپنے قابو کو ہی کیا پاسکے

فرد ہر وقت ہو سکتا ہے ہنگامی پر اک جذبہ
اسی کے ساتھ مٹ سکتا ہے یہ جذبہ محبت کا

تو پھر اے تشنۂ الفت کروں میں کس طرح وعدہ
ہمیشہ سلسلہ قائم رکھوں گا تجھ سے الفت کا

کیا اس بات کا جاتا ہے وعدہ جس کے کرنے پہ
ہو پیدا قدرت کامل کسی انسان کے اندر

نہ میرا اس پہ قابو ہے نہ دائم جذبۂ الفت
کروں کیوں ایسے وعدے ہو متغص میری تری راحت

میں کج خلقی کا الزام اپنے سر پہ لے نہیں سکتا !
تجھے وعدہ تو دے سکتا ہوں دھوکا دے نہیں سکتا

---

[1] علامہ سیماب کی فن اصلاح پر مبسوط کتاب

ناصر — مبشر علی دہلوی

تاریخ پیدائش ۵ جولائی سنہ ۱۹۱۵ء میرا وطن دہلی ہے چند شعر پیش کرتا ہوں۔

لب جاں بخش کے تصور میں — کیا لبوں پر بھی جان رہتی ہے
سرمایۂ حیات محبت کی یادگار — اک درد کی خلش تھی سو وہ بھی نہیں رہی

قفس میں ہوں خدا جانے چمن والوں پہ کیا گذری
کہ آوازیں بھی آنی بند ہیں اب تو عنادل کی

ناز — ناز سونی پتی

تاریخ پیدائش ۳ اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء ایم اے جعفری نام سونی پت وطن

کیا ہوا حشر میں آتے ہوئے لرزاں کیوں ہو — وہ تو دستور زمانہ تھا پشیماں کیوں ہو

ناظر — نظام الدین عمروی

سن پیدائش سنہ ۱۹۳۳ء میرا نام نظام الدین تخلص ناظر ہے۔

ذرّے زمیں کے اصل میں ناظر نہیں بنے
میرا کسی نے شیشۂ دل چور کر دیا !

نثار ☆ اصغر علی قریشی

میرا نام اصغر علی، اور تخلص نثار ہے۔ ۴ جون ۱۹۱۲ء کو بمقام لاہور پیدا ہوا۔ خاندان قریش میں سے ہوں۔ والد کا نام خان صاحب شبیر علی ہے جن کا شمار لاہور کی مقتدر اور ممتاز شخصیتوں میں ہوتا ہے میرے دادا حکیم محمد خان عطار عربی و فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول شیرانوالہ دروازہ لاہور میں پائی میٹرک پاس کرنے کے بعد دیال سنگھ کالج لاہور میں داخلہ لیا ۱۹۳۳ء میں بی۔ اے کر لینے کے بعد ریلوے کے محکمہ میں ملازمت اختیار کر لی آج تک وہیں کام کر رہا ہوں شاعری کا شوق زمانہ طالب علمی سے ہے۔ کالج کی فضا میں ذوقِ شعری نے اور جلا پائی اور میں نے کثرت سے شعر کہے کالج کی ادبی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا۔ طلباء اور اساتذہ نے میرے کلام کو بنظرِ استحسان دیکھا اسی زمانہ میں کالج کے مشاعرہ میں اول آیا اور انعام حاصل کیا۔

طبیعت اگرچہ شعر موزوں کرنے پر قادر تھی۔ لیکن مشاعروں میں شرکت کرنے پر جھجک محسوس ہوتی تھی اور کسی استادِ فن کی تلاش تھی آخر وجدانِ سلیم کی بنا پر علامہ سیماب اکبر آبادی کے سامنے زانوئے ادب طے کرنے کا فیصلہ کیا ۱۹۳۵ء میں ان کی خدمت میں آگرہ حاضر ہوا۔ اور حضرت مولانا نے بکمال خوشنودی حلقۂ تلامذہ میں داخل کر لیا ایک ہی سال میں فاضل استاد کی رہنمائی میں اس حد تک ترقی کی کہ جب ۱۹۳۶ء میں میں حضرت مضطر گجراتی کے ہمراہ آگرہ گیا۔ اور علامہ مرحوم کی خدمت میں پہنچا تو میری ایک غزل سماعت فرمانے کے بعد خوش ہو کر انھوں نے اپنے دیوان "سدرۃ المنتہیٰ" کی ایک جلد عنایت فرمائی۔

فاضل استاد کی توجہ نے ایک سال کے عرصہ میں مجھے کیا سے کیا بنا دیا۔ اس کا اندازہ کس کو ہو سکتا ہے۔ عام شعراء کی طرح میں نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے نہیں کی بلکہ نظم و غزل دونوں کو بیک وقت اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔ میں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ نظم، غزل، سانیٹ، نعت، رباعی، قطعہ سب ہی کچھ کہا ہے۔ واردات وجذبات میرے

کلام کے خاص جذبہ ہیں نظموں میں جمالیاتی پہلو کو مدنظر رکھتا ہوں لطیف اور مترنم الفاظ شگفتہ مضامین اور دلپذیر ترکیبیں میرے نزدیک جدید شاعری کے اعضائے رئیسہ ہیں سے ہیں میرا کلام ملک کے مشہور جرائد اور رسائل میں نکلتا رہتا ہے۔ میری نظمیں اور غزلیں ریڈیو سے براڈکاسٹ بھی ہوتی ہیں۔

نمونۂ کلام پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمایئے

برہم تمام عمر رہی کائنات دل — ہم ضبط آرزو کا اثر دیکھتے رہے
آئی بہاراں کے تبسم کے ساتھ ساتھ — کانٹوں کو بھی وہ پھول بنا کر چلے گئے
زندگی موت کا پیغام سہی — آپ جینے کی آرزو تو کریں
جی رہا ہوں تری خوشی کے لئے — ورنہ مرنا تو کوئی بات نہیں

پھولوں کے کس لئے ہیں گریبان چاک چاک
آخر یہ کس کو دیکھ کے دیوانے ہو گئے

جب سے عطا ہوا ہے مذاق جنوں مجھے — ہنسنے کا مل گیا ہے بہانہ کبھی کبھی
ان کی نظر سے اس لئے ہم نہ ملا سکے نظر — جلوۂ حسن بیکراں دامن عشق مختصر
عجیب چیز ہے ارتکاب جرم وفا — تمام عمر پشیمانیاں نہیں جاتیں!
سمجھ رہے ہیں خزاں کو بہار دیوانے — نثار عشق کی نادانیاں نہیں جاتیں
کوئی تو بات ہم میں تھی صیاد — دیکھ وہ رونق قفس نہ رہی
قفس سے سوئے چمن آ رہے ہیں دیوانے — فضا بقدر جنوں سازگار ہے کہ نہیں!
وہ آ رہے ہیں سحر کی لطافتیں لے کر — کوئی خراب شب انتظار ہے کہ نہیں

وہاں برسوں رہیں گے سر بسجدہ میکدے والے
جہاں مستی میں رکھ دی ہے جبین آرزو میں نے

پہلے رکھی میرے لئے یہ برتری میرے لئے
اور کبھی میرے لئے کچھ اور کبھی میرے لئے

مجھ پہ ہنسنے کے لئے کچھ کم نہ تھے زخم جگر!
تو نے ہونٹوں کو یونہی تکلیف دی میرے لئے

محفل رنگیں چراغ میکدہ ساقی سبو
ہائے وہ دن جب جواں ہر چیز تھی میرے لئے

بیت گئی یوں شامِ جوانی — آنکھ سے جیسے آنسو ڈھلکے
اونچی نیچی عشق کی راہیں! — دیوانے ہر گام سنبھل کے
دل کی نبضیں ڈوب نہ جائیں — ساز کو چھیڑو ہلکے ہلکے!
خندہ زن ہے شمعِ محبت — پروانے خاموش ہیں جل کے

سانیٹ

اجنبی جھیل کے کنارے پر
چند لمحے گذارنے کے لئے
حسنِ فطرت نکھارنے کے لئے
بادۂ نو بہار سے مخمور!
رنگ و بو کے حجاب میں مستور
جس جگہ وحشتیں برستی تھیں!
پتیاں رنگ کو ترستی تھیں!!
چند گل پوش گلفشاں چہرے
اس کنارے پر آ کے بیٹھ گئے
اب وہ خطہ بھی ہے حسین و جمیل
ارضِ جنت میں ہو گیا تبدیل
حسن نے جس جگہ قیام کیا
زندگی کو عطا دوام کیا
پھر نظر ڈال اے سخن پرور

رباعی

دن رات کے قافلے چلے جاتے ہیں!
سائے غم و حسرت کے ڈھلے جاتے ہیں
مٹتے ہی نہیں حسرت ایام کے داغ
بجھ بجھ کے یہ فانوس جلے جاتے ہیں

نجمہ تصدق ایم اے بی ٹی

میں جولائی ۱۹۱۷ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئی۔ لیکن لاہور کی ادب پرور فضا میں پرورش پائی۔ میری مختصر سی زندگی کے حالات کسی قدر اندوہناک ہیں۔ اور ان کا ہمہ گیر اثر آج تک میرے دل و دماغ پر باقی ہے۔ اور شاید ہمیشہ رہے۔ میں ان حالات و واقعات کو لکھنا مناسب نہیں سمجھتی البتہ مختصراً یہ کہہ دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ جب میرے عزیز ترین رشتہ داروں نے میرا رجحان شاعری کی طرف دیکھا تو ان میں سے اکثر نے والدین کو سلسلۂ تعلیم منقطع کر دینے کی رائے دی۔ لیکن وہ تو خدا بھلا کرے میرے برادر محترم کا جنہوں نے رشتہ داروں کی طعن و تشنیع سے بے نیاز ہو کر میری تعلیم کو ادھورا چھوڑنا پسند نہ کیا اور لبا اوقات میری حوصلہ افزائی فرماتے رہے چنانچہ جب میں تحصیل علم سے فارغ ہونے کے فوراً بعد ہی محکمۂ تعلیم کی خدمات بجا لانے پر مامور ہوئی تو دبی ہوئی چنگاری شعلے بن کر بھڑک اٹھیں میں نے زیادہ تر غزلیات کہی ہیں۔ تھوڑی سی رباعیات اور گیت بھی لکھے ہیں باقی رہا میری شاعری کا مطمح نظر تو وہ خود آپ میرے کلام سے اندازہ لگا سکتے ہیں

تری یادگاروں میں آنے لگی ہوں
محبت کو رنگیں بنانے لگی ہوں!

ستاروں کی دنیا پہ چھانے لگی ہوں
تری یاد میں گیت گانے لگی ہوں

کسی کی نگاہوں سے مدہوش ہو کر
محبت کا کچھ بھید پانے لگی ہوں

یونہی دفتر جرم دھل جائے شاید
ندامت کے آنسو بہانے لگی ہوں

وہ نغمہ جوانی کا مخمور نغمہ
وہ نغمہ کسی کو سنانے لگی ہوں

بڑھے گا یونہی ربط و ضبط اے نجمہ
تصور میں ان کو بلانے لگی ہوں

مرے دل سے صبر و سکوں جا رہے ہیں
یہ کون آ رہا ہے یہ وہ آ رہے ہیں

یہاں وقت ہے آخری ہچکیوں کا!
تکلف عبث آپ فرما رہے ہیں

کلی دل کی بجتہ کھل جا رہی ہے!
وہ ہنستے ہیں یا پھول برسا رہے ہیں!

ان نگاہوں سے جو پی کر وجد میں آتی ہوں میں
کیف و رنگ و نور کی دنیا پہ چھا جاتی ہوں میں
دل کے ویرانے سے اٹھتے ہیں بگولے صبح تک
جب ترا ذکر حسیں تاروں سے فرماتی ہوں میں
ساغر و مے کی نہیں مجھ کو ضرورت ساقیا
تیری آنکھوں ہی سے مستانہ بنی جاتی ہوں میں

وہ مست مست رات وہ بادہ بدست رات
اس مست مست رات کی قیمت نہ پوچھئے
عالم تمام آنسوؤں کا ایک سیل تھا
مجھ سے فسانۂ شب فرقت نہ پوچھئے
ہوتی ہے دل میں ایک خلش بیقرار سی
اللہ اس نظر کی شرارت نہ پوچھئے

تاروں کی مست چھاؤں میں اب بھی کبھی کبھی
کرتی ہوں یاد بھولی ہوئی داستاں کو میں
ہر ہر قدم پہ میری جبیں سجدہ ریز ہے
کعبہ سمجھ رہی ہوں ترے آستاں کو میں

یہ ارتعاش، یہ لغزش، یہ بیخودی پرور — سبو کدے کی فضائیں سلام کہتی ہیں
خیال دوست پہ چپکے سے اپنے کہہ دینا — تمہیں کسی کی وفائیں سلام کہتی ہیں

تو سراپا ناز و جلوہ میں سراپا سوز و ساز
موجزن جذبات میں طوفان سا پاتی ہوں میں

جو صدف ہے صدف ہیں گل تو ادرشان ہو بہار کی
امیر کارواں ہے ساتھ کارواں لئے ہوئے
ہے ودیعت مجھ کو تخیل فکر شعر! — کیوں نہ اک رنگِ سخن پیدا کروں

احمد ندیم قاسمی

۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو کوہستان نمک (شمالی مغربی پنجاب) کے ایک پہاڑی گاؤں انگہ میں پیدا ہوا۔ میرا خاندان اپنے زہد و ورع اور امارت و بزرگی کے باعث علاقہ بھر میں عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اس لئے بچپن ہی سے اضداد کی چکی میں پسنا پڑا اندرون خانہ افلاس اور بیرون خانہ جلال و طنطنہ۔ اس عجیب و غریب زندگی نے وقت سے پہلے حساس بنا دیا۔ اور یہی شدید احساس میری شاعری کی بنیاد بنا۔ ۱۹۳۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ چند سالوں تک سرکاری ملازمت کی مگر ماحول کی محکومیت پسندی اور فرائض کی ریاکارانہ بجا آوری سے تنگ آ کر ۱۹۴۲ء میں مستعفی ہو کر لاہور آ گیا۔ مئی ۱۹۴۲ء تک دارالاشاعت پنجاب میں تہذیب نسواں اور پھول کا ایڈیٹر رہا۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں "ادب لطیف" کا ایڈیٹر مقرر ہوا۔ اور جنوری ۱۹۴۶ء تک اسے مرتب کرتا رہا۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں ضعف جگر اور ضعف معدہ کے باعث صاحب فراش ہوا۔ اور ایک عرصہ تک مصیبت اٹھاتا رہا۔

افسانے، قطعات، منظومات اور غزلیات کے بیشتر مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

للکار

خورشید کی شعاعوں میں اک لرزش خفی
کہتی ہے سبیل نور ہمارے جلو میں ہے

شبنم پہ کہہ کے صحن گلستاں سے اڑ گئی
میں کیسے منتشر سکوں کہ ہر اک چیز رو میں ہے

بھڑکے تو کائنات کے گوشے چمک اٹھیں
وہ خواب جو چراغ حقیقت کی ضو میں ہے

وجدان کی اذان میں اب تک نہ ڈھل سکی
وہ نابش حیات جو اک مشت جو میں ہے

ظلمت میں شادیانے بجاتے ہوئے چلو
جب شب کی مانگ بھرنے کا سامان لو میں ہے

سینے میں اک تڑپ ہو تو مر لینے میں اک وقار
انسان کا عروج اسی جستجو میں ہے!

غزل

دستِ گلچیں میں کھل رہی ہے کلی! — میرے جینے سے اس کی موت بھلی
ابتلا، ابتدائے ذوقِ عمل — یعنی طوفان اٹھا تو ناؤ چلی
ابھی ابھی ہے داستانِ حیات — گرچہ عنوان ہے بلا کا جلی
صبح نزدیک چیتا اشکوں کی ا — رات کے ساتھ ہی وہ بات ٹلی
شاخِ امید کی بہار نہ پوچھ — برسوں پھولی مگر کبھی نہ پھلی
چشمِ سرشار میں حیا چھلکی — ساغرِ مے میں ہے قمر کی ڈلی
گردشِ چشم ہے کہ گردشِ دہر — پلکیں جھکنے لگیں کہ دھوپ ڈھلی
کائنات ایک دشت بے انجام — اب کہاں ڈھونڈیے کسی کی گلی!

عشق میں آگہی کا رنگ ندیم
سرو کی شاخ پہ سمن کی کلی

اگرچہ آج وہ اگلا سا التفات نہیں
میں شکوہ سنج نہیں تو خدا کی ذات نہیں

مرے عظیم سخن کے آئینے دیکھیں
جو کہہ رہے ہیں ترے حسن کو ثبات نہیں

وہ نغمہ گر نہیں صرف ایک مرثیہ خواں ہو
کہ جس کے چنگ میں آہنگ کائنات نہیں

مرا چراغ ہے میرا غرور خود نگری!!
فقط خدا کی پرستش رہِ نجات نہیں

بس ایک گل کو دیکھ کے تخلیقِ گل کی سوچتا ہوں
شگوفے کو دیکھتے رہنا تو کوئی بات نہیں

یہ راستے تو مرے ہاتھ کی لکیریں ہیں

جو تو رفیقِ سفر ہو تو رات رات نہیں

نذر — فیروز شاہ مراد آبادی

میری سن پیدائش ۱۹۲۲ء ہے عرصے سے شعر کہتا ہوں ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

وہ بھی کیا دل جو تیری الفت میں
وقف ہر امتحاں نہ ہو جائے

نسیم — نسیم الدین پانی پتی

نسیم الدین نام پانی پت وطن تلمیذ احسن پانی پتی دو شعر ملاحظہ فرمائیے۔

طبقۂ نسواں سے پھر فرما کے اٹھا ہے نقاب
سب یہاں اپنے ہی اپنے ہیں یہ پاکستان ہے

کہیں ظاہر نہ ہو جائے جہاں میں سوزش ہجراں
ترے عاشق پہ جل جل کر مرا دل تل نہ جل جائے

نظر — حامد اختر حمید آبادی

نام حامد اختر ۱۹۱۹ء میں ضلع بیڑ دکن میں پیدا ہوا پنجاب یونیورسٹی سے علوم مشرقیہ کے کچھ امتحانات پاس کئے بارہ تیرہ سال کی عمر سے شعر کہہ رہا ہوں سنہ ۱۹۴۷ء میں ترک وطن کر کے

نام سے قومی لفظوں کا ایک مختصر سا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

کسی گلشن میں بجز سرو رواں بن کے رہو

دلوں سے مٹ گیا میرے ساتھ ہی ہر شورش ۔۔۔ نہ تمناؤں کی ہلچل نہ محبت کا خروش
نہ مچل جانے کے ارماں نہ سنبھلنے کا جنون ۔۔۔ نہ سبو میں غم فردا نہ سر و بغم دوش

کیا خبر تھی کہ یہ عنوان تمنائے حیات ۔۔۔ موت بن جائے اسباب تمنا ہو گی
بیٹھیں سر پہ سنبھلتے جو سہارا تو گئی ۔۔۔ زندگی کوچہ و بازار میں رسوا ہو گی

دل وحشی کے بہلنے کے عجب ساماں تھے ۔۔۔ کبھی بازاروں میں رسوا کبھی بیابانوں میں
بہر تسکین و فاقہ لے کے بستی میں ۔۔۔ کتنے پیمانے چھلک جاتے تھے میخانوں میں

غم نے کیوں آج نئی دھن نیا سا چھیڑ دیا ۔۔۔ ساز ہستی تو مرا تشنۂ مضراب نہ تھا
کتنی معصوم ہوا محو ہوئی جاتی ہو ۔۔۔ میرے نغموں میں کوئی شعلہ تو بیتاب نہ تھا

کسی طوفان کی آمد ہے خدا خیر کرے ۔۔۔ رات کیوں مل گئیں محفل میں نگاہیں اپنی
مجھ پہ اس طرح نہ چھا جاؤ تمہیں کیا معلوم ۔۔۔ کتنی تاریک ہیں پرپیچ ہیں راہیں اپنی

صبح رخسار پہ چھائی ہے شب [illegible] ۔۔۔ وعدے خلوت کے آزردۂ افکار ہیں
چشم مخمور سے ساغر نہ چھلک جائیں کہیں ۔۔۔ رس بھرے ہونٹ دعاؤں سے گراں بار نہ ہوں

گل نو خیز کو آلام خزاں سے کیا کام ۔۔۔ یونہی ہاں یونہی چٹکتے رہیں عارض کے گلاب
محفل ناز میں [illegible] کہتے ہی رہیں یونہی :: ۔۔۔ قوس رنگین شفق نور جمال مہتاب

غزل

جستجو کی [illegible] ہیں ۔۔۔ قافلے امیدوں کے کھو گئے ہیں راہوں میں
[illegible] ۔۔۔ گیسوئے [illegible]
ظلمت شب [illegible] ۔۔۔ چاندنی [illegible]
[illegible] ۔۔۔ اس نے کتنے افسانے کہہ دیئے نگاہوں میں
[illegible] ۔۔۔ تیرے ماہ و انجم ہیں رات کی پناہوں میں
[illegible] ۔۔۔ تیرے غم سا اپنے آپ آ گیا ہوں میں
کیا [illegible] ۔۔۔ ہم تو اس کو ڈھونڈا کیے تیرگی کی راہوں میں

نظر
خواجہ عبدالقیوم بٹ

گمنام کشمیری میرا آبائی وطن اور لاہور پیدائشی مقام ہے۔ مارچ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوا۔ بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ پنجاب اور صوبہ سرحد کے مختلف مقامات میں رہا لیکن ایک زمانے سے لاہور ہی میں مقیم ہوں۔ ابتدائی تعلیم پنجاب کے مختلف اسکولوں میں حاصل کی۔ میٹرک کرنے کے بعد مشن کالج لاہور میں سائنس پڑھنے والے طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوا۔ ابھی پورا ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ والد نے انتقال فرمایا۔ اور مجھے ناسازگار حالات کی بنا پر کالج چھوڑ کر ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ دو ڈھائی سال تک میں پرائیویٹ فرموں اور سرکاری دفتروں میں کام کرتا رہا لیکن جلد ہی مجھے مزید تکمیل تعلیم کی غرض سے دیال سنگھ کالج لاہور میں داخلہ لینا پڑا۔ ادبیات سے مجھے شروع سے دلچسپی تھی۔ نظم کے مطالعہ میں مجھے نثر سے زیادہ لطف آتا تھا۔ آہستہ آہستہ میری شاعری کا آغاز ہو گیا۔ میرے ذوق کو دیکھ کر بعض احباب نے علامہ تاجور نجیب آبادی مرحوم سابق پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور سے رجوع ہونے کا مشورہ دیا چنانچہ ایک دن میں نے ایک غزل انہیں تصحیح کرنے کے لئے دی۔ چند دنوں کے بعد جب میں نے ان سے اس کی بابت پوچھا تو انہوں نے اپنی روایتی سنجیدگی کے ساتھ اپنے پاس غزل کی موجودگی سے انکار کر دیا۔ جب میں نے انہیں زیادہ تفصیل کے ساتھ بتایا کہ میں نے انہیں وہ غزل کب اور کہاں دی تھی۔ اور اس میں ردیف و قافیہ کیا تھا۔ تو بڑا متعجب ہو کر کہنے لگے اچھا وہ غزل تمہاری تھی میں سمجھا تھا کہ کسی اور کے اشعار میری جیب میں کیسے آگئے۔ اور جب میں نے اس نظریے کی وجہ پوچھی تو فرمانے لگے [illegible] کسی نام کے [illegible] ہو سکتے ہیں۔ دیال سنگھ کالج [illegible] کسی طالب علم کا [illegible] نام [illegible] دوں تخلص تجویز فرمانے کی درخواست کی تو [illegible] ہوں [illegible] کیونکہ [illegible] لیکن میں نے

مولانا تاجور ہی کو مجبور کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ چنانچہ میرے زیادہ اصرار کرنے پر ایک لمبی سانس کے بعد کہنے لگے "قیوم نظر" بہتر رہے گا۔ کالج کی بزم علم و ادب کا سکریٹری تو میں پہلے ہی تھا اب انھوں نے مجھے کالج میگزین کے حصہ اردو کا ایڈیٹر بھی بنا دیا۔ اور یہ سب واقعات چند مہینوں میں ظہور پذیر ہوئے شمس العلماء تاجور نجیب آبادی مرحوم نے مجھے خواجہ عبدالقیوم بٹ سے قیوم نظر تو بنا دیا لیکن ان کی مصروفیات اس قدر تھیں کہ انھیں فرصت کم ملتی چنانچہ جب کبھی میں نے کوئی چیز انھیں اصلاح کی غرض سے دی۔ تو انھوں نے اسے اپنی جیب میں ایسا ڈالا کہ ہمیشہ کے لئے وہ چیز گم ہو گئی۔ انھوں نے کبھی میری کسی غزل یا نظم پر اصلاح نہیں دی۔

میں نے اپنے خیالات کا اظہار نظم سے زیادہ غزل میں کیا ہے۔ لیکن نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں مناظر قدرت میرے لئے کافی دلچسپی کا سامان رکھتے ہیں۔ سیر و شکار کا دلدادہ ہوں چنانچہ اپنے اس شوق کی تکمیل کے سلسلہ میں ہند و پاک کے بیشتر حصوں کو دیکھ چکا ہوں۔

نظم میں ہیئت کی تبدیلی مجھے بہت مرغوب رہی ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ ہر نظم کا موضوع اپنی ضرورت کے مطابق خود بخود کوئی نہ کوئی مناسب ہیئت تلاش کر لیتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ میری بیشتر نظمیں اس لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ اگرچہ میں نے طویل نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن نظم میں اختصار کی طرف زیادہ مائل ہوں۔

میرے کلام کا ایک مجموعہ "قندیل" معرضِ وجود میں آ چکا ہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق لاہور کی ادبی مجالس میرے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتی رہتی ہیں۔

غزل

بسکہ نیچی ہم آسکا عشق میں دل دیا ہوا
حاصلِ زیست ہو گیا نام ترا لیا ہوا

حدِ جنوں سے ہوں پرے اور کہاں کہ رہ سکے
خندۂ نو بہار ہے چاک جگر سیا ہوا

عشق کی آرزو وفا حسن کی آرزو جفا
میرا کیا تو کیا ہوا آپ نے جو کیا ہوا

نیم ہے کرم سے گو التفاتِ جہان مدعا
کم نہ مگر ہوا ترا ذوقِ ستم دیا ہوا

کیوں نہ ہو اگر نہ یہ دی تو مجھے جو سرخوشی
دے سکے سکون زندگی ہے یہ جنوں لیا ہوا

چارہ گرِ حیات نے دوستی نہ کبھی دی تو کیا
شوقِ طلب میں بار بار زہر بہ کفا پیا ہوا !!

یہ پھول

ہر طرف بکھرے ہوئے تارے، یہ پھول
تیرگی کے بل پہ رقصاں جگمگاتے قہقہے
حسن کی رعنائیوں میں گم خوشی کے چہچہے

ماہ سے بڑھ کر یہ مہ پارے یہ پھول
ان میں لہراتی ہوئی خوشبو کی شیرینی بھی ہے
آرزو کی سادگی گلشن کی رنگینی بھی ہے

دور افق تک پھیلے نظارے، یہ پھول
اس بلندی پر مگر اتنے قریب آئے ہوئے
آسماں کی رفعتوں کو خاک پر لائے ہوئے

جھلملاتی رات کے پیارے یہ پھول
ان کی جلتی محفلوں میں اک عجب بیچارگی
خوردہ زیب آشفتگی بے اختیار آوارگی

سرگراں، سہمے، تھکے ہارے یہ پھول!
جانے کیا کیا روپ دھارے مسکراتی شام نے
سیم و زر کی دلکشی نے گردشِ ایام نے

دم بخود ہیں درد کے مارے یہ پھول
انکی دنیا میں دل آویزی کی دولت اب کہاں
منظرِ عالم پہ پھر ہنسنے کی جرأت اب کہاں

اب کہاں ہیں جگمگانے والے یہ پھول
زندگی کی راہ سے ہٹ کر جو خود ا لئے
دل کے ویرانے میں کھو جانے کو ہیں ننھے دیے

نظامی

سیّد علی نظامی

میں اپنی زندگی میں کوئی خاص بات نہیں پاتا۔ اس لئے چند موٹی موٹی باتوں پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ مجھے صحیح یاد نہیں کہ میں کس سال معرضِ وجود میں آیا۔ لیکن میں اپنی جائے پیدائش کے متعلق تھوڑا بہت علم ضرور رکھتا ہوں یعنی کہ مالوہ انڈیا میں پیدا ہوا۔

تقریباً ۱۳-۱۴ سال سے مشقِ سخن جاری ہے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں شاعرتاج علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم سے چند غزلوں پر اصلاح لی۔

علامہ سیمابؔ کے طرزِ اصلاح سے میں بہت متاثر ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کی یادمیں آنکھیں نم ہوجاتی ہیں۔

نظم، غزل اور تاریخی قطعات زیادہ کہتا ہوں۔ پاکستان بننے کے بعد فوجی ملازمت اختیار کرلی۔ اور اب میں ایک فوجی سپاہی ہوں۔

متفرق اشعار

بروقت یاد آہی گئے تجربات تلخ! کچھ کہتے کہتے رک ہی گئے رازداں سے ہم

غور سے دیکھ میری نظروں میں پہلوئے حسن التماس بھی ہے
وائے برگشتگی مقدر کی! آرزو سرگران یاس بھی ہے

کھل گئی مجھ پہ وجہ ناکامی میں یہاں تک تو کامیاب ہوا

ہمارا منزل پہ جاپہونچنا نہیں ہے دشوار کوئی ایسا
مگر مصیبت یہ آپڑی ہے کہ راہ بر راہ پر نہیں ہے

تمہاری بے رخی نے جس کو افسانہ بنا ڈالا
حیاتِ عشق کی وہ ساعتیں ہیں یادگار اب تک

زبانِ عصرِ حاضر پر وہ بالاعلان جاری ہیں
جو راز افشا کئے جاتے رہے بالائے دار اب تک

اک نگاہِ لطف سے ٹوٹا ہوا دل جوڑ دو ستم کو درمانِ شکستِ خاطری مشکل نہیں
ہے مری افسردگی افسردہ سازِ انجمن میری ہنسی سازگارِ گرمیٔ محفل نہیں

مسرت جب سے رو کٹھی غم کو سینے سے لگایا ہے
مگر اب غم بھی راس آئے نہ آئے کس نے دیکھا ہے

وفورِ جوشِ طوفاں ہیں تو ساحل کی تمنا تھی، سرِ ساحل مگر اب ڈوب جانے کی تمنا ہے

یہ عقیدت کا توازن دیکھنے کی چیز ہے ہیں نگہبانِ حدودِ کعبہ و بتخانہ ہم
میانِ کعبہ و بتخانہ دیواریں کھڑی کر دیں میں شیخ و برہمن کی ناروا داری پہ روتا ہوں
نظامی مجکو اربابِ جنوں سے اک عقیدت ہے بانہہ ہوش دیوانوں کی ہشیاری پہ روتا ہوں
کیا کوئی بھولی جفائے ناسزا یاد آ گئی کیا سبب کیوں خود بخود نظریں پشیماں ہو گئیں
کیا شکستِ سازِ محفل کا نہیں دیکھا مآل سازِ دل پر آرزوئیں کیوں غزل خواں ہو گئیں

یاد آئیں کب نظامی کو خلش کی لذتیں
جب خلش کی لذتیں بھی نذرِ درماں ہو گئیں

نعمی

ابوالحسن نقوی

آج سے اکیس سال پہلے سیتاپور (یو۔پی) میں ڈاکٹر ادریس کے گھر پیدا ہوا۔ والد صاحب ایلوپیتھک کے ڈاکٹر ہیں۔ آبا ؤ اجداد ایران کے سرحدی علاقے ماژندران کے شہر آمل سے ہندوستان آئے تھے۔

اسی سال بی۔ اے کا امتحان دے رہا ہوں تعلیم ابھی نامکمل ہے۔

میری عادتیں کچھ مختلف ہیں پان سگریٹ چائے اور شراب سے کوئی لگاؤ نہیں ہے عام ادیبوں والی باتیں مجھ میں نہیں پائی جاتیں۔ ہوش و حواس میں رہتا ہوں مشرقیت پر جان دیتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ولائتی زبان۔ ولائتی لباس ولائتی معاشرت اور ولائتی محبت مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی بشعر کم کہتا ہوں نثر زیادہ لکھتا ہوں۔ افسانہ نگار وں میں

سعادت حسن منٹو، ناول نگاروں میں عزیز احمد، نقادوں میں آل احمد سرور، شاعروں میں اثر لکھنوی، گانے والوں میں لتا، مصوروں میں چغتائی، سوانح نگاروں میں رئیس احمد جعفری اور لیڈروں میں ایوب کھوڑو کو بہت پسند کرتا ہوں، پتہ نہیں آپ میری ان باتوں کو پسند کریں گے یا نہیں۔

انتخاب کلام

مرد مومن اپنی ہستی کو نہ بھول — تو ہے یزداں کی نظر کا انتخاب
وہ جو اب گمنام ہوتی ہو — اس خیالت کا حال مت پوچھو
مدعا ان سے جب اپنا کہتے کہتے رہ گیا — جیسے کوئی شعر موزوں ہوتے ہوتے رہ گیا
اضطراری کیفیت بڑھ کر نہ چھپائے راز عشق — اف یہ کس کا نام لب تک آتے آتے رہ گیا
وہ نیز ماننیں بکتی سی گفتگو ان کی — چھپائی لاکھ محبت مگر چھپا نہ سکے!!

قطعہ

کارواں ان کا نظر آتا ہے اب دور تو یوں — صبح سرما میں نظر آتا ہے کہرا جیسے!
وقت رخصت تری معصوم سی صورت لگتی — ڈوبتے چاند کا اترا ہوا چہرا جیسے!

نقوی
سید محمد حامد شاہ

نقوی سید محمد حامد شاہ کی پیدائش ۱۹[illegible] میں اپنے ننھیال بمقام [illegible] میں ہوئی۔ شعر گوئی کی [illegible] کا [illegible] نہیں؟ [illegible] رنگ کچھ جداگانہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے

بروز قیامت مددگار ہو گی — وہ ہیں شافع مذنبین مدینہ
الٰہی تمنا ہے حامد یہی ہے
دکھا جلد خلد بریں مدینہ

نور

نور محمد قصوری

میرے مختصر حالاتِ زندگی یہ ہیں کہ میں نے پنجاب کے شہر قصور میں پرورش پائی۔ اس خاک کو موسیٰ عبدالقادر جیسی قابل ہستیاں پیدا کرنے کا فخر حاصل ہے۔ میں گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک فرسٹ ڈویژن سے کیا۔ میری نظم کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔

سونی ہے کائنات غزل خواں نہیں رہے وہ گلشن میکش عرفاں نہیں رہے
وہ نغمہ زارِ حق وہ خیاباں نہیں رہے اب دہر میں نبی کے ثنا خواں نہیں رہے
دیکھی ہے ہم نے لٹتی یہاں امتِ رسول
جس طرح کربلا میں جگر گوشۂ بتول

نسیم

سید اسمٰعیل حسین اکبر آبادی

میری پیدائش ۱۸۹۲ء ہے
تعلیم و تربیت آگرہ میں ضرورتِ زمانہ کے لحاظ سے ہوئی مگر باپ کا سایہ عین عنفوانِ شباب میں سر سے اٹھ گیا اور یوں تکمیل تعلیم سے محروم ہونا پڑا
شاعری کی طرف طبیعت ابتدا سے مائل تھی۔ اس لئے کہ تمام ماحول شاعرانہ تھا باپ ماموں، ماں، نانا غرض خاندان کا خاندان شاعر ہر وقت یہی تذکرے اور یہی چرچے تھے۔ اگر یہ کہوں کہ شاعری ورانتاً مجھ تک پہونچی۔ تو غالباً غلط نہ ہوگا! میرا ایک مقطع ابتدائی دور کا ہے کہ

ذہن سے نالے بھی موزوں نکلتے ہیں نسیم کہ شعر گوئی ازل سے ہے میری فطرت میں

مشاعروں میں کثرت سے شرکت کرنے کا اتفاق ہوا لیکن اشاعت کلام سے اس لئے گریز کرتا۔ آپ خود بخش نام و نمود نہ تھی چنانچہ ایک مقطع میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے

شعر کہتا ہوں میں اپنا دل بہلنے کے لیے!
ہے تمنا داد کی نیرؔ نہ خواہش نام کی

نانوتہ آباد ایک چھوٹا سا قصبہ دہلی کے قریب ہے جہاں گیارہ سال بسلسلہ ملازمت قیام رہا اور اس زمانے میں وہاں تو ادبی ماحول خلاف امید پیدا ہو گیا۔ اور جیسے عظیم الشان مشاعرے منعقد کر دئے۔ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اور جناب نوح ناروی افسر میرٹھی ندرت میرٹھی بیخود دہلوی وغیرہ کے دلوں سے ان مشاعروں کی یاد اب تک محو نہ ہوئی ہوگی۔

اس کے بعد ایک سال کلکتہ میں گذرا جہاں آنند مرحوم کا بھی اس وقت قیام تھا اور ان کی ہمراہی میں وہاں شریک مشاعرہ ہوتا رہا۔ ایک شعر وہاں کے دوران قیام میں بصیر مشاعرہ پڑھا تھا۔

آج بنگال کی تاریک فضا میں یہ غزل
دوسری قسط ہے نیرؔ مرے افسانے کی

لیکن مجھے کبھی یہ گمان بھی نہ ہوا کہ مجھ میں اسقدر اہلیت ہے کہ میں کسی کی پیروی کرسکوں اب رہا میری شاعری کے محاسن و معائب کا سوال اس کو میں ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔ میرے تعلقات یوں تو موجودہ دور کے تمام شعرا سے رہے۔ اور تقریباً سب مجھے جانتے پہچانتے ہیں۔ لیکن حضرت جگر مرادآبادی سے خصوصیت رہی ہے۔ اور مرحوم علامہ سیماب اکبرآبادی سے علاوہ ہم وطنی کے بڑی قربت تھی۔ خدا جنت نصیب کرے

نمونہ کلام

توجہ میری ناکامی پہ اے صورت گر عالم طاقت ہے مگر اظہار حسرت کر نہیں سکتے
رہبر و ان عشق منزل اسے کہتے ہیں کسے

دل جہاں ٹھہرا اسی کا نام منزل ہو گیا
وہ چمن کے زمزمے نیرؔ چمن کے ساتھ تھے
اب قفس سے سانس کا لینا بھی مشکل ہو گیا

کھلی نہ آنکھ جوانی میں آہ کیا کیجے — مزے کا وقت تھا نیز جو صرف خواب ہوا
یہ انقلاب پسندی بھی جزو فطرت تھی — قفس کا ہو کے رہیں نہ آشیانے کا

نہ رہتی امتیازِ قید و آزادی کی یہ کاوش
اگر احساس مٹ جاتا قفس بھی آشیاں ہوتا

صحرا کی وسعتوں میں بھی بہلا نہ میرا جی — اب میں کیا کہوں کہ پریشان گھر میں تھا
سنا رہے ہیں فسانہ وہ یوں جوانی کا — ہمارا جیسے کبھی عالم شباب نہ تھا
کانٹوں سے پوچھ عشق کے ذوقِ سلیم کو — جو چبھ گیا اسی کو رگ جاں بنا لیا

ڈر تھا یہی کہ ہو نہ جائے ضبط جنوں میں منتقل
خیر ہوئی کہ آپ نے ہنس کے مجھے رلا دیا!

میرے دلِ مردہ کی بھی زندوں میں ہو گنتی — کیا چیز ہے تیر خلش خار محبت
گلشنِ جنت کجا دنیائے خار و خس کجا — میں کہاں آیا ہوں دیکھو کہاں ہونے کے بعد
لاؤں کہاں سے صحبتِ دیرینہ کیا کروں — گزرے ہوئے زمانہ کی تصویر بھی نہیں
موت کی راہ دیکھتا ہوں میں — اب تمہارا بھی انتظار نہیں
لبوں پہ مہرِ خموشی نظر میں رازِ حیات — زباں سے کہہ نہیں سکتا جو دیکھتا ہوں میں
پسینہ پھولوں کو بیرِ چمن میں آتا ہے — نگاہ کیا کہہ کے کانٹوں کو دیکھتا ہوں میں
جنوں ہیں کچھ نہ سمجھیں ہم مگر اتنا سمجھتے ہیں — خدا مجھ کو اور اپنے آپ کو بندہ سمجھتے ہیں
نہ گھبرا شدتِ درد و الم سے عشق میں اے دل — وہ اس کو آزماتے ہیں جسے اپنا سمجھتے ہیں
قطعِ حیات کے لئے خنجر ہے ہر نفس — جینا فراقِ دوست میں کوئی ہنسی نہیں

جناب یوسف تھے پاک دامن ۔ یا مگر ہو کے چاک دامن
سنی ہے جس دن سے ہو کہانی ہیں، اپنا دامن بچا رہا ہوں

مرے گناہوں پہ کر لئے ہو تبصرہ لیکن! — مجھے بتا دو کہ تم تو گناہ گار نہیں
کیا کیا اٹھائے ہیں خلش خار کے مزے — بیرِ خزاں کو پھول بنا جا رہا ہوں
دیا ہوا ہے غم ان کا چھپائے جاتے ہیں — مگر یہ آنکھوں سے آنسو جو آئے جاتے ہیں

مطلب ہے ہوئے رشک کی دنیا خرید لوں
بھیجوں تمہارے پاس اگر نامہ بر کو میں

دنیا کے التفات نے گم کر دیا مجھے ! گھر سے نکل کے بھول گیا اپنے گھر کو میں
آنکھوں میں آ کے دل کا لہو ہے رکا ہوا روئے کوئی غریب اگر تم خفا نہ ہو
عاشق کی بھی ہستی ہے دنیا میں عجب ہستی زندہ ہے تو رسوا ہے مر جائے تو افسانہ
مری آنکھوں میں آنسو آ گئے تم درگزر کر دو
قسم لے لو کہ میں واقف نہ تھا آداب محفل سے

امید و بیم میں تیرا ابھی اک جنگ برپا ہے
مری کشتی پلٹ آتی ہے ٹکرا کے ساحل سے

ہمارے عشق پہ تھی دیدنی تحیر حسن نقاب رخ سے اٹھایا تو پھر گرا نہ سکے
کیا کہوں کیونکر ہوا کرتی ہے میری صبح و شام آ گئے وہ تو سحر ہے وہ گئے تو شام ہے
دل سے گرم و سرد کا احساس جب جاتا رہا زندگی یہ ہے تو پھر موت کس کا نام ہے

قفس میں رہ کے بھی مجھ کو ذرا بھی خواب چمن سے فرصت
بھلا چکا تھا میں جب گلوں کو تو یاد کانٹوں کی آ رہی تھی

وہ بھی مجھے خواب میں آنے کا وعدہ بھی درست شک مگر ہم کو شب غم نیند کے آنے میں ہے
ہے اپنی جان سبھی کو عزیز دنیا میں کہوں میں کس سے کہ جینا ہے ناگوار مجھے
گزر رہا ہوں محبت کی ایسی منزل سے جہاں نہیں ہے خود اپنا بھی اعتبار مجھے
خوشی کی قدر کرے کیا خوشی کو کیا جانے وہ بدنصیب جو محروم لذت غم ہے
کروں گا شیب میں انجام عشق پہ بھی نظر ابھی شباب ہے فرصت مجھے بہت کم ہے
جنوں پابند ہوتا ہے سلامت ہے وسعت صحرا چلے زنداں کو ہم سے خاک اب چھانی نہیں جاتی
پردے میں دوسروں کی آنکھ ہو تو ہو لیکن انسان اپنی آنکھوں سے چھپ کر کہاں رہے
پرساں کوئی تو ہوتا رونے کا یوں مرا آپ جب اپنے اشک پونچھے خود اپنی آستیں سے

خوشی جنوں کی عشق میں خودداریاں بھی ہیں
بیٹھا ہوں گھر میں گھر کو بیاباں کیے ہوئے

طے ہو سکیں نہ جب کہ محبت کی منزلیں گھبرا کے میں نے راہ جنوں اختیار کی

تیری ہی شان ہے بھی ہے اے رحمت تمام
تجھ سے بھی روٹھ جاتا ہے بندہ کبھی کبھی

نیازی

بیگم نیازی

آپ کا اصرار ہے کہ اپنے حالات زندگی لکھوں حیران ہوں کہ میرے حالات ہیں ہی کیا لکھوں تو کیا لکھوں ۹ مئی ۱۹۲۶ء میں پشاور میں پیدا ہوئی میرے والد پروفیسر عبدالرحیم نیازی ماہر فلسفہ پشاور کی مشہور ہستیوں میں سے ہیں۔ پشاور ہی میں اپنے چچا کے لڑکے سے شادی ہوئی جو پی۔ اے۔ اوسی میں ممبر ہیں اور شعر و شاعری کی دنیا سے دور گولہ بارود کا شغل فرماتے ہیں۔ اس پہ بھی انکا یہ اصرار ہے کہ وہ شاعر نہیں شعر فہم ضرور ہیں۔ خیر

میری تعلیم کونونٹ میں ہوئی شعر فارسی میں کہتی ہوں۔ ویسے انگریزی اردو پشتو اور پنجابی وغیرہ زبانیں بھی بخوبی جانتی ہوں۔ ابھی تک کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا۔ گو میرے شوہر میجر عبدالقدوس نیازی کا فرمانا ہے کہ بے استاد کے لوگ ترقی نہیں کر سکتے۔ آجکل ابوالاثر حفیظ جالندھری ہڑوس میں آگئے ہیں۔ ممکن ہے اب کچھ ترقی کر سکوں۔ لیجئے صاحب یہ ہیں میرے حالات زندگی۔

نمونۂ کلام اور تصویر بھی حاضر خدمت ہے۔

بکوئے میکدہ دیدم یکے قلندرِ مست — دلق آلودہ تہی کیسہ صراحی در دست
بکفِ خویش نگاہ کرد و بخندید و بگفت — چہ خوش انجام بود آں کہ شود چوں من مست

خسروِ تخت نشیں خلعتِ رنگیں دارم — رخشِ براق سما تاج پر نگیں دارم
خوشم کہ دلق خود آلودۂ مے می بینم — خوشم کہ کاکلِ پُر خاک بر جبیں دارم

ارمان کہ من بے سر و ساماں میروم — خونیں جگر و پارہ گریباں میروم
اے باغباں ز باغِ تو در موسم بہار — من دامنِ تہی سوئے جاناں میروم

ما حلقۂ رنداں سوئے کوثر شتافتیم — دیں خشک جہاں را بہ مے صوفی گذاشتیم
از روزِ ازل بادے و ساغر کہ کار بود
آں عادتِ دیرینۂ خود تازہ داشتیم

نیّر محمد یعقوب جہلمی

میں پنجاب کے قطب شاہی اعوان کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرا وطن ضلع جہلم ہے لیکن اب موضع کھبی ضلع گجرات میرا مسکن ہے۔ مجھے اپنی تاریخ پیدائش معلوم نہیں البتہ والدہ محترمہ کے بیان کے مطابق سنہ ۱۹۲۰ء میں حج اور بقرعید کی درمیانی شب کو اپنے ننھیال میں رونق افروز ہوا۔ آپ تعجب نہ کریں میری تعلیم گھر سے مسجد تک ہے۔ ویسے گورنمنٹ کالج کوئٹہ کی کئی شکل دیکھی ہے یہ اور بات ہے کہ اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں ضلع انبالہ کے ایک مشہور سید خاندان کے شاعر حضرت سید صغیر حسین شاہ صاحب اصغر سڈھاروی قبلہ کی دختر نیک اختر کے ساتھ شادی ہوئی۔ اور اب دو جیتی جاگتی بچیوں کا باپ ہوں شکل و صورت کے معاملے میں خودستائی کیا کروں تصویر دیکھ لیجیے غالباً بری نہیں۔ غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ "نرگس" کے نام سے مرتب کر چکا ہوں۔ لیکن ابھی پریس تک جانے کی نوبت نہیں آسکی۔

ایسے میں نے اپنا صحیح تعارف تو کرایا ہی نہیں۔ صاحب میرا پورا نام محمد یعقوب ہے اور نیّر تخلص کرتا ہوں چونکہ علامہ سیماب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوں اس لیے سیمابی ہوں

میں تقریباً ۵ سال کا تھا کہ پھوپھی نے گود لیا اور بڑے ناز و نعم سے پرورش کی کوئٹہ کے قیامت خیز زلزلہ کے بعد ہم لوگ راولپنڈی چلے گئے سنہ ۱۹۳۷ء میں پھوپھا کی پنشن ہو گئی اور ہمیں بھی اپنے گھر۔ عزیز رشتہ دار دوستوں کو خیرباد کہہ کر وطن واپس آنا پڑا۔ گھر میں اللہ کا فضل تھا۔ گھی دودھ کی افراط لہٰذا ہم بھی لنگوٹ کس کر اکھاڑے پہنچ گئے۔ دو سال تک ڈٹ کر پہلوانی کی ۲۹ ستمبر ۱۹۳۹ء کو شاہی ہندوستانی بحریہ میں بھرتی ہو کر بمبئی پہنچ گئے۔ شاعری کا بچپن سے شوق تھا۔ اور تخلص "دم چھلا" جو کبھی کبھار ساتھ رہنے لگا تھا کبھی پنجابی اور کبھی اردو میں تک بندی بھی کر لیا کرتے تھے بمبئی کی رومان پرور فضا نے میرے دبے ہوئے ذوق کو ابھارا انہیں دنوں جہلم کے مشہور شاعر حضرت شہید جہلمی

سے ملاقات ہوئی اور ہم پھر شاعر بننے کی کوشش کرنے لگے۔ ابتدائی کلام شہید صاحب کو دکھایا پھر مولانا قمر نعمانی اور آسی رڈکوی سے اصلاح لی۔ بالآخر ۱۹۴۵ء میں حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی کے دامنِ فیض سے وابستہ ہو گیا جولائی ۱۹۴۸ء میں بحریہ کو خیرباد کہہ کر۔ آر۔ پی۔ این۔ اے۔ ڈی۔ ملیر چھاؤنی میں آ گئے۔ اور جب تک اللہ کو منظور ہے۔ اس جنگل میں رہنے پر مجبور رہوں۔

نمونۂ کلام

قطعات

آغازِ بہاراں دیکھ چکے انجامِ بہاراں دیکھ چکے
ہر گردش کو لبیک کہا ہر گردشِ دوراں دیکھ چکے
ساحل پہ کھڑے ہو کیوں ہم کو طوفاں سے نہ خائف کر ہمدم
اس بحرِ حوادث میں رہ کر ہم لاکھوں طوفاں دیکھ چکے

اے مری مونس و ہمراز تجھے کیا معلوم
کس طرح عہدِ جدائی کو گزارا میں نے!
تیری بدمست نگاہوں کا سہارا لے کر
کر لیا زیست کی تلخی کو گوارا میں نے

متفرق اشعار

لبوں پہ مہرِ خموشی نظر میں افسانہ
تمہاری بزم میں آیا ہے ایک دیوانہ
نشاطِ دہر سے فرصت ملے تو آ جاؤ
چھلک رہا ہے مری زندگی کا پیمانہ
گزر رہا ہوں جہانِ فنا کی راہوں سے
نفس نفس ہیں لیے زندگی کا افسانہ

پھر مائلِ نشاط ہوا جا رہا ہے دل
جی چاہتا ہے چھیڑ کریں آسماں سے ہم
یہ سچ ہے ان کی یاد سے کچھ بھی نہ واسطہ
لیکن دل ایسا مانگ کے لائیں کہاں سے ہم
کیوں محتسب نہ کرے مدہوش میں رہ کر کوئی
کیا محبت میں یہ لازم ہے کہ دیوانہ بنے
جان دیں دوں گا میں ساقی کے قدم پر لیکن
شرط یہ ہے کہ مری خاک سے پیمانہ بنے

جس کو دنیا کے حوادث سے بچالا پا کتا ہیں ایک وہ آنسو سر محشر مرے کام آ گیا
انساں ہوں میں وسعت عظمت مری نہ پوچھ کونین پر ہوں سایۂ داماں کیے ہوئے

سوال یہ ہے کہ اب جاؤں میں کہاں اے دوست
زمانہ کھو کے ملا تیرا آستاں اے دوست

لباس لالہ و نسرین و ماہ و انجم میں مرے نقوش محبت کہاں کہاں نہ ملے
تمام عمر رہا وقف جستجو نیر
مگر متاع محبت کے قدرداں نہ ملے

ہمارے دم سے جہاں میں اب کبھی وفا کی جلوہ گری ملے گی
جہاں ترا نقش پا ملے گا جبیں ہماری جھکی ملے گی

غم جہاں سے فراغ ملتا تو ہم خدا سے یہ پوچھ لیتے
جہاں کے مالک ترے جہاں میں کبھی ہمیں بھی خوشی ملے گی

یہ ہے چاروں طرف موذ دضیا کیا کوئی ہے طور پہ جلوہ نما کیا
ازل سے تا ابد بس ہیں ہمیں ہم ہماری ابتدا کیا انتہا کیا

ہے سازش درمیان موج و کشتی
بچائیگا ہمیں اب ناخدا کیا!

کس کو تھا معلوم نیر کون ہے چاک دامانی سے شہرت ہو گئی

میں تبادہ فضا میں مڑ مڑ کے دیکھتا ہوں
شاید مجھے پکارے گذرا ہوا زمانہ

کنارے سے تماشا کیا ہوئے کیا دیکھتے اونچی لہروں کو
تقاضہ یہ ہماں جب غرقابی تھی۔ اندازہ طوفاں کیا کرتے

خود حسن کو آخر کر ہی دیا مجبور تجلی اے حسن میں
اے ذوق جنوں اس سے بڑھ کر ہم کار نمایاں کیا کرتے

شاید وہ ادھر سے گذرے ہیں شاید وہ ادھر سے گذریں گے

یہ بات ہے کیا رہ رہ کر دل پہلو سے نکلا جاتا ہے!

حسن خود دار کو بے پردہ تو دیتا جلوہ دونگا دامن دل میں کوئی طور بنا لوں پہلے

نیاز

نیاز شیرانی

میں شیرانی النسل افغان ہوں میرے بزرگ شہاب الدین غوری کے ہمرکاب نواح سلیمان سے بسلسلۂ فوجی ملازمت ہندوستان آئے تھے جن کو بصلۂ حسن خدمات نقیبانی جودھپور مارواڑ کے علاقہ میں مواضعات کھاٹو کلاں کھاٹو خورد ناگور شریف وغیرہ بطور جاگیر عطا فرمائے تھے۔ رفتار زمانہ کی بدولت اب چند ہزار بیگہ اراضی برائے نام باقی رہ گئی ہے۔ میں نے ابتدائی تعلیم یعنی عربی و فارسی و ہندی والد صاحب کے مدرسہ میں پائی اُردو انٹرنس کالج رتلام میں فارسی کی اول جماعت تک جو اس وقت دسویں جماعت کہلاتی ہے حاصل کی ہے۔

۲۹ اپریل ۱۹۱۸ء میں میری شادی منشی محمد اسمٰعیل خاں صاحب کا مدار محل نواب محمد علی خاں صاحب فرمانروائے ٹونک کی منجھلی صاحبزادی سے ہوئی جو پروفیسر حافظ محمود خاں صاحب لکچرار و فیلو پنجاب یونیورسٹی لاہور کی بہن اور اختر شیرانی مرحوم کی پھوپھی ہیں اسی زمانہ میں محکمہ پولیس رتلام میں اور آنریری مجسٹریٹ مہاراجہ صاحب المیٹہ پرگنہ رتلام کا سررشتہ دار رہا۔ اور چند ماہ تک مہاراجہ آلمہ متصل نرنگر مالوہ علاقہ گوالیار کے کنور صاحبان کا معلّم اُردو رہا۔

چونکہ دو تین سال پہلے سے میرے دو لڑکے اعجاز اقبال اور ایک لڑکی معہ اہل و عیال کے ٹونک سے پاکستان آگئے تھے میں ۷ ستمبر ۱۹۵۱ء کو ٹونک سے روانہ ہو کر ۲۰ ستمبر ۱۹۵۱ء کو بخیریت تمام کراچی شریف پہنچا اور خداوند کریم کا شکر ادا کیا۔ خداوند کریم نے مجھکو چار لڑکے اور دو لڑکیاں، پوتے پوتیاں وغیرہ جن کی مجموعی تعداد اس وقت بائیس ہے عطا فرمائے۔ اس سے زیادہ انسان کی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔ دولت اور اولاد سب ہی دیدی آپ تو آخری تمنا یہ ہے کہ خداوند کریم حج بیت اللہ شریف اور زیارت روضۂ اقدس رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف فرما کر دیار حرم میں خاتمہ بالخیر کر دے۔

شاعری کا مرض مجھے اوائل عمری میں رتلام میں پیدا ہوا اور ابتداء میں مخدومی صاحبزادہ مشرف یار خاں صاحب مشرق سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ کچھ نظمیں مولانا ظفر علی خاں نے بھی ملاحظہ فرما کر ۱۹۲۳ء میں اپنے روزنامہ زمیندار میں شائع فرمائیں اس کے بعد مولانا سیماب صاحب کی خدمت میں لکھ لکھ کر بھیجتا رہا۔ اخبار دبدبۂ سکندری رامپور عزیز ہند جھانسی ریاست دہلی وغیرہ میں بھی میرے مضامین و نظمیں شائع ہوتی رہی ہیں۔

کیوں نیازؔ لگے ہے گلرنگ پروانوں میں آگ — خود ہمیں سے تو لگی تھی اپنے بیگانوں میں آگ
غالباً اس راز سے واقف برہمن بھی نہیں — کس کے جلووں نے لگا رکھی ہے بت خانوں میں آگ
آ تو ایک دن یہ نتیجہ سامنے آنے کو ہے — شمع خود ہی جل مرے گی لگا کر پروانوں میں آگ
رنگ لائے گا کسی دن خون ناحق دیکھنا — خود بخود لگ جائے گی بھڑک اٹھے گی کاشانوں میں آگ

ان میں کسی کا دل ستو الجھا ہوا لگتا — وہ بار بار اپنے سلجھا رہے ہیں گیسو
خود ہی کبھی سنوارا خود ہی کبھی بکھیرا — کس کس ادا سے ہم کو دکھلا رہے ہیں گیسو
رنگین دوپٹہ ان کا زیب گلو ہوا ہے — اور دوش پر ہوا سے لہرا رہے ہیں گیسو
بہتر یہ ہے کہ ان سے دامن بچا کے رہنا — تم کو نیازؔ کیوں بہکا رہے ہیں گیسو

نیساں

سید علی عبا اکبر آبادی

اکبر آباد کے ایک متوسط گھرانے میں بمقام ماندی آباد ۵ جولائی ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوا
جو خوش قسمتی سے گھر میں ادبی ماحول پایا۔ میرے والد صاحب حضرت نیر اکبر آبادی مدظلہ
اور میرے عم محترم حضرت نظم آفندی جیسے خوش گو شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اور لازماً
ہوا ادبی طبائع میری شاعرانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں بڑی محرک ثابت ہوئیں۔ میرا
ذہنی پس منظر سراسر مشرقی تھا لیکن زمانے کی ہوا کو دیکھتے ہوئے مجھے مغربی انداز پر
تعلیم دلائی گئی جس کا خوش گوار نتیجہ یہ ہوا کہ میں بیک وقت مشرقی اور مغربی شعرا
اور ان کے کلام سے متعارف ہو گیا

میری شاعری کی ابتدا رباعی گوئی اور نظموں سے ہوئی جو ماحول کے تقاضے کا نتیجہ
تھیں۔ شروع شروع میں میں نے صرف نظمیں ہی کہیں۔ اس کے بعد میں نے مختلف اصناف
سخن میں طبع آزمائی کی لیکن مجھے جذبات کی ترجمانی کے لئے غزل سے بہتر اور کوئی صنف
سخن نظر نہ آئی میں شاعری میں تخیل سے زیادہ جذبات نگاری کو پسند کرتا ہوں۔ اور
یہی سبب ہے کہ جذبات و محاکات میرے کلام میں بہت ملیں گے مضمون آفرینی کم
انسانی نفسیات کو اگر کسی شعر میں سمو دیا جائے تو شعر میں ایک عجیب کیفیت
پیدا ہو جاتی ہے اور ایک تڑپ اٹھتی ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

بیتاب ہے دل جن کی خاطر میں جن کو ترستا رہتا ہوں!!
مجھ سے بھی چھپا کر میری طرف وہ نظریں دیکھا کرتی ہیں

شاعری میں ترقی پسندی کا قائل ہوں مگر اس حد تک نہیں کہ ہیئت اور معنی دونوں کی ہی توڑ
پھوڑ کر دیا جائے۔ میں ترنم کو بھی شاعری کے لئے بہتر سمجھتا ہوں۔

میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے۔ وہ تمام تر عروض کی پابندیوں کے ساتھ کہا ہے
بحیثیت شاعر میں نے آج تک کسی کی شاگردی نہیں اختیار کی اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ

میں خود اپنے تجربہ کی روشنی میں راہ ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔ البتہ کبھی کبھی اپنے والد صاحب مدظلہ کو اپنا کلام دکھا لیا کرتا ہوں میرا پیشہ یوں سمجھ لیجئے کہ میں ملازم ہوں جو میرے فطری رجحان سے مناسبت نہیں رکھتا۔ لیکن زمانہ کی ستم ظریفی کہ میں آج اپنی خواہش کے خلاف میدان عمل میں مصروف کار ہوں نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

خوشا یہ کیفیت تغافل نہیں یہ انداز حسن الفت
نظر اٹھائے ہوئے کبھی ہیں وہ نظر اٹھانا کبھی چاہتے ہیں

مرے نصیب نا سمانے دیا اس جگہ بھی دھوکا
کمی مجھے تلاش طوفاں مجھے ملی تہی کنارا

جو حسن منانے کے لیے عشق کو آیا
افسانہ بعنوان دگر دیکھ رہا ہوں

جب سے ان کی بدلی بدلی سی نظر پاتا ہوں میں
زندگی کو زندگی سے دور تر پاتا ہوں میں

جس دل میں تری یاد نہیں اس کو کیا کہوں
بیکار ہے چراغ اگر روشنی نہیں!!

کیا چیز پھونکے دیتی ہے قلب و جگر کو آج
اک آگ سی لگی ہے مگر آگ بھی نہیں!

زیست کی رعنائیاں بیکار جانے کی نہیں
زندگی اک نئی کروٹ اور فضا آجائے گی

مرے دکھ کو دکھ نہ سمجھا ہے غم کو غم نہ جانا
ہے [illegible] کا نام دنیا [illegible] زمانہ

ابھی کچھ گزار دئے زندگی کے دن
احساس زندگی تھا مگر زندگی نہ تھی

تیرے بن جو رہا ہے یہ محسوس!
اور [illegible] کچھ تو ہے حیات نہیں!

درد اٹھا ہے جب [illegible] کو
[illegible] نظر آرہے تو ہے

[illegible] ہونٹوں پہ [illegible] ہے
جب کوئی ذکر وفا کرتا ہے

مجھ سے پوچھو کہ زندگی کیا ہے
ایک مجبور [illegible] سا ہے!

جسے سب حسن کہتے ہیں [illegible]
[illegible] عشق [illegible] طبیعت پر

[illegible] جانئے کہ [illegible] کے باوجود!
کیوں دل میں ان کی یاد ہے کانٹا [illegible]

وحید

مرزا محمد ایوب چغتائی

مجھے نہیں معلوم لیکن میرے ابّا جان کہتے ہیں کہ ہمارے جدِ امجد حضرت میرزا محمد رزاق بیگ چغتائی مرحوم و مغفور تقریباً ڈھائی سو سال قبل کشمیر سے بہ غرضِ تجارت دلّی آئے۔ دلّی کے گلی کوچوں کی رونق کچھ ایسی بھائی کہ وہاں اقامت پذیر ہو گئے۔ میرے دادا محمد مرزا صاحب مرحوم ۱۸۵۷ء کے غدر میں تیرہ برس کے تھے۔ میرے والد قبلہ محمد یونس مرزا صاحب اب بھی مجھے غدر کے انگریزوں کے مظالم کی داستانیں سنایا کرتے ہیں جو انہوں نے دادا ابّا مرحوم سے سنی تھیں

میں ۸ دسمبر ۱۹۲۳ء کو صبح ۵ بجے لشکر گوالیار کے محلہ دانا اولی میں پیدا ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں وکٹوریہ کالجیٹ ہائی اسکول لشکر سے میٹرک کیا ارادہ تھا کہ کانپور کے ایگریکلچر کالج سے بی ایس سی ایگریکلچر کروں لیکن ابا جان کی پینشن ہو گئی اس لئے تعلیم کے لئے باہر نہ جا سکا۔ ۱۹۴۲ء میں وکٹوریہ کالج سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا زمانہ طالب علمی میں کالج کی اردو لٹریری سوسائٹی کا سکریٹری اور کالج میگزین کے شعبہ اردو کا مدیر رہا۔ ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔

تقریباً ایک سال تک بھوپال میں محکمہ غذا میں انسپکٹر رہا اس کے بعد کراچی آ گیا یکم ستمبر ۱۹۴۸ء سے ریڈیو پاکستان کراچی سے منسلک ہوں گذشتہ سال سندھ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا ہے۔ ادب موسیقی اور اداکاری سے مجھے بچپن سے لگاؤ رہا ہے۔ لیکن تقریباً ۱۹۴۰ یا ۱۹۴۱ء سے باقاعدہ کہنا شروع کیا افسانے بھی لکھے۔ دورانِ تعلیم میں ایک طرف پوری مستعدی سے ہاکی کھیلا اور دوسری طرف ڈراموں میں اہم کردار کئے اوّل اوّل گوالیار میں حضرت دعا ڈبائیوی سے مشورہ لیتا تھا پھر جاں نثار اختر صاحب کو کلام دکھایا اور اب اپنے وجدان کی رہبری میں فکرِ سخن میں مشغول ہوں۔

نمونہ کلام

ہاتھ میں آکر بھی چھن جاتے ہیں جام
بنتے بنتے بھی بگڑ جاتے ہیں کام

حسن ہے بنتے سنورنے کی امنگ
عشق ہے خاموش مٹ جانیکا نام

بے شغل ہی بہار کا موسم گزر گیا
دامن کی سمت دیکھ کے خاموش رہ گئے

وہ ان کی بات تھی کہ وہ غیروں سے جا ملے
یہ اپنا ظرف تھا کہ یہ صدمہ بھی سہہ گئے

یا وہ بھی عالم دل تھا کہ کچھ نہ پوچھ
گنتی کے پھول بار مرے گلشن میں رہ گئے

ہو گئے ہیں اس قدر مجبور اپنے دل سے ہم
وہ خفا بھی ہیں مگر اٹھتے نہیں محفل سے ہم

جانتے ہیں سعی لاحاصل ہے اُن کی جستجو
پھر بھی باز آتے نہیں ہیں سعی لاحاصل سے ہم

کانپتے چھلکے اٹھی سانس گھبرائی نظر
کہہ سکے دل کی تمنا تو بتا کس دل سے ہم

دل بسے وجد گوش پر آواز دہر ہے
ہر لمحہ آ رہی ہیں کسی انقلاب کی

اب بھی اشکوں میں جھلک اٹھتی ہے صورت ان کی
اب بھی دل پر کوئی بجلی سی گرا جاتا ہے

تلخیاں، شدتیں، ناکامیاں
زندگی اور وہ بھی میری زندگی

دل میں کسی کی یاد دل میں یوں کھلتا گلاب
روتے روتے جیسے آ جائے ہنسی

ان پر یقین کیا، کبھی خود پر یقیں کیا
میں نے سکون دل کا پتہ کیا نہیں کیا

اس غور و فکر میں نہ بنا آشیاں کبھی
شاید چمن میں اور کوئی شاخ تر ملے

ہر ایک بات محبت کی ہے پسند مگر
سنا ہے خون کے آنسو بہت رلاتی ہے

اکثر یہی سنا ہے وہی کچھ سنبھل گئے
جو تیری آرزو کی حدوں سے نکل گئے

اب تو ترے خیال سے کچھ جی الجھ چلا
اب تو تیرے فراق کے لمحے بھی ٹل گئے

دل شکستہ فریب خلوص کھا جانا
کسی نے کی ہی نہیں دل سے اس کی چارہ گری

یہ دامن ہے کم بخت اس کی نہ پوچھو
کبھی ہنستے ہنستے بھی نم ہو گیا ہے

بچا ہے صرف وفا اور کوئی عنوان چھپ بیٹھے
گر ایک تجھ پہ مرا اعتبار کم سا ہے

جیسے ہم اپنی تمنا کا رنگ دیتے ہیں
وہ ایک حسرت ناکردہ کی ضرورت ہے

تلاش حسن میں نکلے تھے چند دیوانے
اب اس کے بعد ہوا حشر کیا خدا جانے

یہ لوگ جو تیری باتوں پہ جان دیتے ہیں
خدا ہی جانے سمجھدار ہیں کہ دیوانے

راہ وفا میں راہ عمل میں
کس نے کس کا ساتھ دیا ہے

وحشت رضا علی کلکتوی

خود نوشت سوانح عمری اپنی جگہ پر ایک خاص اہمیت رکھتی ہے مگر جہاں تک اپنی ذات سے تعلق ہے میں ہمیشہ اپنے حالات قلمبند کرنے سے بچنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اوّل تو میری زندگی بے مصرف ہی گزری ہے اور مجھے بھی کہنا پڑا ہے کہ "ہم کیا کیا کیے"، لیکن ادارۂ پرچم مُصر ہے کہ سوانح عمری خود نوشت ہو۔ یہ ممکن تھا کہ اس بہانے سے کہ "ہمارا ابھی تو آخر زور چلتا ہے گریبان میں" اپنا تذکرہ پرچم کے شاعر نمبر کے لئے نہ بھیجتا لیکن اس یادگار شمارہ سے اپنے کو غائب رکھنا بھی اپنے نفس کو منظور نہ ہوا۔ چند سطریں لکھ کر پیش کرتا ہوں۔

میں ۱۸ر نومبر ۱۸۸۱ء شہر کلکتہ (مغربی بنگال) میں پیدا ہوا۔ میرے والد مرحوم مولوی شمشاد علی بھی بنگالہ کے رہنے والے تھے۔ دادا حکیم غالب علی مرحوم تھے جن کا وطن دہلی تھا۔ وہ دہلی چھوڑ کر بنگالہ آئے اور شہر ہگلی کو سکونت کے لئے پسند کیا۔

لڑکپن ہی میں والد کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا۔ تعلیم میری کچھ یونہی سی ہوئی اور ملازمت حاصل کرنے کی ضرورت جلد محسوس ہوئی چنانچہ امپیریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ کلکتہ میں (اب یہ دفتر دہلی میں ہے) ۱۹۰۳ء میں ملازم ہو گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے فارسی مکاتیب کا خلاصہ انگریزی میں لکھنے کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں جب گورنمنٹ اسلامیہ کالج قائم ہوا میں اردو کا لکچرار مقرر کیا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں پنشن مل گئی لیکن پھر ۱۹۴۱ء میں لیڈی برابورن کالج کلکتہ کا اردو پروفیسر مقرر ہوا اور سال بھر کے بعد اردو کی جگہ فارسی پڑھانے لگا۔ ۱۹۴۷ء میں اس ملازمت سے بھی سبکدوش ہو گیا۔ اسلامیہ کالج کی ملازمت کے زمانے میں خان بہادر کا خطاب مجھے تفویض ہوا تھا۔

لڑکپن ہی سے مجھے شعر و سخن سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہنے لگا۔ حضرت ابوالقاسم محمد شمس مغفور (خلف حضرت نساخ، شاگرد حضرت داغ دہلوی) سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ وہ میرے اردو اشعار پر اصلاح دیتے تھے۔ میں نے

سنہ ۱۹۱۱ء میں اپنا مجموعہ کلام "دیوان وحشت" شائع کیا جس کا اس وقت اطراف ہند میں چرچا ہوا اور مولانا حالی - علامہ شبلی - علامہ اقبال اور دیگر اکابر عصر نے اس کی تحسین میں حوصلہ افزا الفاظ تحریر فرمائے۔ اب چالیس برس کے بعد میرا دوسرا دیوان موسوم بہ "ترانۂ وحشت" زیر طبع ہے۔

میں سنہ ۱۹۵۰ء کے وسط میں وطن کو خیرباد کہکر مشرقی پاکستان میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ چلا آیا اور ڈھاکہ میں مقیم ہوں۔

تین غزلیں قارئین کی ضیافت طبع کے لئے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

: ۱ :

ہمارے آگے سے وہ جب کبھی گزرتے ہیں — ہم اپنے کھوئے ہوئے دل کو یاد کرتے ہیں
یہ کیا ہجوم تمنا ہے خیر ہو یا رب — ہم ان سے ڈرتے نہیں اپنے دل سے ڈرتے ہیں
تری نگہ کو نہیں بنتی ہے جواب دیے — لب خموش کچھ ایسا سوال کرتے ہیں
کہا ہے اس نے تو آئے کوئی میسر دل میں — طرح طرح کے خیالات کیوں گزرتے ہیں
دلیل پستی ہمت ہماری ظاہر ہے — شکایت ستم روزگار کرتے ہیں
دکھائیں کیوں نہ وہ انداز حسن بے خبر — کہ طرز عشق میں ہم اجتہاد کرتے ہیں

وہ ہنس کے کہتے تھے آج اپنے ملنے والوں سے
سنا ہے حضرت وحشت بھی ہم پہ مرتے ہیں

: ۲ :

دل کیا لگائیں گے سمن و یاسمن سے ہم — واقف ہیں خوب راز بہار چمن سے ہم
آیا ہے عیش جس پہ ہوں قربان ہزار عیش — لیکر چلے ہیں ساتھ تری انجمن سے ہم
ہو در رفقانہ شام غریبی کی تیرگی — خوش ہو رہے ہیں یاد نو صبح وطن سے ہم
سیر چمن کو نکلے تھے تفریح کے لیے — افسردہ ہو کے لوٹے ہیں سیر چمن سے ہم
حرف آئے گا ترے کرم دلنواز پر — مایوس جائیں گے جو تری انجمن سے ہم
جو قدر کی وطن نے وہ سب دل پہ ہیں نقش — کیا یادگار لیکے چلے ہیں وطن سے ہم
کیا رنگ انتقام خزاں کا ہو دیکھئے — ڈرنے لگے ہیں جوش بہار چمن سے ہم
طرز جدید میں ہے وہی شیوۂ قدیم — بھرتے ہیں جام نو کو شراب کہن سے ہم

کیا ہو سکے گا نازِ خود آرا حریفِ شوق　　بچھڑ جائیں تیری زلفِ شکن در شکن سے ہم

وحشتؔ وہ عہدِ شوق تجھے یاد ہے کہ جب
رہتے تھے مست لذتِ شعر و سخن سے ہم

(۳)

قفس میں عمر گزری نالہ و آہ و فغاں کرتے　　ہم آخر کس توقع پر خیالِ آشیاں کرتے
ہماری دوربینی ہے ہمارے امن کی دشمن　　نہ ہوتی فکرِ مستقبل تو عیشِ جاوداں کرتے
پتا ملتا نہیں جنسِ وفا کا اب زمانے میں　　کہیں سے ہاتھ اگر لگتی تو نذرِ دوستاں کرتے
حرم میں بھی جب اپنے ساتھ تھی قسمت کی محرومی　　تو ہم کس منہ سے آخر شکوۂ جورِ بتاں کرتے
کسی کے نازِ خودبیں نے نہ اس کی بھی اجازت دی　　کہ اپنے سر کو ہم وقفِ سجودِ آستاں کرتے
نہ تھی منظور ہم کو شمع کی تقلیدِ رسوائی　　کہ محفل میں بیانِ لذتِ سوزِ نہاں کرتے
ابھی ہیں خوبیں ناآزمودہ حسن و الفت کی　　جو تم کھنچتے تو ہم بھی جذبِ دل کا امتحاں کرتے
مزا آتا اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ　　کہیں سے ہم بیاں کرتے کہیں سے تم بیاں کرتے
ڈرا جاتا تھا اپنا دل کسی کے لطفِ پیہم سے　　بہاریں ہم نے دیکھی تھیں تو کیوں خوفِ خزاں کرتے
رہا ناگفتہ ہی افسانہ اپنے شوقِ بیحد کا　　بیاں جو ہو نہیں سکتا تھا اس کو کیا بیاں کرتے
نظر سے ہم نے دیکھے تھے بہت آثارِ بربادی　　چمن میں ایک گھر کیا تھا جو پامالِ خزاں کرتے
جو کہتے قصہ اپنے انتظارِ تاب فرسا کا　　تو ہم اُن کی فراموشی کو عنوانِ بیاں کرتے
نہ پروا کی ہماری کارواں نے جب تو پھر ہم بھی　　بچھڑ کر کارواں سے کیا تلاشِ کارواں کرتے
ہم اپنے دیدۂ مشتاق ہی سے کام لیتے ہیں　　حجاب آتا ہے ان آرزوؤں کا بیاں کرتے
نہیں بیٹھے مگر تجدیدِ غم کی کیا ضرورت تھی　　پس از بربادیٔ گلشن جو یادِ آشیاں کرتے
حرم کیا دیر کیا یکساں کشش تھی سارے عالم میں　　خدائی جمع ہوتی خودنمائی تم جہاں کرتے

کیا موقوف ہم نے قصۂ دردِ نہاں وحشتؔ
کہاں تک خامۂ حسرت رقم کو خونچکاں کرتے

وفا

عبدالرؤف

میرا نام عبدالرؤف ہے۔ پیدائش ریاست قرولی ہے۔ اس کے آگے سمجھ میں نہیں آتا اور کیا لکھوں — "زندگی مختصر فسانہ ہے"

لائی ہے کیا پیام کسی گلعذار کا ۔۔۔ مہکا ہوا دہن ہے نسیم بہار کا

مرا تذکرہ داستاں ہو نہ جائے ۔۔۔ محبت غم جاوداں ہو نہ جائے

داغہائے جگر کی کیفیت ۔۔۔ زخم خوردہ بہار کا عالم

وفا

محمد دلشاد خاں

محمد دلشاد خاں نام اور وفا تخلص کرتا ہوں ۱۹۳۱ء کی کسی ساعت میں آگرہ میں پیدا ہوا۔ لیکن وطن قصبہ آنولہ ضلع بریلی ہے۔

مجھے محروم نہ رکھ یا عشق رسوائی کہ ۔۔۔ سوا اپنے کسی غیر کا سائل نہ بنا

چشم کرم سے آپ نے کیا دور کر دیا ۔۔۔ پیمانہ حیات مرا چور کر دیا

کیوں الٹتا ہے عبث تو دور ماضی کے ورق

کام لے ذہن رسا سے حال و مستقبل بنا

ہادی مچھلی شہری

میرے والد مرحوم مولانا سید عبدالرزاق شاکر غالب مرحوم کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے چنانچہ اُن کے نام کے اکثر خطوط مکتوباتِ غالب کے مجلدات میں اب تک موجود ہیں۔ والد مرحوم عربی اور فارسی کے زبردست عالم تھے اس لئے انھوں نے اپنی اولاد کی تعلیم میں بھی کوئی کمی باقی نہیں چھوڑی۔ میں نے فارسی اور عربی کی صرف و نحو کی تعلیم اوّلاً مولانا حافظ احمد حسن مچھلی شہری مرحوم اور ثانیاً مولانا مظہر حسین مچھلی شہری مرحوم سے حاصل کی تھی۔ بالآخر بطور خود فارسی میں مہارت پیدا کی۔

میری شاعری کا مستقل دور سنہ ۱۹۱۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل بھی میں نے چند غزلیں لکھی تھیں جو جلیل القدر حضرت جلیل مرحوم کی اصلاح کے بعد ایک رسالہ میں جس کو وہ حیدرآباد سے اس زمانہ میں نکالتے تھے شائع ہوئی تھیں اس کے بعد جب سنہ ۱۹۱۱ء سے میں نے مستقل طور پر شعر کہنا شروع کیا تو کسی سے اصلاح نہیں لی۔ بلکہ اپنے فطری ذوقِ شعری سے مدد لے کر خود اپنے اشعار کی اصلاح کر لیتا تھا اگر صرف تین چار غزلوں پر اصلاح اور وہ بھی ایسے زمانہ میں جب دو تین ہی اتفاقیہ طور پر کہی گئی ہوں، کسی کا شاگرد ہونے کے لئے کافی ہے تو بیشک میں حضرت جلیل مرحوم کا شاگرد ہوں ورنہ کسی کا نہیں۔

آج کل شاعری کی تقسیم دو اسالیب یعنی جدید اور قدیم میں کی جاتی ہے۔ فی زمانہ عریاں نگاری اور غیر ذمہ دارانہ شاعری کا جو رنگ نظر آتا ہے اگر اس کو جدید شاعری کہا جائے تو دوسری بات ہے لیکن جہاں تک متین، مہذب اور صحیح شاعری کا تعلق ہے۔ شاعری کو جدید اور قدیم اصناف میں تقسیم کرنا میری رائے میں ایک اصولی غلطی ہے شاعری فقط وہ ہے جو جذباتِ مختلفہ انسانی اور مناظرِ فطرت کی مستقل اور گوناگوں کیفیات کی مناسب الفاظ میں صحیح ترجمانی کر سکے۔ یہ جذبات فطری حیثیت سے کم و بیش ہر انسان کے دل میں ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ انسانی فطرت ہر دور میں ان کے عکس سے منعکس ہوتی رہی اور شاعر ہر دور میں ان کی ترجمانی کر کے انھیں دنیا کے سامنے پیش کرتا رہا ہے۔ لہٰذا ان تاثرات

کے مابین کوئی 'جدید' یا 'قدیم' کی حدِ فاصل قائم نہیں کی جا سکتی۔ جن مظاہرات اور حسیات رقیقہ و دقیقۂ انسانی کی ترجمانی میر اور مومن نے کی تھی۔ انھیں کی ترجمانی غالب اور ان کے بعد کے شعرا سے بھی عمل میں آئی۔ اگر کچھ فرق تھا تو صرف موضوع اور اسلوب بیان کا جو کہ "جدید" اور "قدیم" ہو سکتا۔ داغ اور امیر کی شاعری ان اساتذہ کے کلام سے بالکل مختلف ہے۔ مگر یہ اختلاف صرف نوعیت کا ہے نہ کہ کسی اور چیز کا۔ حال کے اکثر شعرا نے عامیانہ تخیل سے بچ کر میر، مومن اور غالب وغیرہ کی تقلید کی ہے جن میں اقبال، فانی، اصغر، حسرت موہانی اور جگر مرادآبادی وغیرہ کی ہستیاں ممتاز طور پر نمایاں ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کا اسلوب کلام جدید ہے اور ان کی شاعری داغ، امیر یا اکثر شعرائے لکھنؤ کے مقابلے میں نئی کہی جا سکتی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں۔ یہ فرق صرف نوعیت کا ہے نہ کہ جدت اور قدامت کا۔ بعض باکمال شعرا میں مصوری کی قوت اس قدر زبردست اور ان کا انداز بیان اس قدر مخصوص اور منفرد ہوتا ہے کہ معمولی رواجی باتیں بھی جو ان کے قلم سے نکل جاتی ہیں نئی اور انوکھی معلوم ہوتی ہیں۔ اور اسی دھوکے میں پڑ کر لوگ خود شاعری کو جدید اور قدیم کا عنوان دے دیتے ہیں۔

اب یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود میرا رنگ شاعری کیا ہے۔ یہ تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرا وہ رنگ نہیں جو داغ اور امیر کا تھا۔ ہاں اگر اس کو کچھ نسبت ہو سکتی ہے۔ تو اس رنگ سے ہو سکتی ہے جس کے علمبردار میر، مومن اور غالب وغیرہ تھے۔ اس نظریہ کے بعد میرے رنگ کو جو کچھ بھی کہا جائے جدید یا قدیم مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میں نے شاعری کے میدان میں اپنے کو ہمیشہ رکیک اور عامیانہ تخیل سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ میرے کلام میں کوئی لفظ ایسا نہ ملے گا جس کے ادا کرنے میں ایک مہذب شخص کو کسی قسم کا پس و پیش ہو۔

شاعری کے لئے سب سے بڑی چیز اس کا مؤثر ہونا ہے۔ صنائع بدائع مشکل اور الجھی ہوئی ترکیبوں کا استعمال یا صرف زبان کا گورکھ دھندا جس کو اصطلاح میں معذرت کہتے ہیں۔ درحقیقت شاعری نہیں اس قسم کی شاعری گو سننے میں مرغوب ہوتی ہے لیکن جب اس کو کاغذ پر بصورت تحریر دیکھئے تو کچھ لطف نہیں آتا۔ یا یوں کہیے کہ اس کا اثر صرف کان تک محدود رہ جاتا ہے۔ دل تک نہیں پہنچتا۔

میرے خیال میں حقیقی اور مؤثر شاعری کے لئے مندرجہ ذیل چیزوں کی ضرورت ہے
(۱) زبان پر قدرت (۲) مناسب الفاظ و تراکیب کا استعمال (۳) کلام کی صفائی، پختگی، برجستگی اور روانی (۴) خیال کی پاکیزگی اور بلندی جس میں فلسفیانہ و متصوفانہ محسوسات بھی شامل ہیں (۵) انداز بیان کی خصوصیت اور ندرت (۶) حشو و زوائد سے اجتناب (۷) مرکزی خیال سے الفاظ و تراکیب کی مطابقت و ہم آہنگی۔ (۸) استعارات و تشبیہات کا صحیح استعمال (۹) الفاظ اور ترکیبوں کے الٹ پھیر سے کلام میں اثر پیدا کرنے کی قابلیت (۱۰) پست عامیانہ اور رکیک جذبات سے اجتناب (۱۱) اصول اور قواعد شاعری کی پوری پابندی۔

نمونہ کلام۔

گناہ عشق میں سے عرض مدعا مانا! ۔۔۔ یہ وقت آپ پہ ہوتا تو آپ کیا کرتے؟!
ہزار ورطۂ غم میں پڑی تھی کشتی عمر! ۔۔۔ خدا کو بھول کے ہم فکر نا خدا کرتے؟!

دل کی گنجائش نہیں کیسے معلوم ۔۔۔ نہیں معلوم اس میں کیا کیا ہے

سو بانیں تھی دل نے مصیبت کی سنا دیں ۔۔۔ ہم قصۂ ماضی کو بھلانے میں لگے تھے

دل شکستہ کے مٹنے کا غم نہیں لیکن ۔۔۔ یہ ہے غم یہی کہ کوئی محرم وفا نہ رہا

اُن کی نگاہ رہ گئی جھک کر جواب میں ۔۔۔ کیا جانے میں نے کہہ دیا کیا اضطراب میں

جانتا ہوں میں نوازش تری اے موج بلا ۔۔۔ میری کشتی کو مبارک ہو سہارا تیرا

نازاں تو عبادت پہ ہے رحمت کا طلبگار ۔۔۔ زاہد تری جنت کہیں دھوکہ تو نہیں ہے

اب وہ پیری میں کہاں عہد جوانی کی امنگ ۔۔۔ رنگ موجوں کا بدل جاتا ہے ساحل کے قریب

یہ شاید شوق آزادی احساس تصور ہے ۔۔۔ کوئی کھینچے لئے جاتا ہے باہر کھڑکی زنداں سے

مجھ کو معلوم ہے کیا ہوگا خوشی کا انجام ۔۔۔ جب ہنستا ہوں تو طبیعت مری بھر آتی ہے

ستم ترک کرنا۔ وفا چھوڑ دینا ۔۔۔ نہ ان کو گوارا نہ ہم کو گوارا

ابھی ٹوٹی ہے کوئی شے دل محزوں کے قریب ۔۔۔ چارہ گر دیکھ! ہماری وہ رگ جاں تو نہیں

اور ابھی تو ہمتیاں تھیں آزمانے کیلئے ۔۔۔ کیا بس یہی رہ گیا تھا غم اٹھانے کے لئے

وہ اور التفات مرے حال زار پر ۔۔۔ قاصد تری یہ بات بنائی ہوئی سی ہے

رنج و غم سے کس کو حاصل ہے نجات
شادمانی ہے فقط کہنے کی بات
یہ نہ ہو تو زندگی کچھ بھی نہیں
ہے محبت میری ساری کائنات
کیا خبر پروانے سے کیا کہہ دیا
شمع نے رو کر گزاری ساری رات

کون ہے جس کی فراغت سے بسر ہوتی ہو
کس سے افسانۂ بے مہریٔ دنیا کہیے
آپ کو آپ کا پردہ ہو مبارک لیکن
میری آنکھوں کو نہ محروم تماشا کہیے
ہے کوئی جس کا دلِ زار سہارا پکڑے
ہے کوئی دہر میں ایسا جسے اپنا کہیے

گر کے بات اپنی لگا رکھے نہ کہیں برق بلا
کیا خبر اس کو غریبوں کے سیہ خانوں کی
تم نے کیا چہرۂ انور سے الٹ دی ہے نقاب
شمع کے ساتھ وہ حالت نہیں پروانوں کی
جل رہا ہوں میں چراغ سحری کی صورت
میری ہستی ہے نہ اپنوں کی نہ بیگانوں کی

تیرے بر آنے کی تمنا میں
اے تمنائے دوست کیا نہ ہوا
بحر قسمت میں خیریت گزری
کوئی کشتی کا ناخدا نہ ہوا
دیکھ کر اس کے دست ناز میں تیغ
کس کو مرنے کا حوصلہ نہ ہوا

دل دھڑکنے لگتا ہے تسکین دل کے ذکر سے
کیا خبر تھی غم بھی جزو مدعا ہو جائیگا
دل تو میرا ہی نہیں ہوتی جہاں پرست
حوصلہ بڑھ کر نہیں معجزہ کیا ہو جائیگا
کیا تعجب آسماں کو بھی رشک آئے اگر
وہ سمجھتا تھا کہ تیر الفت پا ہو جائیگا
دیکھ اس انداز سے لے ہو دا مجھکو نہ دیکھ
کیا خبر تجھکو مری دنیا میں کیا ہو جائیگا

اہل طاعت کو ہے جس کو نذر تسلیم پہ ناز
اس کے سیلاب مرے دامن تر سے گزرے
تھا مرا ان تماشا کہ لطافت ان کی
پھول بن کر وہ گلستان نظر سے گزرے
امتحان گاہ محبت کے قیامت ہیں اصول
پاؤں بھی رکھنے نہ پائے تھے کہ سر سے گزرے
آپ نے شرم سے دریوزہ گری کی رکھی
ہم صدا دیتے ہوئے آپ کے در سے گزرے
راستہ ایک ہے منزل کا تو معلوم بھی ہو
تیرے دیوانے خدا جانے کدھر سے گزرے

ادھر جلووں کی کثرت ہے تو لے دل
ادھر بھی بیخودی ہی بیخودی سب ہے
ہیں سب بے خبر سب میرے در پے
نہ ادا نہ ادا محبت کیا یہی ہے
تری آنکھوں کا یہ کہنا بھرا کیف
یہی معلوم ہوتا ہے کہ پی ہے
مجھے یہ خود فراموشی مبارک
حقیقت میں مری دنیا یہی ہے

ہدایت حیدری

۱۴ اگست ۱۹۲۲ء ریاست گوالیار میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم گوالیار [illegible] ۱۹۳۷ء میں بمبئی یونیورسٹی سے میٹرک پاس کرکے انگریزی تعلیم کو آخری سلام کیا۔ بچپن ہی سے بے قاعدہ اور ۱۹۳۸ء سے باقاعدہ شاعری کا مرض لاحق ہو گیا جس میں ہنوز مبتلا ہوں۔ شعرائے متقدمین کے مطالعے سے زیادہ دلچسپی رہی اور فن عروض کے حصول کا جنون رہا۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں

رشک کی حد سے گزرنا ہے حسد ہو جانا
مسکراتا ہے کوئی اور مجھے غصہ ہوتا ہے

کیا کوئی نام لے دل انقلاب دوراں تو
سانس لینا مشکل ہے جان دینا آساں ہے

روتا ہوں ہنستی ہے دنیا
ہنستا ہوں تو روتا ہے دل

حال ناقابل ہے ساقی اور لا دے جام
کیوں غم عاشقی رہے جب ہنسکر مستقبل نہیں

غم کو ثبات ہے نہ خوشی کو ثبات ہے
بار سہا ہے کیا اصول نظام حیات ہے

شیخ ہدایت منیر

تاریخ پیدائش [illegible] وطن قصبہ پائل ریاست پٹیالہ

نمونہ کلام

صحن گلستان محبت میں بہار آئے گی
لالہ و گل کو بلندی سے اتار آئے گی

چاک کر دے گی امیروں کے قبائے ریشم
زندگی سارے غریبوں کی سنوار آئے گی

باغ عالم کا یہ انداز بدل جائے گا
خون میں ڈوبی ہوئی اک فصل بہار آئے گی

ہلال

سیّد اشرف علی ریواڑوی

تاریخ پیدائش مارچ ۱۹۳۳ء نام سید اشرف علی تخلص ہلالؔ وطن ریواڑی (مشرقی پنجاب)

وہ تابشیں کہاں رہیں اب نیم ہلال کی مدہم سا اک چراغ ہے دھندلی سی روشنی

مجھ سے نہ پوچھئے مرا اب حالِ بیکسی بے ربط و آسرا سی ہے بے کیف زندگی

ہمدانی

محمد احمد ہمدانی

میرا نام محمد احمد ہمدانی۔ پیدائش میرٹھ۔ شاعری کا چسکہ بچپن ہی سے پڑ گیا تھا۔ لیکن خود شاعر بننے کا اتفاق ابتک نہیں ہوا تقسیم ہند کے بعد البتہ غزلیں کہیں۔ یہیں سے شوق نے عملی صورت اختیار کی۔ مختلف غزلوں کے تین شعر پیش کرتا ہوں۔

جادۂ ترکِ عشق کی ٹھن جائے کون جانے کہ تم پہ کیا بن جائے

منزلِ مقصود کی نوید آئی مسافروں کو مبارک ہو آبلہ پائی

دل کے دکھ بھی کون سے باقی آج کے دکھ بھی کے دن کے

دل تھوڑا کرنے سے حاصل غم تو شیخ بڑا مال ہے

ہوش

ہوش تیموری

سن پیدائش ۱۹۲۲ء وطن دلی

خزاں کی نذر نہ ہوتا جو ذوقِ چارہ گری کچھ آج نقشِ تمنا بہار ہو جاتی

عجیب سلسلہ دل تھی تفصیل ذوقِ تشنگی وہ فسانے استعارہ دل بیاں الجھ کر رہ گئے

یاور

سیّد یاور عباس دہلوی

سید یاور عباس نام، والد کا نام سید ناصر عباس صاحب تخلّص یاؔور، عمر ۵۳ سال قبل ہجرت وطن دہلی تھا۔ آباؤ اجداد دو ڈھائی سو برس پہلے خراسان سے آئے تھے اور دہلی میں سکونت اختیار کی تھی۔ پیشہ ڈاکٹری (طبیب مغربی) تعلیم۔ ایم بی بی ایس۔ شاعری صرف بطریق تفریح طبع کرتا ہوں۔ سالوں جماعت یعنی اندازاً ۱۹۳۳ء سے یہ سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اب وقت کی کمی کے باعث بہت کم شعر کہتا ہوں۔ اپنے کلام میں سے چند شعر جو میری سمجھ میں آسکے وہ نقل کیے دیتا ہوں۔

طوفانِ التفات ہے ان کی نگاہ میں — کس درجہ مطمئن ہوں میں حال تباہ میں
دیوانگی میں غمِ دُنیا نگاہ میں — بیگانگی کی بو ہے ہر اک رسم و راہ میں
ان سے بصد ادب یہ گزارش ہے ان دنوں — پہلا سا اعتماد نہیں ہے نگاہ میں

جو کان دھر کے سنیں بھی میں نے کبھی کسی باخبر کی باتیں
وہی شکوکِ خرد کے قصے، وہی فریبِ نظر کی باتیں
کچھ اور تشویش بڑھ رہی ہے عجیب ہیں چارہ گر کی باتیں
جواب دینے سے بچ رہا ہے ادھر کی باتیں اُدھر کی باتیں
ہزار رہزن لگے ہوئے ہوں نہیں مجھے کوئی خوف یاؔور
مگر مرے ہم سفر کے تیور، مگر مرے ہم سفر کی باتیں

بہار کی سرخوشی مبارک مگر یہ دیوانے کیا کریں گے
خزاں سے الجھا کئے ہیں اب تک خزاں کا ماتم کیا کریں گے
سیاستِ سوز و غم کے صدقے ہنسی میں بھی سسکیاں ملا دیں
یہ ہنسنے والے اگر ہنسے بھی تو چشمِ پُرنم ہنسا کریں گے
چمن میں ہم ہر کلی کو یاؔور یہیں سوز و غم بانٹتا پھرا ہوں
مگر یہ سمجھے ہوں یہ تو ہیں گے یوں ہی نئے گل کھلا کریں گے

سامنے نزدیکیاں ہیں رنج و غم و حسرت و یاس — حسن تماشائے عالم عشق بعید القیاس

غزل

تیرے راز سربستہ اگر آشنا نہیں ہے
مجھے دل ملا تو کیا ہے مرے کام کا نہیں ہے

مری شوخئ مقدر تیری انتہا نہیں ہے
جہاں راہبر ملے ہیں وہیں راستا نہیں ہے

کرم آشنا نہیں ہے ستم آشنا نہیں ہے
دل بے نیاز مقصد تجسس جانتا نہیں ہے

اٹھے ہاتھ بھی دعا کو تو لبوں پہ کچھ نہ آیا
ابھی حرف مدعا سے دہن آشنا نہیں ہے

یہاں دل کا یہ تقاضا اسی بزم میں چلیں گے
وہاں بزم کا یہ عالم کوئی آشنا نہیں ہے

یہاں آ کے بس گئے ہیں ابھی اجنبی ہیں ہم
کوئی پوچھتا نہیں ہے کوئی جانتا نہیں ہے

میں بلا کے گلستاں چوب کہ ہزار گل کھلے ہیں
کسی خار و گل سے یا رب مجھے واسطا نہیں ہے

غزل

کس طرح کہہ دوں کہ کوئی آرزو باقی نہیں
ہاں مگر پہلی سا کیفِ جستجو باقی نہیں

اب وہ انداز جنوں گفتگو باقی نہیں
یعنی وہ سودائے شرح آرزو باقی نہیں

جیسے پہلو میں دل دیوانہ تو باقی نہیں
بزم ہستی میں ہماری آبرو باقی نہیں

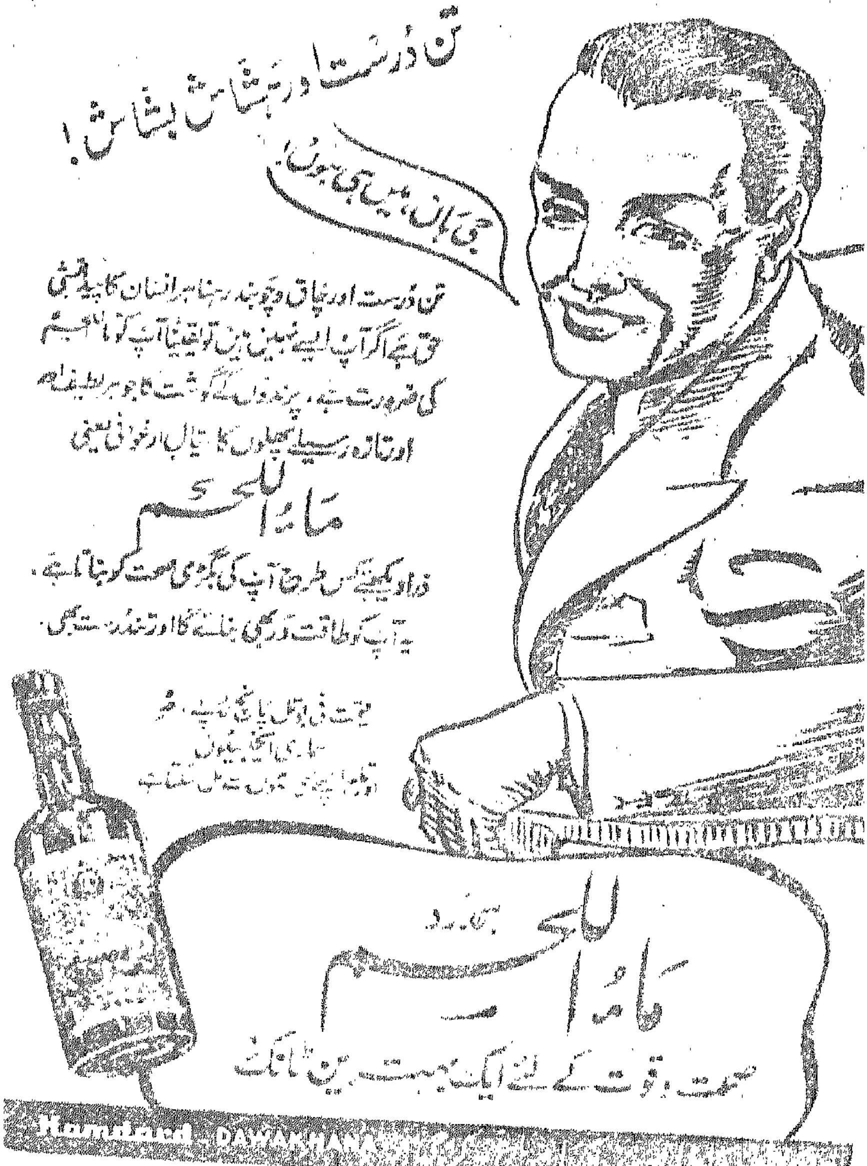
چشم تر کا یہ تقاضا اشک خوں ٹپکائیے
دل کا یہ عالم کہ چہرہ تو لہو باقی نہیں

چپہ چپہ گلستاں کا چھانتا پھرتا ہوں میں
رنگ کلیوں میں نہ پھولوں میں بو باقی نہیں

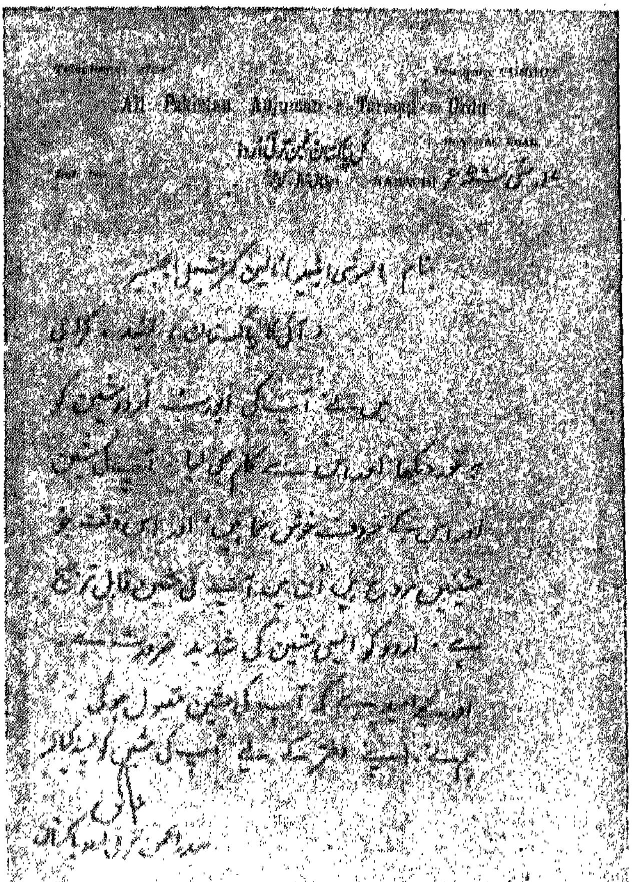
چشم نم آخر ڈبو یا ہی سر محفل مجھے
اب وہ پہلا سا بھرم آبرو باقی نہیں

ناگوار خاطر نازک نہ گذرے تو کہوں
تم میں پہلی سی مروت کی وہ خو باقی نہیں

آئینہ دیکھا تو دیکھا اب ملال اچھا نہیں
تم یہ کیوں سمجھے کوئی خوبرو باقی نہیں


تن درست اور ہشاش بشاش!
جی ہاں میں بھی ہوں
ماء اللحم
صحت و قوت کے لئے ایک بہترین ٹانک
Hamdard DAWAKHANA

ایک نایاب پیشکش



DATE	NO.	DATE	NO.